بلوچستان میں اُردو شاعری

آغا محمد ناصر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرحت ایم حسنی
یونیورسٹی آف
بلوچستان

آغا محمد ناصر

مصنف	آغا محمد ناصر
نام کتاب	بلوچستان میں اردو شاعری
سال اشاعت	جنوری ۲۰۰۰ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	تین سو روپے
مطبع	کراچی یونیورسٹی پریس

ناشر

کوژک پبلشرز

ریگل پلازہ ' جناح روڈ
کوئٹہ

انتساب

ماہر افغانی' عطا شاد
اور
عین سلام
کے
نام

بلوچستان میں اردو شاعری

فہرست مضامین

نقش اول

نقش ثانی

عصر جدید

نژاد نو

پیش لفظ

بلوچستان میں اردو شاعری کی تاریخ یہاں کے شعراء کی تعداد کی طرح مختصر ہے۔ تقریباً" دو صدیوں کی ادبی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو بیس ایسے مقامی شاعر نظر نہیں آئیں گے جنھوں نے اردو کو ذریعہ اظہار اس سلیقے سے بنایا ہو کہ اس میں اپنے احساسات' جذبات اور افکار کو فطری طریقے سے بیان کر سکیں۔

ملا محمد حسن براہوئی (م۔۱۸۵۵ء)' زیب مگسی (۱۸۸۸۔۱۹۵۳ء)' عابد شاہ عابد (۱۸۸۸۔۱۹۴۹ء)' سردار محمد یوسف پوپلزئی (۱۸۶۳ء۔۱۹۳۶ء)' میر یوسف عزیز مگسی (۱۹۰۱۔۱۹۳۵ء)' محمد حسین عنقا(۱۹۰۷ء۔۱۹۷۷ء)' گل خان نصیر (۱۹۱۴۔۱۹۸۳ء)' محشر رسول نگری (۱۹۱۶۔۱۹۸۴ء)' ماہر افغانی (۱۹۲۳۔۱۹۸۳ء)' محمد انور خان (۱۹۲۲۔۱۹۹۷ء)' عبدالرحمن غور (م۔ ۱۹۸۰ء)' عطا شاد (۱۹۳۹۔ ۱۹۹۷ء)' عین سلام' ربنواز مائل' سعید گوہر' حاوی اعظم' آغا محمد ناصر' صدف چنگیزی' پروین لونی' رشید حسرت' افضل مراد اور عصمت درانی ہمارا کل اثاثہ ہیں'

مشاعروں' سیر و تفریح' کاروبار اور ملازمتوں کے سلسلے میں آنے والے لوگ وقتی طور اپنی خوش نوائی سے ہمیں مسحور کر کے چلے جاتے ہیں لیکن نہ وہ ان کہساروں کے اندر جھانک کر دیکھنے کی فرصت رکھتے ہیں نہ ہی حوصلہ اور یوں اردو کے نرم و نازک پودے کو بلوچستان کی خشک آب و ہوا میں پروان چڑھانے اور نشو و نما کی ذمہ داری بہرحال مقامی باغبانوں کے سر ہے۔ اس گل زمیں میں رچ بس جانے اور اس کا حصہ بننے والوں کی خدمات بھی کچھ کم نہیں' آغا صادق حسین' خلیل صدیقی' اثر جلیلی' اخگر سہارنپوری' مقبول رانا' ریاض قمر' کے بعد امداد نظامی' پروفیسر شرافت عباس' استاد رشید انجم' اوریا مقبول جان' صلاح الدین ناسک' جیسے قادر الکلام شعراء گلشن شعر و ادب کی آبیاری میں مصروف ہیں

وہ لشکری زبان جو اقوام و ملل کے ملنے سے وجود میں آئی تھی' دہلی اور لکھنؤ نے

اسے اس قدر نازک مزاج بنا دیا کہ بلوچستان تو کجا سندھ و پنجاب میں بھی وہ مشکل سے قابو میں آ رہی ہے۔ بلوچستان میں اردو زبان و ادب کا مطالعہ اس نظر سے بھی کرنا ہو گا کہ اردو نے ان فضاؤں سے کیا حاصل کیا اور ان کہساروں میں اردو کس قدر نفوذ کر سکی ہے۔

بلوچستان کے شعراء کے ساتھ بطور خاص ان کی مادری زبانوں کے بارے میں معلومات دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کثیراللسان صوبے میں دیکھا جائے کہ اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو کو ذریعہ اظہار بنانے والوں نے تخلیقی اور شعوری سطح پر اردو سے کتنا تعلق پیدا کیا ہے اور بلوچستان میں اردو زبان و ادب کا مستقبل کیا ہو گا۔

ہم بلوچستان کے شعراء کا موازنہ میر و سودا اور ذوق و غالب سے نہ صرف زمانی فرق کی وجہ سے بلکہ مختلف تاریخی' تمدنی اور سماجی حالات کیوجہ سے بھی نہیں کر سکتے' اور اس کے علاوہ وہ جس مقام اور فضا میں زندگی کرتے تھے وہاں کسی "گنوار" سے گفتگو کی بھی ممانعت تھی جبکہ یہاں تو اردو رابطے کی زبان ہے' اسے تخلیقی سطح پر اپنانے' سنوارنے اور بنانے میں ہمارا جو بھی حصہ ہے ہم نہ صرف اس پر نازاں ہیں بلکہ اس کا احترام بھی سب پر لازم سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کا مقصد قطعا" یہ نہیں کہ بلوچستان کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات' اردو دنیا کے بڑے مراکز کے مقابلے میں کمتر ہیں یا ابھی اردو میں تخلیقی سطح پر ہمارے اہل قلم کا معیار ایسا نہیں جس کا دوسروں سے تقابل کیا جا سکے بلکہ مدعا یہ ہے کہ اردو کے بڑے مراکز ان پہاڑی چشموں اور ندی نالوں کی حفاظت کریں کہ یہی اردو کی اساس اور مستقبل کے دریا اور سمندر ہیں۔

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے بارے میں تحقیقات کا دائرہ ابھی بہت محدود ہے۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر' پروفیسر خلیل صدیقی' اور مرحوم پروفیسر مجتبی حسین نے ابتدائی تحقیقی کاموں کے فروغ اور ان کی نگرانی اور رہنمائی میں گرانقدر حصہ لیا' یونیورسٹی آف بلوچستان کی فردوس انور قاضی اور فاروق احمد کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں مجتبی صاحب کی سرپرستی میں ملیں جبکہ حاجی عبدالخالق بلوچ کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں پروفیسر خلیل صدیقی مرحوم کی نگرانی میں ہونے والی تحقیق پر دی گئیں' اس کے علاوہ مسز رفعت مسرور

نے ایم فل کی ڈگری جامعہ بلوچستان سے حاصل کی ہے مزید برآں کچھ محققانہ سرگرمیاں یونیورسٹی کی سطح پر جاری ہیں لیکن بدقسمتی سے بلوچستان میں ہونے والی ان تحقیقی کاوشوں کو منظر عام پر نہیں لایا گیا۔

اس کتاب کی ضرورت یوں پڑی کہ ڈاکٹر کوثر نے ۱۹۶۸ء میں اپنی کتاب میں جن شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں لکھا ان میں سے بہت سے نام آج بلوچستان میں اردو ادب کا ستون ہیں' اسی طرح نوجوان لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد اس عرصے میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہے' افسانوں اور شاعری کے کئی نئے مجموعے سامنے آئے ہیں' لیکن بطور خاص بلوچستان میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں اردو شاعری کی تاریخ اور اس کے ارتقائی عمل کا نئے تناظر میں جائزہ لینا ضروری ہو گیا تھا' نئی تحقیقات کا دائرہ محدود سہی لیکن بعض دریافتیں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں' اور کسی زبان اور اس کے ادب کا تجزیہ کرنے کے لیے پیمانے بھی مختلف ہو سکتے ہیں۔

اس کتاب کی تکمیل میں ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب "بلوچستان میں اردو" نے میری جتنی رہنمائی کی وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا' اس سفر میں ان کی کتاب ایک روشن ستارے کی طرح میرے ساتھ رہی۔

اس کتاب کا ایک مقصد بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے طالبعلموں کو ایک ایسی کتاب فراہم کرنا بھی ہے جس کے ذریعے وہ بلوچستان میں اردو شاعری کے ارتقا اور یہاں کے شعراء کا کلام یکجا دیکھ سکیں' البتہ شعر و ادب اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد کے لیے بھی یہ کتاب کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

اس کتاب کی تکمیل کے دوران میری بیوی ہما آغا نے مجھے جس قدر آرام سے رکھا اس کے لیے میں بطور خاص ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اس کے علاوہ میرے دوست ڈاکٹر غلام حیدر خالد جنہوں نے لفظ بہ لفظ کتاب کو پڑھنے کیساتھ اپنے مفید مشوروں سے نوازا' نیز ان تمام دوستوں کا جنہوں نے اس کتاب کے لیے گرانقدر مواد اور معلومات فراہم کیں' صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں اسے اپنی ناسپاسی سمجھوں گا اگر میں جناب ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر سحر انصاری اور پروفیسر شرافت عباس کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات سے وقت نکال کر نہ صرف کتاب کے مسودہ کا مطالعہ کیا بلکہ کتاب کا پیش لفظ بھی لکھا۔ اس کتاب کے سرورق کے لیے میں ڈاکٹر زہرا قزلباش کا بھی ممنون ہوں۔

آغا محمد ناصر

اپریل ۲۰۰۰ء

ڈاکٹر جمیل جالبی

سابق وائس چانسلر، جامعہ کراچی

پیش لفظ

یہ اس وقت کی بات ہے کہ اردو کے ممتاز نقاد شمیم احمد بقید حیات تھے اور جامعہ بلوچستان میں شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔ ایک دفعہ کوئٹہ سے کراچی آئے تو اپنے ساتھ ایک نوجوان کو بھی لائے۔ خوش وضع، خوش اطوار، باتمیز اور سلیقہ مند۔ شمیم احمد نے تعارف کرایا کہ یہ نوجوان اچھا شعر کہتا ہے اور نثر بھی اچھی لکھتا ہے اور مجھے اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ نام آغا محمد ناصر بتایا۔ میں نے کہا ان کا کلام بھجوایئے، پڑھوں گا تو فی الواقع تعارف ہو گا۔ کوئٹہ جا کر شمیم احمد نے ان کا کلام بھجوایا، جس سے انتخاب کرکے پہلی بار غالباً" ۱۹۸۳ء میں میں نے ان کی تین نظمیں ایک ساتھ سہ ماہی "نیا دور" کراچی میں شائع کیں اور پھر آیندہ کسی شمارے میں بھی دو نظمیں اور شائع کیں۔ ان نظموں میں مجھے ایک تازگی محسوس ہوئی۔ ان نظموں کو پڑھ کر مجھے یقین تھا کہ آغا محمد ناصر آگے چل کر اردو شاعری میں اپنا نام روشن کریں گے۔ یہ تخلیقی چمک آج بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔

آغا محمد ناصر اب اپنے استاد شمیم احمد کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں اور وہی کام کر رہے ہیں جو شمیم احمد وہاں کرتے تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ اب بھی علم و ادب سے اسی طرح گہرا شغف رکھتے ہیں اور کئی سال کی محنت کے بعد بلوچستان کے اردو شعراء کا ایک ایسا تذکرہ تلاش و تحقیق سے مرتب کیا ہے جو بلوچستان میں اردو شاعری کے رنگا رنگ پھولوں کا ایک سدا بہار گلدستہ ہے۔ جس میں نہ صرف شاعروں کے حالات زندگی اور ان کے کاموں پر روشنی ڈالی ہے بلکہ ایک ایسا اچھا انتخاب کلام بھی دیا ہے جسے پڑھ کر شاعری کی خوشبو مشام جاں کو معطر کر دیتی ہے۔

آغا محمد ناصر نے بلوچستان میں اردو شاعری کی روایت کا آغاز ملا محمد حسن براہوی (م ۵، رمضان ۱۲۷۲ھ) سے کیا ہے جن کا دیوان برسوں پہلے ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے مرتب و شائع کیا تھا۔ اس کے بعد بزرگ و مرحوم شعرا سے لے کر عہد حاضر کے کم و بیش تمام قابل ذکر شعرا کو شامل تذکرہ کرکے بلوچستان میں اردو شاعری کی روایت کے خدوخال کو اجاگر کیا ہے۔ اس تذکرے میں اکثر شعرا کے جو حالات مولف تذکرہ نے جمع کیے ہیں وہ پہلی بار سامنے آئے ہیں۔ انتخاب کلام کا معیار بھی ایسا ہے کہ شاعری سے دلچسپی رکھنے والا قاری اس سے لطف اندوز ہو گا۔ اس انتخاب میں بعض نظمیں پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ آخر میر گل خان نصیر یا آغا محمد صادق یا عطا شاد وغیرہ کی نظمیں اب تک اسکول اور کالج کے نصاب میں کیوں شامل نہیں کی گئیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ سارے صوبوں کے اردو نصاب میں ایسی معیاری نظمیں شامل کی جائیں جو تمام صوبوں میں بسنے والے اردو شعرا نے لکھی یا لکھ رہے ہیں۔ شاعری تخلیقی سطح پر فکری یک جہتی پیدا کرتی ہے اور ان شعرا کو شامل نصاب کرکے ہم اس کام کو زیادہ سہل اور موثر بنا سکتے ہیں۔

آغا محمد ناصر کی یہ تصنیف نہ صرف بلوچستان میں اردو شاعری کا ایک بہت اچھا تذکرہ ہے بلکہ بلوچستان کی شاعری کو اردو شاعری کے قومی دھارے سے ملا دیتا ہے۔ یہ کام آغا محمد ناصر نے جس خلوص، لگن اور ذوق و شوق سے کیا ہے میں انہیں دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے بھی شمیم احمد کی طرح آغا محمد ناصر سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں:

ع — دیکھیں، کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

کراچی: ۲۸-۴-۲۰۰۰ء

پروفیسر سحر انصاری
ڈائریکٹر، اردو ڈکشنری بورڈ کراچی
سابق صدر شعبہ اردو، جامعہ کراچی

ایک اہم کارنامہ

بلوچستان رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ اس کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہو گا کہ یہاں ماقبل تاریخ کے آثار بھی ملتے ہیں۔ یہ سر زمین متعدد تہذیبوں، قوموں، عقیدوں اور زبانوں کا گہوارہ رہی ہے۔ یہاں سر بہ فلک پہاڑ بھی ہیں، چشمے، جھیلیں اور کاریزیں بھی۔ موسم میں شدت ہے لیکن بہار و خزاں کو واقعی اپنی نظروں سے دیکھنا ہو تو کچھ وقت بلوچستان میں گزارا جائے۔ یہاں کے باشندے عموماً خودار، غیور، جفاکش، وفادار، مہمان نواز اور دوست پرور ہوتے ہیں۔ یہاں قدرتی وسائل کے خزینے زیر زمیں کسی بہتر لمحے کے منتظر ہیں جو اس خطے کی تقدیر بدل دے۔ بایں ہمہ یہاں کی روایات سود و زیاں کے اندیشوں سے الگ اپنی راہوں پر رواں دواں ہیں۔

بلوچستان میں یوں تو متعدد زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اردو تمام طول و عرض کی غالب زبان بن چکی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل بھی اردو زبان کے بعض اہم حوالے یہاں موجود تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ بتدریج اردو کا سرمایہ مقامی حوالوں سے اتنا ہو گیا کہ اب جامعہ بلوچستان میں یہاں کے اردو ادب کا مطالعہ ایک خاص موضوع کے طور پر شامل نصاب کر لیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے "بلوچستان میں اردو شاعری" ایک بہت اہم باب تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے بلوچستان میں اردو کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب تالیف کی ہے جو کتاب حوالہ کی حیثیت سے استعمال کی جا رہی ہے۔ اسے دکن میں اردو، پنجاب میں اردو، بنگال میں اردو، سندھ میں اردو کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے تاہم بلوچستان میں اردو زبان و ادب کو کمیت و کیفیت کے

تناظر میں دیکھیے تو ماننا پڑتا ہے کہ اردو ادب کی ایک ایک صنف محتاج توجہ ہے۔

مجھے بہت خوشی ہے کہ بلوچستان کے ایک نوجوان اسکالر آغا محمد ناصر نے بلوچستان میں اردو شاعری جیسی کتاب تصنیف کی ہے۔ آغا محمد ناصر ایک خوش وضع، ذہین اور تخلیقی نہج کے انسان ہیں۔ انہوں نے عمرانیات اور اردو میں ایم اے کر کے دونوں مضامین میں تصنیف و تالیف کے علاوہ تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ وہ آج کل شعبہ اردو، بلوچستان یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ فارسی زبان بطور خاص ان کے رگ و پے میں سموئی ہوئی ہے۔ اردو میں وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے مقالات بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کا تازہ ترین کارنامہ "بلوچستان میں اردو شاعری" ہے۔

بلوچستان میں اردو ادب کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے آغا محمد ناصر نے اردو شاعری کی روایات کا کھوج انیسویں صدی میں لگایا ہے اور ملا محمد حسن براہوی سے اپنے اس تذکرے کا آغاز کیا ہے۔ آغا محمد ناصر کی تحقیق کے مطابق ملا محمد حسن براہوئی بلوچستان میں اردو شاعری کا نقش اول ہیں۔ وہ اپنا اردو دیوان ۱۸۴۲ء میں مرتب کر چکے تھے۔

آغا محمد ناصر نے بلوچستان میں اردو شاعری کے پانچ ادوار مقرر کیے ہیں۔ دور اول ۱۸۲۰ء سے شروع ہوتا ہے اور نژاد نو تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نژاد نو کے بیشتر شعراء پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں پیدا ہوئے اور یہ بات درست ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد بلوچستان کی اردو شاعری میں ایک انقلابی موڑ آیا اور جدید موضوعات، اسالیب اور تجربات نے اس دور کی شاعری کو بلاشبہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

آغا محمد ناصر خود ایک جدید ذہن کے شاعر اور ادیب ہیں، اسی لیے ان کا زاویہ ء نگاہ اور تنقیدی خیالات مختلف ہیں۔ انہوں نے ہر شاعر کے حالات زندگی بڑی تحقیق و جستجو کے بعد فراہم کیے ہیں اور ہر ایک کی شاعری پر اپنی اور جہاں مل سکی وہاں دوسرے نقادوں کی آراء بھی درج کی ہیں۔ ہر شاعر کے احوال و کوائف کے ساتھ ساتھ اس کا انتخاب کلام بھی دیا گیا ہے۔ انتخاب اتنا ہی ہے جتنا کسی شاعر کے مجموعی مزاج کو سمجھنے کے لیے ضروری ہو سکتا ہے۔

آغا محمد ناصر نے دور قدیم کے شعراء کے حالات زندگی اور ان کے کلام کو حاصل کرنے میں غیر معمولی محنت کی ہے۔ خاص طور پر سردار گل محمد خان زیب مگسی کے مطبوعہ کلام کے ساتھ ساتھ ان کا غیر مطبوعہ کلام حاصل کرنے میں بھی کامیابی ہوئی۔ زیب مگسی ایک قادرالکلام اور کثیراللسان شاعر تھے، ان کا سرمایہ ء سخن خاصا وقیع ہے۔ اس پر علیحدہ سے تحقیقی کام ہونا چاہیے ان کے منتشر کلام کو یکجا کر کے اس سرمایے کو محفوظ کر لینا ضروری ہے۔ ممکن ہے یہ اہم کارنامہ آغا محمد ناصر کے ذریعے پایہ ء تکمیل کو پہنچے۔

آغا محمد ناصر کی زیر نظر کتاب بہت اہم ہے۔ بلوچستان میں اردو شاعری کے ارتقا کی پوری تصویر واضح ہو جاتی ہے۔ اب تک جو اردو کی تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں اردو شاعری اور ادب کے ان علاقوں کو نظر انداز کیا گیا ہے، دیگر اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان شعراء کا کلام دستیاب نہیں تھا۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور آزادی ء وطن کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا ہے کہ آزاد وطن میں پروان چڑھنے والی نئی نسل علوم و فنون کے متعدد جدید رجحانات سے آگاہی حاصل کرنے کے علاوہ اپنی تہذیبی، علمی اور ادبی روایات کا سراغ بھی لگا رہی ہے۔ آغا محمد ناصر نے اس لحاظ سے ایک مثال قائم کی ہے مجھے یقین ہے کہ انہوں نے جو چراغ روشن کیا ہے اس کا اجالا دور دور تک پھیلے گا اور ان کی اس تحقیقی کاوش سے بلوچستان شناسی کے نئے راستے ہموار ہوں گے۔

پروفیسر شرافت عباس
صدر شعبہ فارسی، جامعہ بلوچستان کوئٹہ

سرزمین بلوچستان کی ناپیمودہ وسعتوں میں پوشیدہ بے شمار معدنی خزینوں کی طرح اس کے بہت سے ثقافتی اور ادبی خزینے بھی تاہنوز بڑی حد تک دست نخوردہ ہیں۔ مقامی زبانوں کی بات تو اصطلاحاً ہی نہیں، حقیقی معنوں میں بہت دور کی بات ہے، اردو ادب کی تاریخ کو بھی جس کی مدت ڈیڑھ دو سو سال کے لگ بھگ ہوتی ہے، اب تک محققانہ طرز پر منضبط نہیں کیا جا سکا ہے۔ ادبی تاریخ دراصل کسی بھی خطے کے افراد، اقوام و قبائل و شعوب کی غیر مورخہ تاریخ ہوتی ہے۔ ان کے احساسات، ان کے جذبات، ان کی خواہشات، ان کے خواب، زندگی کے بارے میں ان کے شعوری اور غیر شعوری محسوسات، رویوں اور افکار و اعمال کا آئینہ ۔ بالخصوص کسی بھی معاشرے میں کی جانے والی شاعری دیگر اصناف کے مقابلے میں ان سب چیزوں کی زیادہ معتبر، سچی اور زیادہ بے لاگ ترجمان ہوتی ہے، پھر بلوچستان جیسے کثیراللسان خطے میں جہاں بلوچی، براہوئی، پشتو اور فارسی کے ساتھ ساتھ دیگر کئی زبانیں منجملہ اردو، پنجابی، سرائیکی وغیرہ بولنے والے افراد قابل لحاظ تعداد میں آباد ہیں اور جن کے لیے اردو ایک اہم اور موثر رشتے اور رابطے کا درجہ ہی نہیں بلکہ ذریعہ ء اظہار کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے، تو اس کی شاعری کی تاریخ اب تک غیر منضبط اور غیر مرتب تھی۔ گنتی کے چند مضامین کے علاوہ اس حوالے سے ہماری دسترس میں کچھ نہ تھا۔ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے پروفیسر آغا محمد ناصر نے آج سے ڈھائی تین سال قبل اس بھاری پتھر کو اٹھانے کا فیصلہ کیا اور شبانہ روز کی محنت اور دیدہ ریزی کے بعد اب اسے پایہ ء تکمیل کو پہنچایا ہے۔

پروفیسر آغا محمد ناصر جامعہ بلوچستان میں اردو زبان و ادبیات کے سینئر استاد ہونے کے علاوہ جامعہ کے شعبہ عمرانیات میں بھی ایک قابل لحاظ مدت تک تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ زبان و ادبیات نیز عمرانیات کے گہرے مطالعے نے ان کے فکر کو

تنوع بخشا ہے اور طبیعت میں تحقیقی عناصر کی فراوانی نے ان کی نظر کو وسعت اور تحریر کو توازن جیسی کمیاب دولتیں عطا کی ہیں۔ بلوچستان کی علمی، ادبی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی کے ایک معتبر گواہ کی حیثیت سے کہ وہ ایک نیم سیاسی و نیم ادبی جریدے "وادی" کے مدیر اور بلوچستان کی مذہبی تاریخ سے متعلق ایک معرکتہ الارا کتاب "بلوچستان میں پیروان علی" کے مصنف نیز بذات خود ایک عمدہ شاعر اور ادیب ہیں۔ "بلوچستان میں اردو شاعری" کو ہر لحاظ سے ایک عمدہ، معتبر اور قابل قدر ادبی دستاویز بنا دیا ہے۔ ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ہم بہت جلد بلوچستان میں اردو نثر کے حوالے سے بھی پروفیسر آغا محمد ناصر کی جانب سے ایسی ہی بھرپور اور جامع کتاب کا خیر مقدم کر سکیں گے۔

بلوچستان میں اردو ادب کا ارتقاء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ۱۸۲۰ء سے ۱۸۸۰ء تک پہلا اور ابتدائی دور جس میں بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے نمونوں کا سراغ ملتا ہے۔ اس دور میں نائب ملا محمد حسن براہوئی اور رائے بہادر لالہ ہتو رام شامل ہیں۔ دوسرے دور کا آغاز بلوچستان میں انگریزوں کے قبضے کے بعد یعنی ۱۸۸۰ء سے ۱۹۲۰ء تک محیط ہے جس میں نواب گل محمد خان زیب مگسی، سردار محمد یوسف پوپلزئی، عابد شاہ عابد شامل ہیں۔ تیسرا دور ۱۹۲۱ء سے قیام پاکستان یعنی ۱۹۴۷ء تک، جس میں نواب میر یوسف عزیز مگسی، محمد حسین عنقا اور گل خان نصیر جیسے شعراء اور ادیب شامل ہیں، جنہوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں اساسی کردار ادا کیا۔ چوتھے دور یعنی ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۰ء تک زبان و بیان کی صفائی اور فنی پختگی کے حوالے سے جن ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا جا سکتا ہے ان میں آغا صادق حسین، محشر رسول نگری، ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ، عبدالرحمن غور، محمد انور خان، اثر جلیلی، انگر سہارنپوری اور ماہر افغانی جیسے شاعر اور ادیب شامل ہیں، جبکہ بلوچستان کو صوبائی حیثیت ملنے کے بعد کا عرصہ پانچواں دور ہے اس دور کے لکھنے والوں میں نور محمد ہمدم، عین سلام، عطا شاد، سعید گوہر، عابد شاہ عابد، ریاض قمر اور حاوی اعظم جیسے معتبر نام آتے ہیں جن کے ساتھ آج کے نوجوان لکھنے والے بھی شامل ہیں۔

انیسویں صدی میں موجودہ بلوچستان کی انتظامی اور جغرافیائی شکل و صورت بہت مختلف تھی، وسطی بلوچستان میں ریاست قلات کی حیثیت ایک نیم خود مختار ریاست کی سی تھی، جبکہ ریاست لسبیلہ، مکران اور خاران پر قلات کی بالا دستی تھی، دوسری طرف پشین، لورالائی، ژوب، سبی، وغیرہ سلطنت افغانستان کا حصہ تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں نے بلوچستان کی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے اپنے جاسوسوں اور مخبروں کے ذریعے بلوچستان کے حالات معلوم کرنے شروع کر دیئے تھے، ہنری پونگر غالباً" وہ پہلا انگریز جاسوس

تھا جس نے ایک سیاح کے بھیس میں بلوچستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا اور یہاں سے معلومات حاصل کیں۔ انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزوں نے بلوچستان کی سرزمین کو افغانستان کے خلاف استعمال کیا۔ انگریزوں کے ساتھ ساتھ اردو بھی ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر چکی تھی اور سرکاری حیثیت کے ساتھ ساتھ ایک ادبی زبان کے طور پر وہ فارسی کی جانشین بن چکی تھی۔ مگر بلوچستان پر ہندوستان کے ثقافتی اور لسانی اثرات فوراً مرتب نہیں ہوئے بلکہ ایران اور افغانستان کی لسانی اور ثقافتی بالادستی قائم رہی۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے بلوچستان میں اردو زبان کی رسائی چند ہندو تاجروں تک محدود تھی۔ سرکاری، درباری، عدالتی اور سفارتی سطح پر بلوچستان میں فارسی زبان کا دور دورہ تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں نائب ملا محمد حسن براہوئی کے علاوہ اب تک ریاست قلات میں اردو لکھنے پڑھنے والے کسی اور شخص کا سراغ نہیں ملا ہے۔ ملا محمد حسن براہوئی بلوچستان میں اردو شاعری کا نقش اول ہیں، وہ اپنا اردو دیوان ۱۸۴۲ء میں مرتب کر چکے تھے لیکن سیاست اور زندگی کی کج ادائیوں کی وجہ سے انہیں اپنا کلام طبع کرانے کی مہلت نہ مل سکی، ملا محمد حسن براہوئی ریاست قلات کے وزیراعظم تھے، ان کا اردو میں شعر کہنا اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ اہل بلوچستان ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات سے بے خبر بھی نہیں تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں کی آمد اور کوئٹہ ایجنسی کے قیام کے ساتھ ہی اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے کا رواج دفعتاً" بڑھ جاتا ہے، عدالتوں کی کارروائیاں اور سرکاری دستاویزات کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی اردو میں شروع ہوا۔ غیر مقامی لوگوں کی ایک کثیر تعداد بلوچستان میں آباد ہونا شروع ہوئی۔ کوئٹہ، لورالائی اور ژوب میں فوجی چھاؤنیوں کا قیام اور فوجیوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہندوستان سے تاجروں کی آمد، سرکاری دفاتر میں لکھنے پڑھنے کے امور پر مامور ہندوستان بھر سے اردو اور پنجابی بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد کوئٹہ اور برٹش بلوچستان کے دیگر علاقوں میں آ کر آباد ہوئی۔ افغانستان پر نظریں جمائے ہوئے انگریزوں کی بیشتر توجہ بلوچستان کے سرحدی علاقوں پر مرکوز تھی اور ایک خاص پالیسی کے تحت اردو سکولوں کے قیام کے ساتھ ساتھ

سرکاری سطح پر اردو کی ترویج اور فروغ کے کام کا آغاز ہوا۔

فارسی جو ہندوستان، افغانستان اور ایران کی طرح بلوچستان میں ریاست قلات کی سرکاری، درباری اور عدالتی زبان تھی اردو سے تبدیل ہوئی تو وہ طبقہ جو سرکار و دربار سے تعلق رکھتا تھا اردو سیکھنے کی طرف مائل ہوا، انگریزوں نے اردو اسکول کھولے اور وہ زبان جسے ہندوستان میں پروان چڑھنے میں صدیاں لگیں، دیکھتے ہی دیکھتے بلوچستان کے طول و عرض میں عام ہو گئی۔

انگریزوں کی آمد کے بعد ریاست قلات پر خان آف قلات کی حکمرانی برائے نام رہ گئی تھی اور قلات کی بجائے کوئٹہ نے مرکزی حیثیت حاصل کر لی، کوئٹہ لورالائی اور ژوب میں فوجی چھاؤنیوں کے قیام کی وجہ سے انگریزی فوج کے ہزاروں پنجابی، اردو اور بنگالی بولنے والے فوجی ان علاقوں میں آباد ہو گئے اور وسیلہ اظہار کے طور پر اردو استعمال میں آنے لگی۔

۱۸۷۵ء میں رائے بہادر لالہ ہتو رام کی کتاب "بلوچی نامہ" اور بلوچستان کی تاریخ پر ان کی کتاب "تاریخ بلوچستان" جو ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی، بلوچستان میں اردو زبان کی اولین کتب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ گو لالہ ہتو رام یہ کام اپنے انگریز آقاؤں کے حکم پر سرانجام دے رہے تھے لیکن بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ان کتابوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔

بیسویں صدی کے پہلے عشرے میں بلوچستان میں ادبی سرگرمیوں کا سراغ ملتا ہے جب لورالائی میں ادبی سرگرمیوں کی ابتداء ہوئی، جہاں سردار محمد یوسف خان پوپلزئی نے اردو مشاعروں کی بنیاد ڈالی، البتہ ۱۹۱۵ء میں کوئٹہ کے عابد شاہ عابد کا مجموعہ کلام "گلزار عابد" کے نام سے چھپ کر سامنے آتا ہے، بلوچستان میں یہ کسی شاعر کا پہلا مطبوعہ مجموعہ کلام ہے۔ جس میں فارسی کے ساتھ ساتھ اردو اشعار بھی ہیں۔ ستمبر ۱۹۱۴ء میں سردار محمد یوسف پوپلزئی اور لالہ فتح چند نسیم کے زیر اہتمام لورالائی سے "قندیل خیال" کا اجراء ہوا۔ یہ ماہانہ رسالہ دہلی سے چھپ کر لورالائی سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے پندرہ بیس شمارے شائع

ہوئے۔ ہرچند کہ انیسویں صدی کے وسط سے پہلے نائب ملا محمد حسن بنگلزئی اپنا اردو دیوان مرتب کر چکے تھے لیکن ریاست قلات اور بلوچستان ایجنسی میں ان کے کلام کے بارے میں لوگ بیسویں صدی کے ساتویں عشرہ تک بے خبر رہے تاآنکہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے ان کے پوتوں سے انکا دیوان لے کر مجلس ترقی ادب کے ذریعے ۱۹۷۶ء میں شائع کیا' اسی طرح جھل مگسی میں نواب گل محمد خان زیب مگسی کا اردو کلام بھی بیسویں صدی کے ساتویں عشرے تک عوام الناس کی نظروں سے اوجھل رہا' ان کی اردو شاعری کا کچھ نمونہ جو مخمسات کی صورت میں تھا ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی کتاب میں نقل کیا لیکن ان کے اردو کلام کا بڑا حصہ جو تین سو تیس غزلوں پر مشتمل ہے ان کے اپنے خط میں کسی تغیرو تبدل اور تعارف کے بغیر حال ہی میں چھپا ہے۔

۱۹۱۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق اس وقت پورے بلوچستان میں صرف دو ہزار ایک سو اکیس (۲۱۲۱) ایسے مقامی اور قبائلی لوگ تھے جو لکھنے پڑھنے کی استعداد رکھتے تھے۔ ان میں ایک ہزار پانچ سو چوالیس (۱۵۴۴) فارسی لکھنا پڑھنا جانتے تھے' اور اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد پورے بلوچستان میں صرف پانچ سو پچپن (۵۵۵) تھی۔ ان میں ہندو اور سکھ بھی شامل ہوں گے اور ہمیں اس زمانے میں بھی اردو شاعری کے نمونے اور لورالائی میں باقاعدہ مشاعروں کا سراغ ملتا ہے۔

اردو مشاعروں کے علاوہ ادبی زبان و بیان کی ترویج ان امام بارگاہوں اور عزا خانوں سے بھی ہوئی جہاں عشرہ محرم میں فارسی کے ساتھ ساتھ اردو اور پنجابی زبان کے نوحے اور مرثیے پڑھے جاتے۔ کوئٹہ میں سرکاری ملازمین کے علاوہ انگریزی فوج میں ہندوستان بھر کے لوگ ہوا کرتے تھے جن کی وجہ سے یہاں اردو میں مجالس عزا اور نوحہ خوانی کی روایت پڑی۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مسلمانان ہند کی آزادی کی تحریکوں کا اثر بلوچستان پر بھی پڑنا شروع ہوا۔ بلوچستان اپنے مخصوص قبائلی اور سماجی نظام کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے مختلف ہونے کے باوجود اس کشمکش اور احساس غلامی کی

شدت سے آگاہ تھا جو تحریک آزادی کی صورت میں روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی۔ بلوچستان میں شعوری طور پر اردو کو ذریعہ اظہار کے بنانے کا سہرا ان سیاسی قائدین اور تحریک آزادی کے سپاہیوں کے سر ہے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف عملی جدوجہد کا آغاز کیا تو عوام سے رابطے کے لئے اردو کا انتخاب کیا' وہ سردار یوسف عزیز مگسی ہوں یا عبدالصمد خان اچکزئی' قاضی محمد عیسیٰ خان ہوں یا محمد حسین عنقا' عطا محمد مرغزانی ہوں یا فضل احمد غازی' گل خان نصیر اور حریم اوستوی ہوں یا محمد حسن نظامی' ان تمام سیاسی شخصیات نے اردو کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اہل بلوچستان نے اردو کو بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں رابطے اور اظہار کا ذریعہ بنایا۔ میر یوسف عزیز مگسی نے نثر و نظم میں اردو کو بھرپور انداز میں اپنایا اور ان کا پیغام بلوچستان کے گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ اب یہ پروردگار عالم کی مہربانی دیکھیے کہ وہ زبان جسے انگریزوں نے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی بیخ کنی اور استحصال کے لیے استعمال کرنا چاہا تھا اسی زبان یعنی اردو کے ذریعے بلوچستان کے رہنماؤں نے انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی کو پروان چڑھایا۔ میر یوسف عزیز مگسی کی تقلید میں بلوچستان کے سیاسی رہنماؤں نے اردو کو اپنایا' اور ایک قلیل مدت میں اردو عوامی رابطے کے لیے تقریر و تحریر کی زبان بن گئی۔ اس دور میں فارسی کی بجائے اردو میں خط و کتابت عام ہو جاتی ہے' یوسف عزیز مگسی کے خطوط اس زمانے کے منتخب خطوط ہیں جو اب "مکاتیب یوسف عز" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔

قیام پاکستان سے پہلے اردو کی ترقی و ترویج میں مقامی شخصیات کا عمل دخل بہت زیادہ نظر آتا ہے اور ہم صحافت' سیاست' درس و تدریس' سرکاری و عدالتی کارروائیوں' ذاتی خطوط اور ادبی تحریروں میں اردو زبان کو رابطے اور ذریعہ اظہار کے طور پر فارسی اور دیگر مقامی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں دیکھتے ہیں' میر یوسف عزیز کی سرپرستی میں چلنے والے اخبارات و جرائد ہوں یا تحریک پاکستان کے رہنما قاضی محمد عیسی خان اور جعفر خان جمالی کے اخبارات یا ان کے سیاسی بیانات' عبدالصمد خان ہوں یا سی کے عطا محمد مرغزانی

کے اخبارات اور پریس یا دیگر رہنما اور سیاسی کارکن' سب کا ذریعہ اظہار اردو ہے۔ تیس اور چالیس کی دہائیوں میں ہندوستان سے آنے والے تحریک پاکستان کے رہنماؤں کی تقریریں' یا جلسوں کی کارروائیاں سب کی سب اردو میں ہوا کرتی تھیں' ان سیاسی جلسوں میں جوش و جذبہ سے بھرپور نعرے اور جلسوں میں شریک لوگوں کی گفتگو اردو میں ہوتی تھی۔

تحریک پاکستان کے دوران بلوچستان سے مسلم لیگ کا حامی پہلا اردو اخبار ہفت روزہ "الاسلام" قاضی محمد عیسی نے جاری کیا۔ اس اخبار کے اجرا کا مقصد بلوچستان میں مسلم لیگ کی پالیسیوں کو متعارف کروانا تھا اسی مقصد کے حصول کے لیے میر جعفر خان جمالی نے اپنا اخبار تنظیم کوئٹہ سے جاری کیا جس کے ایڈیٹر اردو کے ممتاز ناول نگار نسیم حجازی تھے جن کی بلوچستان کے سیاسی حالات پر گہری نظر تھی۔ نسیم حجازی نے جہاں تحریک پاکستان کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کے لیے صحافتی محاذ پر کئی اہم خدمات انجام دیں وہاں انہوں نے بلوچستان میں قیام کے دوران کئی ناول بھی تحریر کیے۔ اسی طرح بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی اردو کی انتہائی اہم کتاب "سب رس" کا مقدمہ بھی ۱۹۳۲ء میں کوئٹہ میں اپنے قیام کے دوران تحریر کیا تھا۔

یوسف عزیز مگسی سے پہلے بلوچستان میں اردو زبان ضرورت کے تحت بولی اور سیکھی جاتی تھی' وہ سرکاری سطح پر دفتری امور کی کارروائیوں کی غرض سے استعمال میں تھی یا عدالتی فیصلوں کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے' عام لین دین میں معاملات نبھانے کے لیے یا تجارتی گفتگو اور خط و کتابت کی غرض سے'۔۔۔ یوسف عزیز مگسی اردو کو بلوچستان کی سوچ کی زبان بنا دیتے ہیں۔

۱۹۳۰ء سے قیام پاکستان تک بلوچستان میں اردو صحافت اور سیاسی جلسے جلوسوں نے جہاں ایک طرف اردو کو عام لوگوں میں مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہاں اردو ادب کو بھی فروغ بخشا' کیونکہ علامہ اقبال' مولانا ظفر علی خان' یوسف عزیز مگسی جیسے حریت پسندوں کا کلام زبان زد خاص و عام ہوا' سیاسی' سماجی اور ثقافتی افسانے لکھے گئے اور مشاعروں کے

ذریعے بھی عوامی شعور کو بیدار کیا گیا۔

نواب میر یوسف عزیز مگسی کی تحریک اور انقلابی افکار کو کسی حد تک ان کے ساتھیوں نے آگے بڑھایا' میر محمد حسین عنقا نے بلوچستان میں فروغ اردو میں نہایت اہم خدمات انجام دیں' آپ نے اخبارات و رسائل کے ذریعے نثر و نظم میں بلوچستان کی تحریک آزادی کو پیش کرنے میں یوسف عزیز مگسی کی پیروی کی' ہم بلوچستان کی اردو شاعری میں عنقا صاحب کو اردو کے اولین محسنین میں شمار کر سکتے ہیں اور وہ قدرتی پہاڑی چشمہ جو محمد حسن براہوئی کی صورت میں دشت بلوچستان سے نمودار ہوا تھا صاحبزادہ عبدالحق زبور' محمد حسین عنقا' گل خان نصیر' محمد حسن نظامی' نسیم تلوی' حریم اوستوی' اسلم اچکزئی' شیر علی خان آغا زئی' بہرام مینگل' عبدالحق پاکستانی' محمد انور خان' اور ماہر افغانی کی صورت میں تند و تیز دریا کی صورت اختیار کر گیا۔

قیام پاکستان کے بعد مسلمانوں کو ان کی منزل مل گئی' ہندوستان سے اس مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد کو ہجرت کا دکھ سہنا پڑا' ان مہاجرین کی ایک خاطر خواہ تعداد بلوچستان میں آباد ہو گئی' ان میں یو پی اور سی پی کے افراد بھی تھے اور مشرقی پنجاب کے گھرانے بھی' کوئٹہ میں بالخصوص اور پورے بلوچستان میں عمومی طور پر ان مہاجرین نے اردو زبان کے فروغ میں مثبت کردار ادا کیا۔

قیام پاکستان کے بعد سکولوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ بلوچستان میں کالجوں کا قیام عمل میں آنے لگا تو ان کالجوں میں ہندوستان سے آئے ہوئے لوگوں نے پڑھانے کی ذمہ داریاں سنبھال لیں' سرکاری دفاتر اور تجارتی اداروں کے علاوہ فوج اور پولیس میں ہندوؤں اور سکھوں کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا اسے بڑی تعداد میں مہاجرین اور کچھ مقامی افراد نے پر کیا' ان میں مختلف طبقات اور مختلف ذوق کے لوگ شامل تھے' یوں کوئٹہ جو پہلے کئی زبانوں اور بولیاں بولنے والوں کا شہر تھا' اردو کا مرکز بن گیا۔

کوئٹہ کے علاوہ لورالائی اور سبی میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں ڈاکٹر ناشط صدیقی' عبدالرحمن غور اور حریم اوستوی' جیسی شخصیات نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

کوئٹہ میں آغا صادق حسین نقوی، ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ، ارشد امروہوی، علامہ عیش فیروز پوری، محشر رسول نگری، تراب گوالیاری، محمد صادق شاذ اور سید صغیر حسین انبالوی نے مشاعروں اور ادبی تنظیموں کے قیام کے ذریعے ادبی ذوق کو پروان چڑھانے میں بڑا کردار ادا کیا، جبکہ محلوں میں آنہ لائبریریوں نے کرائے پر کتابوں کی فراہمی کی سہولت مہیا کرکے ناولوں اور افسانوں کے قارئین کی ایک بڑی تعداد پیدا کی، جس کی وجہ سے کوئٹہ میں ناول نگاروں کا ایک گروہ پیدا ہوا جس میں حمیدہ جبین، یاسمین صوفی اور رفعت زیبا اور لورالائی کی کاملہ خاتون جیسی معروف خواتین شامل تھیں۔ سی میں "ادارہ ادب بلوچستان" کے زیر اہتمام کئی کتابیں شائع ہوئیں جن میں افسانوی اور شعری مجموعوں کے علاوہ تنقیدی، علمی اور مذہبی کتابیں بھی شامل تھیں۔

پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں کو اردو زبان و ادب کے حوالے سے بلوچستان کا ایک اہم دور قرار دیا جا سکتا ہے اس دور میں آغا صادق حسین نقوی، محشر رسول نگری، ارشد امروہوی، اخگر سہارنپوری، ماہر افغانی، عین سلام، عبدالرحمن غور، پروفیسر کرار حسین، سردار نقوی، نوشہ نقوی، امتیاز حسین باقری حنفی، پروفیسر خلیل صدیقی، عطاشاد، محمد انور خان (طالب شیرازی)، رفیق راز، افضل کوٹلوی، شعیب حزیں، بشیر تمنا، تراب گوالیاری، عابد شاہ عابد، ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ، عبدالحمید عدم، صادق نسیم، قابل اجمیری، نسیم حجازی، شاداں امرتسری، ضیا رضوی، فضاانٹوروی، شفق سہارنپوری، حافظ ضیا، جمیل بھٹی، اختر نصیری، ادریس ارشاد، پروفیسر انعام الحق کوثر، پروفیسر انور رومان، پروفیسر سعید احمد رفیق، کامل القادری، انجم قزلباش، ش ۔ نخ، پروفیسر رشید احمد، سید خلیل احمد، اختر واحد قاضی، باقی بلوچ، یونس بھوپالی، محمد اقبال سلمان، ابن حنیف، رشید نثار، اور فقیر بخش بگٹی جیسی شخصیات نے کوئٹہ میں اردو کی ترویج و ترقی کے لئے اہم خدمات انجام دیں۔

"مرکزادب" "بزم ارتقائے ادب" اور "حلقہ ء ارباب ذوق" نامی ادبی تنظیموں اور ادبی گروہوں نے نظریاتی، فنی اور شخصی اختلافات کی بنا پر جہاں ادیبوں اور شاعروں کو تقسیم کیا وہاں محشر رسول نگری، آغا صادق حسین، خلیل صدیقی اور ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ جیسی

مرنجان مرنج اور ادب پرور شخصیات نے فروغ ادب کے ساتھ ساتھ باہمی روابط کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

رشید نثار نے اپنی کتاب "وادی شال کی کہکشاں" میں پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں کوئٹہ کی ادبی زندگی کا نہایت خوش سلیقگی اور محبت سے جائزہ لیا ہے جس سے اس زمانے کی ادبی فضا اور ادیبوں کے احوال کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں اردو شاعری کے رجحانات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن چونکہ وہ خود اس ماحول اور گروہ بندیوں میں کسی نہ کسی حیثیت سے شریک تھے اس لیے بسا اوقات وہ ایک ہی مسئلے پر مختلف آرا بھی دیتے ہیں مثلاً ایک مقام پر وہ لکھتے ہیں کہ "کوئٹہ میں سب سے فعال ادبی تنظیم "بزم ارتقائے ادب" تھی۔ اس بزم کے ساتھ بہت سے ادیب، دانشور، شاعر اور صحافی وابستہ تھے .... بزم ارتقائے ادب یوں تو بلوچستان میں ارتقاء کے لامحدود تصور کی ترجمان تھی مگر مذاکرے، مباحثے، مشاعرے منعقد کرانا اس بزم کی ذمہ داری تھی، لہٰذا ادیب کی تخلیقی ذمہ داری کے لیے بزم کے ممبران خود کو دائیں بائیں سے الگ رکھ کر کام کرتے تھے"۔ (رشید نثار،۱۹۹۹ء، ۶۲) لیکن آگے چل کر وہ خود اپنی بات کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کوئٹہ کی ادبی فضا تخلیقی اعتبار سے بہت اچھی تھی لیکن بزم ادب اور بزم ارتقائے ادب کی باہمی چپقلش کی بنا پر کوئی مرکزی جگہ نہیں تھی جہاں سب اکٹھے ہو کر شعر سناتے۔ بالآخر ہم سب نے محشر رسول نگری سے درخواست کی کہ وہ سب شعراء کو اپنے ہاں بلائیں"۔ (رشید نثار،۱۹۹۹ء، ۶۴)

شاعرانہ چشمکوں، رشک و حسد کے علاوہ علامہ عیش فیروز پوری، ارشد امروہوی، آغا صادق حسین کے شاگردوں کی چپقلشیں ایک طرف، اور دائیں اور بائیں کی نظریاتی کشمکشیں دوسری طرف، ادیبوں اور شاعروں کو نئے نئے خیالات پیش کرنے میں خوب کام آئیں، لیکن اس دور میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کی آواز مینارہ بابل میں بلبل کے چہکنے کی طرح دبی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ البتہ ماہر افغانی، عین سلام، عطا شاد، محشر رسول نگری، آغا صادق حسین، ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ جیسے شعراء نے اس دور میں بھی

اردو زبان و ادب کے فروغ میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور گو کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی انہوں نے اردو بولنے والوں سے بہتر تحقیقات پیش کیں۔

مشاعرے، مباحثے، علمی و ادبی مضامین، نئے اخبارات و رسائل کا اجرا، گورنمنٹ کالج میں ڈگری کلاسوں کا اجرا، ۱۹۵۶ء میں ریڈیو پاکستان کا قیام، اس تمام منظر نامے میں مقامی لوگوں کی شرکت اور شمولیت نے اردو ادب کے فروغ میں خاصا بڑا کردار ادا کیا۔

ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے ساتھ بلوچستان میں اردو زبان کو صاف اور شستہ لہجہ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ بچوں کے پروگرام ہوں یا بزم خواتین، طلبہ و طالبات کے لیے خصوصی پروگرام ہوں یا ڈرامے اور گفتگو، زبان و بیان کو سنوارنے میں کوئٹہ ریڈیو کی خدمات قابل قدر ہیں۔ ریڈیو کے مشاعروں نے نہ صرف مقامی شعراء کی تربیت و حوصلہ افزائی کی بلکہ انہیں پاکستان کے دیگر علاقوں میں متعارف کرایا۔ ریڈیو کے ساتھ ساتھ اسٹیج کے ڈراموں اور فلموں نے بھی اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

اس دور میں آغا صادق حسین نے بلوچستان کے نوجوان شعرا کی تربیت میں نہ صرف گہری دلچسپی لی بلکہ ادبی محافل کے انعقاد اور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور اصلاح کرکے نئی نسل کے نمائندہ شعرا کی ایک فصل تیار کی، یہ انہی کی روز و شب کی بے لوث کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج عین سلام، عطا شاد، رفیق راز اور نور محمد حمدم جیسے انتہائی خوش فکر و خوش کلام شعراء پر بلوچستان نازاں ہے۔ یوں تو بلوچستان میں مشاعروں کی ابتداء ہی طرحی مشاعروں سے ہوئی لیکن پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں طرحی مشاعروں نے نوآموز شعراء کی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔

خواتین نے اردو ناول لکھے۔ رفعت زیبا، یاسمین صوفی اور حمیدہ جبین جیسی خواتین بلوچستان کی پہچان بن گئیں۔ افسانوی ادب میں انور رومان، عبدالرحمن غور، بیگم خورشید مرزا، انجم قزلباش، یاسمین صوفی، ظفر علی مرزا، غوث بخش مرغزانی جیسے افسانہ نگاروں نے سماجی، ثقافتی اور سیاسی افسانے لکھ کر جہاں اردو کے فروغ میں حصہ لیا وہاں لوگوں کے شعور

کو بیدار کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

تحقیق و تنقید کے میدان میں عبدالصمد درانی کا نام بلوچستان میں سرفہرست ہے، انہوں نے قیام پاکستان کے بعد "بلوچستان میں اردو" کے عنوان سے نہایت اہم مقالہ تحریر کیا، اس کے علاوہ زبان و ادب اور ثقافت کے حوالے سے ان کے مضامین نے نوجوانوں میں تنقیدی شعور پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ عبدالصمد درانی کے بعد پروفیسر انور رومان، فضل احمد غازی، گل خان نصیر، آغا صادق، اختر واحد قاضی، پروفیسر سعید احمد رفیق، میر امان اللہ گچکی، پروفیسر خلیل صدیقی، میر مٹھا خان مری، بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنے والے اولین افراد میں سے ہیں جب کہ لسانی مطالعات میں پروفیسر خلیل صدیقی یکتا و تنہا تھے جنہوں نے بلوچستان میں بولی جانے والی زبانوں کے حوالے سے تحقیق کا دروازہ وا کیا۔ اس قافلے میں بعدازاں شامل ہونے والوں غوث بخش صابر، عبدالرحمن براہوئی، عین سلام، مرزا طاہر، بشیر بلوچ، صاحبزادہ حمید اللہ، صورت خان مری، عطا شاد، عبدالکریم بریالی، نصیر احمد، سلطان صابر، عبدالرحمن کرد، ظفر مرزا، عبدالرحمن غور، جسٹس امیر الملک مینگل، اور ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے ادبی انتقاد اور تحقیق کے ضمن میں نہایت اہم کارنامے سرانجام دیئے۔ ڈاکٹر انعام الحق نے "بلوچستان میں اردو" اور "بلوچستان میں فارسی" جیسی اہم تحقیقی کتابوں کے علاوہ ستر سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں جو سب کی سب اپنی مثال آپ ہیں تاہم بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے بارے میں تحقیق و تنقید کا دائرہ ابھی بہت محدود ہے۔ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں پروفیسر کرار حسین، آغا صادق حسین، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، پروفیسر خلیل صدیقی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر شمیم احمد اور پروفیسر سحر انصاری نے ابتدائی تحقیقی اور تنقیدی کاموں کے فروغ اور ان کی نگرانی اور رہنمائی میں گرانقدر حصہ لیا، یونیورسٹی آف بلوچستان کی فردوس انور قاضی اور فاروق احمد کو پی ایچ ڈی کی ڈگریاں مجتبیٰ حسین صاحب کی نگرانی میں کیے گئے تحقیقی مقالات پر دی گئیں جبکہ حاجی عبدالخالق بلوچ کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں پروفیسر خلیل صدیقی مرحوم کی سرپرستی اور نگرانی میں ہونے والی تحقیقات پر ملیں۔ اس کے علاوہ مسز رفعت مسرور نے

بھی جامعہ بلوچستان سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر ضیاالرحمن ضیا کا تعلق محکمہ تعلیم بلوچستان سے ہے آپ تعلیم و تدریس کے علاوہ تحقیق و تنقید اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ آپ نے سندھ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مقبول ظفر گزشتہ کئی برسوں سے کراچی یونیورسٹی سے اپنے پی ایچ ڈی کی تکمیل کے لیے تحقیق میں مصروف ہیں اور انہوں نے بھی موضوع کے انتخاب میں سرزمین بلوچستان اور اردو شاعری کے تعلق کو پیش نظر رکھا ہے۔ عرفان احمد بیگ نے "پروفیسر مجتبیٰ حسین فن اور شخصیت" کے عنوان سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے جبکہ مسز مبارکہ حمید نے محشر رسول نگری اور شہناز بانو نے آغا صادق حسین پر اپنے ایم فل کے تحقیقی مقالے تحریر کیے ہیں۔ پروفیسر مجیب یوسفی نے سندھ یونیورسٹی جامشورو سے پی ایچ ڈی کی ہے جبکہ طلبہ و طالبات کی ایک محدود تعداد جامعہ بلوچستان سے بھی ایم فل ڈگری کے لیے رجسٹرڈ ہے، مسز مبارکہ حمید بھی "بلوچستان میں اردو افسانہ" کے عنوان سے جامعہ بلوچستان سے پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔

تعلیمی اداروں، سرکاری دفاتر، ریڈیو پاکستان اور اخبارات و رسائل کے ساتھ ساتھ بعض ادب پرور شخصیات نے بھی بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں بڑا کردار ادا کیا، سبی کے میر عطا محمد مرغزانی، روجھان کے میر جعفر خان جمالی، گلستان کے صمد خان اچکزئی، اسلامیہ پریس کے حاجی محمد یوسف ان اولین افراد میں سے تھے جنہوں نے اردو کے فروغ میں بہت حصہ لیا۔ میر عطا محمد مرغزانی نے سبی سے "کلمتہ الحق" اور "الحق" کے نام سے دو پرچے جاری کیے، انگریز سرکار نے "الحق" کو بند کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا پریس بھی ضبط کیا لیکن وہ دم آخر تک اپنی جد و جہد میں مصروف رہے اور اپنا اخبار نکالتے رہے۔

عین سلام، مسعود صاحب، خورشید صاحب، زمرد حسین بھٹہ، بخاری برادران، اثر جلیلی اور عبدالرؤف ہاشمی جیسے بزرگوں نے ادبی کتابوں کے فروغ کے سلسلے میں اپنی زندگیاں بتا دیں۔ قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ میں ادبی کتابوں کی پہلی دکان عبدالرؤف ہاشمی

صاحب نے کھولی بعدازاں عین سلام، مسعود صاحب، مرحوم اثر جلیلی، سید عابد رضوی اور خورشید بک اسٹال کے خورشید صاحب اور ان کے بعد عابد بخاری نے اپنی دکان کھولنے کے ساتھ ساتھ مقامی شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں چھپوانے کا اہتمام کیا۔ قلات پبلشرز، گوشہ ادب، نساء ٹریڈرز، نیو کوئٹہ بک سٹال، قاسم بکڈپو اور بعد میں ناشاد پبلشرز جیسے اداروں نے علمی و ادبی کتابوں کے ساتھ ساتھ نصابی کتابوں کی اشاعت اور بلوچستان بھر میں تقسیم کا گرانقدر کام کیا۔

سرکاری و غیر سرکاری لائبریریوں کے علاوہ اسکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں نے بھی فروغ ادب میں اہم کردار ادا کیا۔

ادبی اور علمی تخلیقات اور تحقیقی کاوشوں کو عام کرنے میں جہاں رسائل و اخبارات نے اہم کردار ادا کیا وہاں پبلشرز اور پرنٹرز کی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ کوئٹہ پریس کے علاوہ اسلامیہ پریس کے حاجی محمد یوسف نے ادبی اور علمی کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ بخاری برادران نے ترجمہ و تحقیق کے ساتھ طبع زاد کتابوں کی اشاعت میں قابل ذکر کارنامے انجام دیئے، جبکہ زمرد حسین نے تاریخ، مذہب، فلسفہ، فکشن اور شاعری کے علاوہ تنقید پر نہایت اعلیٰ کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔

اس دور کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ پاکستان بھر سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد ملازمتوں، سیر و تفریح یا مشاعروں میں شرکت کی غرض سے یہاں قیام کیا جس سے نہ صرف بلوچستان کے شعراء نے استفادہ کیا بلکہ آنے والوں پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے۔ بلوچستان کے مخصوص سیاسی، سماجی، اقتصادی اور جغرافیائی ماحول نے انہیں بھی متاثر کیا۔ کوئٹہ کی حسین سرمئی شاموں، سیب کے باغات، بادام کے پھول اور انگور کی بیلوں نے اردو شاعری میں برنگ دیگر اپنے جلوے دکھائے۔

ستر کی دہائی بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے انتہائی انقلابی ثابت ہوئی۔ ۱۹۷۱ء میں بلوچستان کو صوبے کا درجہ ملا تو ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی میں ایم اے کی کلاسوں کا باقاعدہ اجرا ہوا، ۱۹۷۴ء میں پاکستان ٹیلی ویژن کوئٹہ سینٹر کا افتتاح ہوا اور قومی

اخبارات نے اپنے مقامی دفاتر کوئٹہ میں قائم کیے۔ ۱۹۷۳ء میں جامعہ بلوچستان میں شعبہ اردو کا قیام عمل میں آیا۔ ان تمام عوامل نے اردو زبان و ادب کے فروغ کی رفتار بہت تیز کر دی، ریڈیو اور اسٹیج کے ساتھ ساتھ ٹیلی ویژن کے ڈرامے، اخبارات کے ادبی صفحات، اور اسی دوران بلوچستان اسمبلی کا یہ فیصلہ کہ حکومت بلوچستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی، بلوچستان میں اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے انتہائی اہم اقدامات ثابت ہوئے۔

کوئٹہ کے علاوہ تربت، خضدار اور لورالائی میں ریڈیو اسٹیشنوں کا قیام، اور ضلعی سطح تک ڈگری کالجوں کے قیام نے بھی اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۹ء کے دوران بلوچستان میں اردو شاعری اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس دور میں مقامی شعرا کے کئی مجموعے شائع ہوئے، جن میں محشر رسول نگری، ماہر افغانی، عطا شاد، عین سلام، اعتبار ساجد، اوریا مقبول جان، سعید گوہر، زاہد آفاق، حاوی اعظم، سرور جاوید اور بیرم غوری بطور خاص قابل ذکر ہیں جبکہ آغا محمد ناصر، عرفان احمد بیگ، رشید حسرت، ڈاکٹر منیر رئیسانی، سہیل جعفر، افضل مراد اور صدف چنگیزی جیسے نوجوان شاعر بھی مشق سخن میں مصروف نظر آتے ہیں۔ تحقیق و تنقید کے حوالے سے اس دور میں پروفیسر مجتبے حسین، پروفیسر شیم احمد، پروفیسر شرافت عباس اور ڈاکٹر فاروق احمد اور آغا محمد ناصر قابل ذکر ہیں۔ قلم قبیلہ، نژاد نو، ادب جرگہ، حلقہ حرف و حکایت اور انجمن دبستان بولان جیسی فعال تنظیمیں وجود میں آئیں، عین سلام، عطا شاد اور ماہر افغانی اس دور میں بلوچستان کے شعراء کے سرخیل نظر آتے ہیں جو اپنی فنی عظمت، اور زبان و بیان کے حوالے سے عوام کے علاوہ شعراء کے لیے بھی قابل تکریم ہیں۔

انجمن دبستان بولان کے استاد رشید انجم کی سرپرستی میں کرنل فضل اکبر کمال، زاہد آفاق، صدف چنگیزی، فاروق فیصل، رفیق کبوہ اور عبدالرزاق ناگی جیسے نوجوان شعرا کا پورا گروہ نظر آتا ہے جو سنجیدگی سے شعر و ادب کی خدمت میں مصروف ہے۔

نثر میں ساٹھ کی دہائی کے برعکس بلوچستان میں ناولوں کا رواج ختم ہو جاتا ہے البتہ ساٹھ کی دہائی میں سید خلیل احمد اور آرتھر جاوید نے افسانوی ادب کو پروان چڑھانے میں

اہم کردار ادا کیا اور آرتھر جاوید کو صدر پاکستان کی طرف سے ان کے افسانوں پر صدارتی ایوارڈ بھی ملا۔ اسی کی دہائی میں افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود سامنے آتی ہے جن میں آغا گل، فاروق سرور، خادم میرزا، تاج رئیسانی، وحید زہیر، علی کمیل قزلباش اور روبینہ بٹ شامل ہیں۔

آغا گل نئی نسل کے افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام ہے، آپ کے افسانوں کا مجموعہ "پھوریچ" بلوچستان کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں پر مشتمل ہے، افسانوں کے علاوہ آپ نے تحقیق و ترجمہ کے ذریعے بھی قابل قدر کام کیا ہے۔

تاج رئیسانی نے اردو اور براہوئی میں نہایت اچھے افسانے لکھے، ان کے افسانوں میں بلوچستان کو اسکے ثقافتی اور سماجی پس منظر کیساتھ نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ افسانوں کے علاوہ تاج نے ٹیلی ویژن کے لیے بہت اچھے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ کوئٹہ میں ٹیلی ویژن سینٹر کے قیام کے بعد عابد شاہ عابد، عطا شاد، تاج رئیسانی، نسیم اچکزئی، فاروق سرور، اوریا مقبول جان اور عاشر عظیم کے ڈراموں نے پاکستان میں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ ڈراموں کے ساتھ ساتھ کوئٹہ ٹیلی ویژن نے نوجوانوں اور بچوں کے پروگراموں کے ذریعے ان کی عملی تربیت اور تشویق کا کام بھی کیا جس سے بلوچستان میں اردو کے فروغ میں مدد ملی۔

بیسویں صدی کے اختتام پر بلوچستان میں اردو زبان و ادب پر نظر ڈالی جائے تو اس کثیرا للسان صوبے میں رابطے کی زبان کے طور پر کلی طور سے اردو کی اجارہ داری نظر آتی ہے، تجارتی سطح پر ہونے والی گفتگو ہو یا عام لین دین، سڑکوں اور بازاروں میں بول چال کی زبان اردو ہے جبکہ تعلیمی اداروں میں اول تا آخر سائنسی موضوعات سے قطع نظر اردو زبان کا سکہ چل رہا ہے۔ تخلیقی سطح پر بلوچی، براہوئی، فارسی، سرائیکی، سندھی اور پشتو بولنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد اردو میں مصروف کار ہے اور وہ لورالائی یا ژوب کے پشتون ہوں یا قلات کے براہوئی، مکران کے بلوچ ہوں یا سبی کے سندھی بولنے والے، اردو میں نظم و نثر لکھنے والوں کی تعداد مقامی زبانوں میں لکھنے والوں سے کہیں زیادہ ہے۔

نئی نسل کے لکھنے والوں میں مظہر اقبال گوہر، ڈاکٹر باری، محسن بالاچ، سمیرا سحر، رقیہ آرزو، سید مصطفے شاھد، نوشین قمبرانی، بقا محمد بگٹی، جویریہ حق، حسین ہزارہ، نذر شباب، عبدالقادر، صائمہ جبرئیل، محسن چنگیزی، مسلم علی، صابر اور ظاہر لہڑی قابل ذکر ہیں۔ مقامی اور قومی اخبارات کے ادبی صفحات میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والی اس نئی نسل کی تخلیقات اس بات کی دلیل ہیں کہ اردو کا وہ پودہ جو ملا محمد حسن براہوئی کے توسط سے آج سے دو سو سال پہلے اس گل زمین میں لگایا گیا تھا آج ایک شجر ثمردار کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

ملا محمد حسن براہوئی

وفات ۵، رمضان المبارک ۱۲۷۲ھ بمطابق ۱۸۵۵ء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے نائب ملا محمد حسن براہوئی کا نام حرف آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب تک کی تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ آپ کا اردو کلام ۱۸۴۷ء میں ترتیب دیا جا چکا تھا۔ بلوچستان میں نہ صرف اردو شاعری بلکہ اردو زبان کے حوالے سے اولیت کا شرف ملا محمد حسن کو حاصل ہے اور بلوچستان میں اردو شاعری کا پہلا نمونہ آپ کے کلام کے توسط سے ہی ملتا ہے۔

ملا محمد حسن براہوئی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی تحریری دستاویز موجود نہیں لیکن ان کی زندگی کے حالات و واقعات کو مد نظر رکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا آغا علی جان بنگلزئی خوانین قلات کے ایک اہم اور بااعتماد مصاحب تھے اور خان قلات میر نصیر خان نوری (۱۷۴۹ء-۱۸۱۷ء) کے ان دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے جنھوں نے قید و بند کی صعوبتوں میں بھی ان کا ساتھ نبھایا اور ان کی حکومت میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ خان آف قلات نے آغا علی جان بنگلزئی کی انہی خدمات کی وجہ سے انکے بیٹے یعنی ملا محمد حسن کے والد میر عبدالرحمن کو کچھی کا نائب مقرر کیا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آغا علی جان بنگلزئی کا خاندان نہ صرف خوانین قلات سے قربت کی وجہ سے اہم تھا بلکہ انتظامی اور علمی لحاظ سے بھی قابل قدر تھا۔ ۱۹۰۷ء میں لالہ ہتورام اپنی کتاب "تاریخ بلوچستان" میں شجرہ نسب خاندان نائب خیل کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ "یہ خاندان دراصل بدوزئی بنگلزئی میں ایک فرقہ ٹھینگی زئی ہے، آغا علی خان کا نام دراصل علی خان تھا اور خان صاحب میر نصیر اول کے پاس نوکر تھا جب میر نصیر خان قندہار میں بحکم نادر شاہ نظر بند تھا تو اس وقت آغا علی بھی ہمراہ نصیر خان کے قید میں تھا۔ آغا کا خطاب نصیر خان نے اس کو دیا تھا۔ جب نصیر

خان، خانی کلات پر مسلط ہوا جو لوگ ہمراہ اس کے ثابت قدم رہے ہر ایک کو بقدر حیثیت و لیاقت ان کے دربار میں جگہ عطا کی پہلے خود آغا علی دربار نصیرخان میں مقرب تھا لیکن اس کے بعد پسرش نائب عبدالرحمن بعدہ میر محمود خان نائب کچھی کا ہوا وہ زیادہ نامور ہوا چنانچہ بزمانہ میر محراب خان نائب عبدالرحمن اور پسرش عبدالقادر کو دربار خان صاحب میں اس قدر دستگاہ تھی کہ آخوند محمد صدیق اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ مبارک خان پسر آخوند فتح محمد وزیر کو سردار قادر بخش زرک زئی جھلاوان سردار نے بموجب صلاح نائب عبدالرحمن و عبدالقادر کے قتل کیا تھا اس سے اس کی طاقت کا خوب اندازہ ہو سکتا ہے کہ وزیر مدارالمہام خان کلات کیا تھا کہ وزیر سے مقابلہ کر سکتا تھا۔ آخرالامر بعد مقتولی میر محراب خان و خانی میر نصیرخان دوم نائب محمد حسن پسر دوم نائب عبدالرحمن نے اس قدر زور پایا کہ خاندان آخوندزادہ کو دربار کلات سے محروم کر کے خود وزیر ہوا اور اس کا بھائی محمد امین نائب کچھی کا تھا اور نائب محمد حسن دونوں بڑے سرداران سراوان و جھلاوان چنانچہ سردار ملا محمد خان رئیسانی' سردار تاج محمد زرکزئی کو اپنا داماد کیا۔ ریاست کلات میں زیادہ طاقتور یہ دونوں سردار تھے۔ خان کلات بھی ان کے ہاتھ میں تھا جب یہ دونوں سرداران کلان بھی نائب محمد حسن سے رشتہ میں پیوند ہو گئے تب گویا کہ مالک ریاست کلات کا نائب محمد حسن خان تھا۔ علاوہ اس کے نائب مذکور کو ذاتی لیاقت علمیت واقفیت اور قابلیت بھی عمدہ تھی نائب محمد حسن نے بلوچی اور فارسی میں چند شعر اور غزلیں بھی کہی ہیں چنانچہ شہادت میر محرابِ خان کا شعر بھی اسی معزز نے کہا ہے.....اس نامور نائب یا وزیر کے مکانات شہر کلات میں اب تک یادگار موجود ہیں۔ ان کے دیکھنے سے بھی قیاس ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو کس قدر دستگاہ تھی۔ لیکن ہمیشہ زمانہ ہر ایک شخص کے ساتھ یکساں نہیں رہتا اور کمال کو ہمیشہ زوال ہوا کرتا ہے۔ جب اس کا بخت کمال کو پہنچ چکا تھا پھر زوال کی طرف رجوع ہوا میر نصیرخان کے دل میں شک پیدا ہو گیا کہ اب نائب محمد حسن کو اس قدر طاقت ہو گئی ہے کہ اگر وہ چاہے تو ہم کو خانی سے بیدخل کر سکتا ہے۔ جب میر نصیر خان بعد ملاقات صاحبان عالیشان افسران برطانیہ جیکب آباد سے واپس آیا اس کو کچھ بندوق ہا سرکار

سے بطور خلعت کے ملیں اور مبلغ پچاس ہزار روپیہ سالیانہ مواجب مقرر ہوا اور یہ صلاح دی گئی کہ وہ اپنے آپ کو مضبوط کر کے ملک پر حکومت کرے۔ تب اس نے کچھی آ کر فوج بھرتی کرنی شروع کر دی۔ یہ بات نائب محمد حسن اور اس کے رشتہ داران سراوان اور جھلاوان کو ناپسند تھی۔ اسی کے اوپر مابین خان اور وزیر اور سرداران کے کچھ نااتفاقی شروع ہو چلی۔ بنا بریں میر نصیر خان نے دیکھا کہ جب تک وہ نائب کو قید نہیں کرے گا اس کی حکومت پورے طور قائم نہیں ہو گی۔ چنانچہ اس نے نائب محمد حسن کو قید میں ڈال دیا جو آخر کار اسی قید میں فوت ہوا"۔(لالہ'۱۹۸۷ء' ۳۵۷)

ملا محمد حسن براہوئی نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ وسطی بلوچستان کے ایک چھوٹے سے علاقے قلات کا قبائلی معاشرہ تھا' جو اپنی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا' یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور افغانستان کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ صدیوں سے افغانستان اور ایران کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے ریاست قلات کی سرکاری' علمی اور ادبی زبان فارسی تھی اور مقامی زبانوں یعنی بلوچی اور براہوئی میں پڑھنے لکھنے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ بلوچستان کی تاریخ دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں مدارس اور تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر تھے۔ اپنے خاندانی پس منظر کے حوالے سے ملا محمد حسن یقیناً" ان چند خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں گے جو عربی اور فارسی کے علاوہ بلوچی اور اردو بولنے' پڑھنے اور لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے چار خوانین کو دیکھا اور ان میں سے دو کیساتھ وزیراعظم کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ بھی کام کیا۔ ملا محمد حسن براہوئی کی انہی خصوصیات نے انہیں خوانین قلات کا منظور نظر بنایا ہو گا اور خان قلات میر محراب خان (۱۸۳۱ء-۱۸۳۹ء) نے انہیں اپنا وزیراعظم مقرر کیا۔ گل خان نصیر اپنی کتاب "تاریخ بلوچستان" میں ملا محمد حسن کو ایک سازشی قرار دیتے ہیں اور ان پر گوناگوں الزامات عائد کرتے ہیں ان کی کتاب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ملا محمد حسن براہوئی نہ صرف خان آف قلات کے وزیر رہے بلکہ وہ ایک عرصے تک انگریزوں کے ساتھ بھی منسلک رہے' خان

قلات میر محراب خان کی شہادت میں ملوث ہونے کے الزامات کے باوجود ملا موصوف میر محراب خان کے بیٹے میر نصیر خان دوئم (۱۸۴۰ء-۱۸۵۷ء) کے وزیر بھی رہے اور انگریزوں سے سفارتی تعلقات کے حوالے سے گفت و شنید بھی کرتے رہے۔ انہی سرکاری' درباری سازشوں اور دشمنوں کی کینہ پروری اور بغض و عناد کی وجہ سے بالآخر انہیں قید میں ڈالا گیا جہاں وہ دو سال بعد فوت ہوئے۔ ان کے بیٹے میر مولا داد خان نے جو تاریخ وفات کہی اس کے مطابق ملا محمد حسن ۵' رمضان المبارک ۱۲۷۲ ہجری میں زہر خورانی کی وجہ سے فوت ہوئے۔

عاقبت زہر ریخت در حلقش   از کف حاسدان کین آور
شد شہید آن اسیر شد کلام   رفت در خلد بر لب کوثر
گفت با آہ و نالہ در کوشش   کہ دو ہفت از غفور ساز بدر

(بنگلزئی' ۱۹۷۳ء' ۷)   ۱۲۸۶- ۱۴ = ۱۲۷۲ھ

نائب ملا محمد حسن براہوئی کو تاریخ میں ایک متنازعہ شخص تو بنا دیا گیا لیکن ان کی صلاحیتوں اور علم و دانش کے وہ بھی معترف ہیں جو ان کو ایک سازشی اور غدار قرار دیتے ہیں۔ تاریخ بلوچستان کے مصنف گل خان نصیر لکھتے ہیں کہ " ملا محمد حسن بلا کا ذہین' چالاک اور چاپلوس تھا۔ انگریزوں کی طرف سے اشارہ پا کر اس نے دو چار ملاقاتوں میں میر نصیر خان کا دل موہ لیا۔ میر نصیر خان نے زیادہ تر اس خیال سے بھی کہ ملا محمد حسن انگریزوں کے ساتھ وقت گزار چکا ہے' ان کی خو بو اور سیاست سے واقف ہے' انگریزوں کے ساتھ گفت وشنید اور خط و کتابت کرنے میں اس کی صحیح رہنمائی کرے گا اور اس طرح اسے انگریزوں کی خوشنودی حاصل ہو سکے گی اپنے باپ کے قاتل اور بلوچستان کے غدار اعظم کو پھر آغوش میں لے کر اپنا وزیر بنا دیا۔" (نصیر' ۱۹۷۹ء' ۱۸۰) اس سے زیادہ ان کی قابلیت اور صلاحیتوں کی کیا داد دی جا سکتی ہے۔

ملا محمد حسن براہوئی ایک صاحب کمال اور انتہائی ذہین شخص تھے وہ بیک وقت سیاست کی وادی پرخار کے باسی بھی تھے اور علم و دانش سے مالا مال عالم بھی' عربی' فارسی'

بلوچی' براہوئی اور اردو زبانوں پر دسترس رکھنے والے بھی اور تین زبانوں کے شاعر بھی۔ ان کے فارسی اور بلوچی شاعری کے ہزاروں اشعار اب تک محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر اپنی کتاب "بلوچستان میں اردو" کے صفحہ نمبر ۳۳۱ پر لکھتے ہیں کہ " محمد حسن براہوئی بیک وقت بلوچی' براہوئی' فارسی اور اردو میں شعرگوئی کا ملکہ رکھتے تھے' آپ کے پانچ قلمی دیوان دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں چار تو فارسی زبان میں ہیں پانچویں قلمی نسخے کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ فارسی میں ہے اور اکتالیس اوراق پر مبنی ہے اس میں صرف مسدس ہے' حصہ اردو کے اوراق اکتیس ہیں اس نسخے کی لوح سنہری ہے ہر ورق پر دوہرا سنہری حاشیہ موجود ہے بعض عنوانات اور مقطعے سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں.... مجموعی طور پر قلمی نسخہ دیدہ زیب ہے اردو کے اشعار کی تعداد پانچ سو بائیس ہے دیباچہ فارسی زبان میں رقم کیا گیا ہے۔" (کوثر' ۱۹۸۶ء' ۳۳۱)

کلیات محمد حسن براہوئی کو ۱۹۷۶ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے پہلی مرتبہ شائع کیا جسے ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے مرتب کیا تھا۔ ملا محمد حسن کے اردو کلام میں منقبت' ترجیع بند' مستزاد' مخمس اور رباعیات بھی موجود ہیں۔ ان میں حضرت علی علیہ السلام کی شان میں تقریباً ڈیڑھ سو اشعار ہیں۔

ایک ایسے دور میں جب بلوچستان میں مسجدوں کے امام بھی افغانستان سے آتے تھے' ملا محمد حسن براہوئی جیسی شخصیت کا بلوچستان میں ہونا یقیناً" ایک حیرت کی بات ہے۔نائب ملا محمد حسن براہوئی کی اردو شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے اردو شعراء سے متعارف تھے اور ان کے کلام تک بھی ان کی رسائی تھی' لیکن اردو کے عظیم مراکز سے بہت دور اندرون بلوچستان' جہاں پڑھنا لکھنا تو دور کی بات' اردو بولنے اور سمجھنے والے بھی موجود نہیں تھے' ملا محمد حسن براہوئی کی اردو شاعری ایک اچنبھے کی بات ہے۔

تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہے کہ نادر شاہ افشار اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملوں کے وقت ریاست قلات کے لشکری ان کی فوج میں موجود تھے

اور سندھ سے ملحقہ سرحدات پر اردو زبان و ادب کے اثرات یقیناً" پڑے ہوں گے جس کی وجہ سے بلوچستان کے لوگ اردو سے کسی نہ کسی حد تک واقف بھی ہوں گے لیکن بلوچستان کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی ماحول میں جہاں صدیوں سے فارسی کی حکمرانی رہی وہاں اردو کی ضرورت تجارتی اور سفارتی مقاصد کے علاوہ شاید ہی کچھ ہو۔ ایسے میں ملا محمد حسن براہوئی کی شخصیت ہی ایسی ہو سکتی تھی جو اُردو زبان و ادب سے تعلق پیدا کر سکتی۔ البتہ ایسے دور میں جب دہلی میں ولی دکنی کے ریختہ نے میراور غالب جیسے عظیم شعراء کی غزل کی صورت میں اردو شاعری کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا ملا محمد حسن براہوئی کی اردو شاعری کا مقابلہ ابتدائی دکنی دور کے شعراء سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ملا محمد حسن براہوئی کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو زبان پر اتنی قدرت نہیں رکھتے تھے جو ہندوستان کے رہنے والوں نے ان سے بہت پہلے حاصل کر لی تھی۔ وہ اردو کو "زبان ہندی" کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں زبان و بیاں کی نہ وہ صفائی و روانی ہے اور نہ وہ شعری معیار و لطافت جو اس دور کے دیگر اہل زبان شعراء کے یہاں عام ہے۔ ملا محمد حسن کے دیوان کو دیکھ کر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا ذخیرہ الفاظ محدود ہے اور فارسی زبان پر کامل دسترس رکھنے کے باوجود وہ اردو زبان پر کما حقہ دسترس نہیں رکھتے تھے۔ اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ " چونکہ این حقیر پر تقصیر در الفاظ ہندی مہارت کامل و قوت شامل کما ہو حقہ نداشتہ، بنا بر امداد الہی و طریقہ طبع آزمائی چند غزل معدود در سلک تحریر مشہود ناظرین زراکت و فطانت آئین میسازد، امید کہ اگر سہو خطا دراں مشاہدہ کنند بذیل تصحیح و اصلاح بپوشند۔" ان کی شاعری کے عمومی موضوعات عشق اور محبوب کی تعریف و توصیف ہیں۔ جسے ہم "گفتگو کردن بہ زنان" والی شاعری کہہ سکتے ہیں، جس میں محبوب کے خدوخال، قد و قامت اور جفاؤں کا بیان ہے۔ البتہ حضرت علی علیہ السلام اور آئمہ اطہار کی شان میں اچھے اشعار ہیں اور دعائیہ شعر بھی ہیں۔ جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ ملا محمد حسن کے اشعار میں فارسی کا رنگ غالب ہے اور جب وہ فارسی بحروں میں فارسی شعراء کی زمینوں میں شعر کہتے ہیں تو ان کا معیار کچھ بہتر ہو جاتا

ہے۔ مثلاً"

مرا گل رو رکھو گلشن میں گام، آہستہ آہستہ
کہ زیبا ہے گلستاں میں خرام آہستہ آہستہ

رخ مرے یار کا گلزار ہے سبحان اللہ
لب ترا لعل شکر بار ہے سبحان اللہ

کروں کیا وصف میں جو کیا ہے دلبر
سمن بر ہے سمن بر ہے سمن بر

ملا محمد حسن کی اکثر غزلیں سات سات اور نو نو اشعار پر مشتمل ہیں، ملا موصوف نے ان زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے جن میں کئی مشہور اساتذہ کی غزلیں ہیں اور بعض سنگلاخ زمینوں میں بھی غزلیں ملتی ہیں جیسے

مکھ تیرا دیکھ کر ہوا شمس و قمر خجل
اے لب شکر ترے دو لبوں سیں شکر خجل

کر مکھ سیں دور گیسوئے پر پیچ و تاب کوں
بے تاب کر ز تاب رخ آفتاب کوں

بعض اشعار میں لفظوں کے بر محل استعمال سے خوبصورتی پیدا کی گئی ہے اور قافیے کے ذریعے صوتی تکرار پیدا کرکے ترنم اور نغمگی پیدا کی گئی ہے

تیرے لب پر جس کے لب نے لب رکھا، کہنے لگا
شہد ہے شکر ہے، شیریں ہے، شکر گفتار ہے

گلشن میں ترا قد، قد دل جوئی ہے واللہ
گل روئی ہے، گل روئی ہے، گل روئی ہے واللہ

فارسی اور اردو کے علاوہ ان کے یہاں پنجابی کے بہت سے الفاظ جیسے' لکایا بمعنی چھپایا' گل' بمعنی گلا' چلکنا بمعنی چمکنا' تینوں بمعنی تجھے وغیرہ استعمال ہوئے ہیں- ملا محمد حسن نے احادیث بھی اپنے اشعار میں نقل کی ہیں- ملا محمد حسن براہوئی کے کلام میں تذکیر و تانیث کی پابندی بھی نہیں ملتی اور فنی لحاظ سے بھی ملا محمد حسن کا کلام نقائص سے پاک نہیں اور بیشتر غزلوں کے مصرعے بے وزن اور اشعار بحر سے خارج ہیں- بعض غزلیں قافیے سے بے نیاز اور ساقط الوزن ہیں- املا کی غلطیوں نے اشعار کے رہے سہے حسن کو مزید داغدار بنا دیا ہے- انہوں نے بلوچی' براہوئی الفاظ کا استعمال اپنی اردو شاعری میں نہیں کیا اور نہ ہی مقامی حالات و واقعات اور اشیاء کا ذکر کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو میں اپنے تخلیقی شعور سے کچھ زیادہ کام نہیں لیا ہے لیکن ان تمام نقائص کے باوجود بلوچستان جیسے دور افتادہ اور اردو زبان و ادب کے ثقافتی' علمی اور ادبی مراکز سے دور ملا محمد حسن کی یہ اولین کوشش انتہائی اہمیت کی حامل ہے- وہ بلوچستان میں اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے نقش اول ہیں-

یار کھولا صف گلزار میں چوں بند نقاب
ہو گیا غرق عرق شرم سیں گلشن میں گلاب
دیکھ کر مکھ اسیں گل رنگ کا گلہائے چمن
کہا اوس گل نے کیا صفحہ گلشن کوں خراب
ہات میں جام و دگر ہات میں مینا کوں پکڑ
آ کھڑا مجمع خوباں جو او مست شراب
زلف کا قفل ترا شانے نے جس دم کھولا
آہوئے چین و خطا پارہ کیا نافہ ناب
کرنا اوصاف ترا کس کا جو مقدور نہیں
ذکر کرتا ہے حسن خلق میں از حکم کتاب

ملک خوبی میں رخ ماہ تمام ایسا ہو
باغ میں سرو خراماں کوں خرام ایسا ہو
طوطی اس لب سیں شکر لے کے سخن گو ہویا
آری آری لب شیریں کا کلام ایسا ہو
موئے سیں رو کو چھپایا و چمن میں آیا
پردہ داری رخ خورشید کوں شام ایسا ہو
مے پیا مجلس عشاق میں آیا چل کر
جمع میں شمع بت مست مدام ایسا ہو
سرو باغی نے دکھا قامت و رفتار اس کا
خم کیا قد کہ قد و قامت و گام ایسا ہو
خلق ہر سو سیں پھرا' رو کیا اس کی طرف
پیروی فرض ہے چو پشت امام ایسا ہو
یار اسی دم ز حسن ایں غزل نغز سنا
کہا خوبان شکر لب کوں غلام ایسا ہو

وفا کروں میں اگر' او جفا' کرے تو کرے
جفا' وفا پہ اگر بے وفا' کرے تو کرے
نقاب کھول کے گلشن میں جب چلا آوے
ہزار بلبل بے دل' نوا کرے تو کرے
دیا چو شانہ کف یار خط مشکیں کوں
بناف نافہ آہو' خطا کرے تو کرے
یہی کرشمہ و ناز و ادا سیں وہ دلبر

بلند گر صف خوباں میں جا کرے تو کرے
یہ قد و قامت و خوبی سیں، در صف گلشن
چمن میں شور قیامت، بپا کرے تو کرے
شکر دیا لب طوطی کوں لب سیں وہ مہو
سخن کو او لب شیریں ادا کرے تو کرے
حسن کا دل جو ہے مائل بہ حسن گرویاں
ہمیشہ گل کا ثنا و دعا کرے تو کرے

جب چمن میں وہ یار آتا ہے
گل سیں بوئے بہار آتا ہے
باد اٹھایا جو پردہ اس گل سیں
نالہ صد ہزار آتا ہے
گل خجل ہو کے گلستاں میں کھڑا
مگر او گل عذار آتا ہے
دیکھ رفتار اس کا سرو چمن
باغ میں بے وقار آتا ہے
بہر سرو خرام تیرا پری
کبک از کوہسار آتا ہے
تیری پابوسی واسطے جاناں
صف گل شرم سار آتا ہے
بہر وصف صنم ز نطق حسن
صفت بے شمار آتا ہے

رخ مرے یار کا گلزار ہے، سبحان اللہ
لب ترا لعل شکر بار ہے، سبحان اللہ
مکھ ترا آئنہ تمثال جھلکتا ایسے
طوطی ہند کو گفتار ہے، سبحان اللہ
دست مشاطہ تری زلف کوں چوں شانہ کرے
کہا یہ تار سیہ، مار ہے، سبحان اللہ
تیرے لب بوسہ جو مارا لب ساغر اوپر
مائل اس کا لب ہشیار ہے، سبحان اللہ
تیرے مکھ سیں جو صبا پردہ اٹھایا بہ چمن
شرم سیں چہرہ گل، خار ہے، سبحان اللہ
حسن تیرا نہ حسن دیکھ ہوا حسن پرست
سب حسیں تجھ کو پرستار ہے، سبحان اللہ

پیچ و پیچ خم بہ خم، صد حلقہ زلف یار ہے
قید ہے، تار رسن ہے، رشتہ ہے زنار ہے
یہ کجی تیرے بھووں کی دیکھ کر عالم کہا
قوس ہے، مہ ہے، کماں ہے، تیغ جوہر دار ہے
تیرے لب پر جس کے لب نے لب رکھا کہنے لگا
شہد ہے، شکر ہے، شیریں ہے، شکر گفتار ہے
خضر تیرے قدم کا اے بجن در بوستاں
گل ہے، بلبل ہے، چمن ہے، صفحہ گلزار ہے

نیش مژگاں کو ترے میں اے پری رو کیا کہوں
تیر ہے، نوک سناں ہے، ناوک خونخوار ہے
دے حسن کے ہاتھ میں جو ہے تمھارے ہاتھ میں
جام ہے، مینا ہے، جاناں شیشہ ہے، سرشار ہے

مستزاد ہندی

تجھ مکھ نے کیا غرق عرق اے بت گلرو   گل ہائے چمن کو
تجھ زلف کے ہر تار کیا بند، پری رو   آہوئے ختن کو
دو لب میں نہاں ہے جو تار تنگ شکر کا   اے یار شکر لب
لے کر ترے دو لب سیں لب طوطی خوش خواں   وہ لحظہ سخن کو
جب رخ سے ترے باد صبا پردہ اٹھایا   تجھ رخ کی جلا دیکھ
پروانہ مرا جمع میں پھر از سر غیرت   اس شمع لگن کو
جس قبر کے اوپر جو پڑا تجھ کو گزر گاہ   چوں حضرت عیسی
اس مردہ ترے دم سیں اسی دم نکل آیا   کر پارہ کفن کو
زنار کیا تار سر زلف تو گل پر   ہر مومن و کافر
بے شک تو سر مو کو بسر شانہ تو وا کر   صد پیچ و شکن کو
با قد خراماں صف گلشن میں چلا آ   اے سرو سہی قد
اس قد قیامت سیں خجل کر بہ سر پا   اس سرو سمن کو
میں بندہ ہوں تیرا تو تو مرا ہے جو خداوند   خوبی سیں خبر لے
اے خسرو خوباں، کرو اک رات تو خورسند   جانانہ حسن کو

کروں کیا وصف میں جو کیا ہے دلبر

سمن بر ہے، سمن بر ہے، سمن بر
بپا اس قد و بالا کو کہوں کیا
صنوبر ہے، صنوبر ہے، صنوبر
دو نرگس اس کا جوں جلاد بے رحم
ستمگر ہے، ستمگر ہے، ستمگر
بہ دل بردن دو لب آں غنچہ لب کا
فسوں گر ہے، فسوں گر ہے، فسوں گر
بہ قتل عاشقاں وہ شوخ سرمست
دلاور ہے، دلاور ہے، دلاور
اسی کے واسطے بلبل چمن میں
نوا گر ہے، نوا گر ہے، نوا گر
جسے تیں دل دیا وہ دلربا کوں
تونگر ہے، تونگر ہے، تونگر
بہ بحر عشق جس نے غوطہ مارا
شناور ہے، شناور ہے، شناور
جلایا عشق کی آتش میں جو جاں
سمندر ہے، سمندر ہے، سمندر
پلایا جس کو مے، محشر تلک او
قلندر ہے، قلندر ہے، قلندر
حسن کا کلبہ اس کے مکھ سیں دیکھو
منور ہے، منور ہے، منور

حوالہ جات

لالہ' رائے بہادر ہتورام' تاریخ بلوچستان بلوچی اکیڈمی کوئٹہ' بار سوئم ۱۹۸۷

بنگلزئی' میر محمد حسن' گلدستہ قلات مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ۱۹۷۳ء

نصیر' میر گل خان نصیر تاریخ بلوچستان قلات پبلشرز کوئٹہ بار دوم ۱۹۷۹ء

کوثر' ڈاکٹر انعام الحق' بلوچستان میں فارسی شاعری بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ۱۹۶۸ء

کوثر' ڈاکٹر انعام الحق' بلوچستان میں اردو مرکزی اردو بورڈ گلبرگ لاہور ۱۹۶۸ء

براہوئی' ملا محمد حسن کلیات محمد حسن براہوئی مجلس ترقی ادب' لاہور ۱۹۷۶ء

سردار محمد یوسف خان پوپلزئی

ولادت ۱۸۶۳ء وفات ۱۹۲۶ء

برٹش بلوچستان میں اردو کے فروغ میں جن شخصیات نے اساسی کردار ادا کیا ان میں سردار محمد یوسف خان پوپلزئی کا نام نامی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس خطے سے ادبی رسائل کا اجراء اور مشاعروں کی روایت انہی کی مرہون منت ہے۔ رائے بہادر لالہ ہتو رام اور عابد شاہ عابد کے بعد انگریزوں کے دور حکومت میں سردار محمد یوسف کی ذات ہی کے حوالے سے ہمیں بلوچستان میں اردو کی تحریریں ملتی ہیں۔ آپ نے بلوچستان میں ایک ایسے دور میں اردو شاعری کی بنیاد رکھی جب لوگ اردو کے نام سے بھی ناآشنا تھے' چند ہندو اور سکھ تاجر گھرانوں کے علاوہ عام لوگوں میں ہندی اور اردو سمجھنے کی صلاحیت بھی نہیں تھی' آپ نے اردو زبان کو سرکاری اور عدالتی ضرورتوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ترقی اور ان کی پسماندگی ختم کرنے کے لیے عام کیا اور اس کے لیے اپنی خوش ذوقی کی وجہ سے مشاعروں کا سہارا لیا۔ بلوچستان میں بالعموم اور کاکڑستان میں بطور خاص اردو کو پروان چڑھانے میں آپ ''السابقون الاولون'' کا مرتبہ رکھتے ہیں۔

سردار محمد یوسف خان پوپلزئی کے آباء و اجداد افغانستان کے ان مقتدر خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو شاہ شجاع کے زمانے میں افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آگئے تھے۔ آپ کے دادا سردار محمد شریف خان کابل سے پنجاب آ کر آباد ہو گئے تھے۔ آپ کے والد سردار محمد یار خان پنجاب میں ای اے سی تھے اور نہایت عالم و فاضل شخص تھے۔ سردار محمد یوسف ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے اور اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ آپ عربی' فارسی' انگریزی اور اردو زبانوں پر مکمل دسترس رکھتے تھے اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی خاص صلاحیت کیوجہ سے ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ ۱۸۹۰ء میں آپ ژوب میں پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں ناظر مقرر ہوئے اور اس کے

بعد پوری زندگی بلوچستان کے مختلف مقامات پر مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ژوب کے علاوہ آپ دکی، سی، نوشکی اور لورالائی میں رہے اور ۱۹۲۳ء میں بحیثیت ای اے سی ریٹائر ہوئے۔ آپ کا انتقال ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ آپ کے بیٹے سردار رشید جان بھی کوئٹہ کے سماجی، علمی اور ثقافتی حلقوں کے مقبول ترین شخص تھے۔

سردار محمد یوسف پوپلزئی ایک منکسرالمزاج، خوش خلق، ملنسار، عوام دوست اور اعلی ادبی ذوق رکھنے والے، انتہائی تہذیب یافتہ شخصیت تھے۔ آپ عربی، فارسی، پشتو، اردو اور انگریزی کے علاوہ مقامی زبانوں کو بھی سمجھتے تھے۔ آپ کا مطالعہ وسیع تھا اور آپ فن شاعری پر مکمل عبور رکھتے تھے۔

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے اولین محسن ہونے کے علاوہ آپ نے اہل بلوچستان کی اقتصادی، سماجی اور معاشرتی بدحالی کی وجہ تعلیم کے فقدان کو پایا، آپ نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اہمیت اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو کھپانے میں بھی بڑا کردار ادا کیا۔ اس زمانے میں سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔

آپ نے بلوچستان میں اس وقت اردو شاعری اور اردو مشاعروں کی بنیاد ڈالی جب یہاں کے مخصوص سماجی اور ثقافتی پس منظر کی وجہ سے اس قسم کے محفلوں کی کوئی روایت بھی نہیں تھی، اور صرف یہی نہیں "قندیل خیال" کے نام سے ۱۹۱۵ء میں لورالائی سے پہلا ادبی جریدہ بھی آپ کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

سردار محمد یوسف خان پوپلزئی کے اشعار بلوچستان میں اردو زبان کے اولین نمونوں کے طور پر تو نہیں دیکھے جا سکتے اور نہ ہی ان کی شاعری کو خالصتاً" بلوچستان کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے کیونکہ نسلاً" افغانستان سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کی بنیادی تعلیم و تربیت پنجاب میں ہوئی تھی، سردار محمد یوسف خان کی اہمیت اور بزرگی کا راز ان کے اس مشفقانہ اور ہمدردانہ رویئے اور طرز تربیت میں ہے جو انہوں نے یہاں کے مقامی شاعروں سے روا رکھا۔ انہوں نے شعر و سخن کی مجلسوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں میں ادبی ذوق کو

پروان چڑھایا اور ان کے اردو اشعار کی اصلاح بھی فرمائی۔ بلوچستان میں اردو شاعری کی ترویج و تشویق میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

سردار محمد یوسف کے اشعار دست برد زمانہ کے ہاتھوں محفوظ نہ رہ سکے البتہ ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی کتاب "بلوچستان میں اردو" میں ان کی چند غزلیں نقل کی ہیں، ان میں تین غزلیں تو ایک ہی ردیف، قافیے اور بحر میں ہیں اور کسی طرحی مشاعرے کا حاصل معلوم ہوتی ہیں جب کہ ایک غزل اور چند دیگر اشعار ہیں۔ ان اشعار کی تعداد کم سہی لیکن اس سے اردو زبان پر ان کی گرفت اور سہولت کے ساتھ شعر کہنے کی استعداد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شرارے آہ کے اٹھتے تھے، گھر سے لے کے مدفن تک
شہید ناز کی تربت پہ روئیں، کیوں نہ دشمن تک
ترے جود و سخا نے بھر دیئے عالم کے دامن تک
میں خاک آرزو، اڑ اڑ کے پہنچوں کیوں نہ دامن تک
خدا کی نعمتوں کا شکر ہو کیا کیا ادا مجھ سے
دیا ادنی سے اعلی تک، دیا زردہ تنجن تک
شفیع المذنبیں ہے رحمتہ اللعالمیں ہے تو
میں چھوڑوں کس طرح داماں ترا محشر کے دامن تک
کوئی نقشہ بت رنگیں ترا آخر نرالا ہے
نثار روئے زیبا ہیں مسلماں سے برہمن تک
مجھے محبوب حق کی صورت زیبا سے سیری ہے
سگ دنیا مجھے پروا نہیں زردہ تنجن تک
وہ بن ٹھن کر تفرج کے لیے آتے ہیں گلشن تک
شعاع بقعہ نور آ رہی ہے میرے چلمن تک

یہ کس مہ رخ کی آمد کلبہ احزاں کی جانب ہے
چمکتی چاندنی سی آ رہی ہے صحن گلشن تک

مرے اس شوخ کی ترچھی نگہ برچھی بلا کی ہے
مقابل اس کے دل کیا ہے کٹا جاتا ہے جوشن تک

مجھے کیوں روکتا ہے ایک عالم اس پہ شیدا ہے
پڑھا کرتے ہیں کلمہ اس کا مومن سے برہمن تک

وصیت باغباں سے تھی دم آخر یہ بلبل کی
جنازہ آرزوے گل میں میرا جائے گلشن تک

خدایا آبرو یوسف کی رکھ لے اس زمانے میں
اسے اب تاکتی بھنگن سے لے کر ہے فرنگن تک

عداوت ڈال دی دنیا نے کیسی کالے گوروں میں
کہ ارباب مروت آج کل رہتے ہیں شوروں میں

ہماری خوبی قسمت کے لچھن ہی نرالے ہیں
خدا کی شان پانی تھم رہا الٹے کٹوروں میں

میں جام جم سے کیا اندازہ قسمت نکالوں گا
نظر جب آ رہا ہے اپنا مستقبل کٹوروں میں

عجب احمق ہیں جو ترچھی نگہ کو کہتے ہیں احول
لکھیں گے نام ان کا ہم بھی اب کانوں میں کوروں میں

ہوا ورد زبان ہے نام حق جس دن سے اب یوسف
ہے تسبیح مرصع اپنی ہر انگلی کے پوروں میں

حوالہ جات

پوپلزئی، سردار محمد یوسف "قندیک خیال" دہلی، ۱۹۱۶ء

کوثر، ڈاکٹر انعام الحق "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۶ء

سردار گل محمد خان زیب مگسی

ولادت ۱۸۸۴ء (۱۳۰۱ھ) وفات ۱۹۵۳ء (۱۳۷۲ھ)

بلوچستان میں اردو شاعری کی تاریخ کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکتی جب تک زیب مگسی کا نام نامی اس میں شامل نہ ہو۔ آپ بلوچستان کی تاریخ کے ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب انگریز بلوچستان پر قابض ہو چکے تھے، اور اردو زبان نے فارسی کی بالادستی ختم کرنے کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ صدیوں سے مروج لسانی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی حالات تغیر کا شکار تھے اور سرکار و دربار کی زبان بدل رہی تھی۔ سرکاری سطح پر اردو اور انگریزی کی پذیرائی نے فارسی اور عربی کی اہمیت اور افادیت کو کم کرنا شروع کر دیا تھا اور فارسی جو بلوچستان میں صدیوں سے سرکار و دربار میں تخت نشیں تھی، خانہ نشین ہو رہی تھی۔ دہلی سے ملتان اور ملتان سے حیدر آباد سندھ تک اردو کی حکمرانی پھیل چکی تھی اور مسلمانان ہند اسے قبول کرکے پھیلا رہے تھے۔

سیاسی طور پر بلوچستان اس وقت انگریزوں کی حاکمیت قائم ہو چکی تھی اور خان آف قلات عملاً" اپنے وزیراعظم کے تابع برائے نام حکمران تھا جبکہ وزیراعظم قلات کا تقرر انگریز حکام کی مرضی سے ہوتا جو ملک کے سیاہ و سفید کا مالک ہوا کرتا تھا، سرداران قبیلہ آپس کی رنجشوں اور لڑائیوں کی وجہ سے منتشر تھے اور کسی مرکزی حکومت اور مرکزی قیادت کے نہ ہونے کی وجہ سے انگریز نہ صرف بلوچستان پر عملاً" قابض تھے بلکہ افغانستان اور کاکڑستان کے بہت سے حصوں پر بھی قبضہ کر چکے تھے، قلات کی مرکزی حیثیت کو ختم کرکے کوئٹہ کو برٹش بلوچستان کا مرکز بنا دیا گیا تھا اور انگریز فوجی چھاؤنیاں بن چکیں تھیں۔

زیب مگسی، بلوچستان کے معروف بلوچ قبیلہ مگسی کے تمندار نواب قیصر خان مگسی کے یہاں ۱۳، رمضان المبارک ۱۳۰۱ھ بمطابق ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار اپنے قبیلے کے سردار تھے انہوں نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی

اور اپنے دور کے جید علماء کرام اور قابل اساتذہ سے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائی۔ نواب گل محمد خان اپنے والد کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم روایتی انداز سے شروع ہوئی اور عربی، فارسی، حدیث و فقہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ نے اردو کی تعلیم بھی گھر پر ہی حاصل کی۔

۱۹۲۲ء میں نواب قیصر خان مگسی کو تمنداری سے معزول کرکے سردار گل محمد خان زیب مگسی کو قبیلے کا تمندار مقرر کیا گیا، زیب مگسی صوم و صلوۃ کے پابند، مرنجان مرنج، درویش صفت، مہذب و خلیق، اور ایک مہربان و مشفق سردار تھے، انگریز اور اس کے پٹھو ان سے خوش نہیں رہ سکتے تھے، انہوں نے ایک جعلی خط کے ذریعے زیب کو تمنداری سے برطرف کیا تو مگسی قبیلے کے لوگوں میں بے چینی پھیل گئی اور انہوں نے سندھ کی طرف ہجرت کرنا شروع کر دیا۔ بلوچستان کے نامور فرزند اور زیب مگسی کے چھوٹے بھائی نواب یوسف عزیز مگسی کو جیل بھیج دیا گیا اور بعد میں ۱۹۳۳ء میں نواب یوسف عزیز مگسی کو قبیلے کا تمندار بنا دیا گیا۔ سردار گل محمد خان زیب مگسی جھل مگسی سے علیحدگی کے بعد شداد کوٹ، ضلع لاڑکانہ چلے گئے جہاں ۱۹۵۳ء میں ان کا انتقال ہوا۔ آپ کی میت کو جھل مگسی لے جا کر سپرد خاک کیا گیا جہاں آپ کا ایک شاندار مقبرہ تعمیر کرایا گیا۔

زیب مگسی بالعموم بلوچستان کے فارسی شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں اور ۱۹۳۱ء میں نو کشور لکھنؤ سے آپ کا پہلا فارسی کلام "پنج گلدستہ زیب" کے نام سے شائع ہوا۔ جبکہ دوسری کتاب "خزینۃ الاشعار" ۱۹۳۶ء میں نو کشور لکھنؤ سے ہی شائع ہوئی۔ لیکن زیب مگسی شاعر ہفت زبان تھے، فارسی کے علاوہ سندھی، پنجابی، سرائیکی، ہندی، بلوچی، عربی اور اردو میں ان کے ہزاروں اشعار محفوظ ہیں۔ زیب مگسی کی شاعری کا سفر فارسی سے اردو کی طرف ہے، بلوچستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد جن سیاسی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کا آغاز اس خطے میں ہوا اور یہاں کی زبانوں اور ادبی روایات پر جو نئے نقش ابھرے اس کی تصویر ہمیں زیب کے کلام میں ملتی ہے۔ زیب مگسی نہ صرف فارسی کے عظیم شعراء کے کلام سے آگاہ تھے بلکہ وہ اپنے دور کے تمام اردو شعراء کے کلام پر بھی نظر رکھتے تھے،

انہوں نے فارسی اور اردو کے تقریباً تمام اہم شعراء کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ بلوچستان جیسے دور افتادہ مقام پر رہنے کے باوجود اردو شاعری پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔

زیب مگسی کے مکمل کلام کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن مختلف زبانوں میں ان کے اشعار کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ پروفیسر شرافت عباس "زیب نامہ" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "میر گل محمد خان مگسی نہ صرف صاحب طرز، صاحب دیوان، قادر الکلام اور کثیر اللسان شاعر تھے بلکہ نہایت بسیار گو۔ فارسی، عربی، ہندی، اردو، سندھی، پنجابی، سرائیکی وغیرہ میں ان کے اشعار کی صحیح تعداد کا تخمینہ نہیں لگایا جا سکا ہے تاہم زیب کے اب تک مطبوعہ اور معلومہ کلام کی تفصیل اس طرح ہے"
۱۔ پنج گلدستہ زیب، مطبوعہ نو کشور لکھنؤ ۱۹۳۱ء ۲۔ خزینۃ الاشعار یعنی مخمسات زیب مطبوعہ نو کشور لکھنؤ ۱۹۳۶ء، ۳۔ ارمغان عاشقان غیر مطبوعہ جو ۱۹۳۸ء میں مکمل ہوا،
ان کے علاوہ خزینۃ الاشعار کے تتمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیب کے مخمسات کا ایک اور مجموعہ بھی ہے کیونکہ خزینۃ الاشعار کے آخر میں کاتب شیر خان نے اسے مخمسات فارسی جلد اول کے نام سے یاد کیا ہے اور دوسرے مجموعہ مخمسات کی اطلاع ان لفظوں میں دی ہے، "بدانکہ مصنف علام در جلد دوم مخمسات اعلی غزلہائے چیدہ اساتذہ سلف علاوہ غزلہائے مندرجہ کتاب ہا تصنیف کردہ، مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید"
علاوہ ازیں حال ہی میں آغا نصیر خان احمد زئی نے راقم کو زیب کا جو غیر مطبوعہ کلام عنایت کیا ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ ۱۔ اشعار بزبان سندھی ۱۵۰۰ یعنی ۱۷۶ کافیاں ۲۔ اشعار بزبان عربی ۳۱۴ مع قصائد و غزلیات ۳۔ اشعار بزبان پنجابی و سرائیکی ۲۵۰ بطرز کافی، ۴۔ اشعار بزبان ہندی ۵۸ بطرز کافی، اس کلام میں فارسی کی چند ایسی غزلیں بھی ہیں جو زیب کے مذکورہ مطبوعہ دواوین میں شامل نہیں تاہم ان کی تعداد صرف چھ ہے اور اشعار ۵۷۔ (مقدمہ زیب نامہ، ۱۹۹۵ء، ۸-۹)
ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی کتاب "بلوچستان میں فارسی شاعری" میں زیب مگسی

کے ایک خطی دیوان "ارمغان عاشقان" کا ذکر بھی کیا ہے جو تین سو چھیالس (۳۴۶) اوراق پر مشتمل ہے۔ جس میں ایک ہزار چوہتر (۱۰۷۴) غزلوں کے علاوہ مخمسات، مخزن الصنائع، واسوخت، ترجیع بند، مستزاد، مثلث، مسدس، رباعیات اور فردیات ہیں۔ "ارمغان عاشقان" میں گیارہ ہزار اشعار ہیں جو ۱۹۳۸ء میں مکمل ہوا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر "ارمغان عاشقان" کو زیب مگسی کا شاہکار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " زیب مگسی کا یہ شاہکار اسم با مسمّی ہے اس میں محبوب کا سراپا عام ہے وقوع گوئی اور معاملہ بندی کے تذکرے ہیں، اشعار میں مختلف کتابوں کا ذکر اور متعدد حدیثوں کا بر محل استعمال اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ زیب کا علم خاصا عمیق تھا، وہ زندگی کے مسائل پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور قوت عمل بیدار کرنے کی سعی بھی فرماتے ہیں"۔ (کوثر، ۱۹۶۸ء، ۲۶۲)

جب زیب مگسی کے پوتے نواب ذوالفقار علی خان مگسی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے تو ان کی فرمائش پر "زیب نامہ" اور "خزینۃ الاشعار" کو دوبارہ شائع کرایا گیا۔ بڑے بھائی کی تقلید میں نواب زادہ نادر علی خان نے انتہائی خاموشی سے اس سے بھی بڑا کارنامہ انجام دیا اور وہ نواب زیب مگسی کے اردو دیوان کی اشاعت ہے جو زیب مگسی کے اپنے خط میں ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ کا یہ گرانقدر سرمایہ من و عن ہم تک اس خاموشی سے پہنچ جائیگا یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ بلوچستان میں اردو زبان اور شاعری کی تاریخ نامکمل اور ادھوری رہتی اگر زیب کا اردو کلام منظر عام پر نہ آتا۔

زیب کے اردو دیوان کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں دو سو چوراسی (۲۸۴) غزلیں ہیں جبکہ دوسرے حصے میں چھیالیس غزلیں ہیں جس کا نام "رونق اردو" ہے۔ زیب مگسی کے مطبوعہ اردو کلام کے علاوہ چالیس صفحات پر مشتمل مخمسات بھی ہیں جن کی اطلاع اختر بلوچ کی کتاب "بلوچستان کی نامور شخصیات" میں ملتی ہے، اختر بلوچ کے مطابق "سردار میر گل محمد خان زیب مگسی کا ایک قلمی اردو دیوان بھی دستیاب ہوا ہے جس کے کل چالیس (۴۰) صفحات ہیں۔ اس میں مخمسات ہی مخمسات ہیں، جن شعراء کے اشعار پر مخمسات لکھے ہیں ان میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر، مرزا رفیع سودا، خواجہ میر درد، مومن خان مومن،

مولانا نیاز احمد بریلوی، غالب، ذوق، تراب کاکوروی، خواجہ حیدر علی آتش، داغ، حالی، سوز وغیرہ ہیں

"زیب مگسی جس شاعر کی غزل پر مخمس کہتے ہیں عنوان میں اس کا سن وفات بھی درج کر دیتے ہیں۔ اس قلمی نسخے میں مخمسات حروف تہجی کے اعتبار سے قلمبند کئے گئے ہیں۔" (کوثر، ۱۹۸۶ء، ۳۸۸)

حالی

اگرچہ کہ رکھتے ہو طاقت زیادہ
مگر مت کرو عیش و عشرت زیادہ
میانہ روش میں ہے راحت زیادہ
بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ
مبادہ کہ ہو جائے نفرت زیادہ

بہادر شاہ ظفر

زیبا فنا پذیر ہے ہر چیز و ہر بشر
یکساں ہیں حادثات سے خورشید اور قمر
وہ ایک ہے قدیم جسے کچھ نہیں خطر
کیا پائے کہنہ ذات کو اس کے کوئی ظفر
واں عقل کا نہ دخل، نہ کوئی دلیل کا

زیب مگسی کے اردو کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے فارسی، عربی اور سندھی کے ساتھ اردو کلاسیکی ادب کا مطالعہ کیا تھا، وہ ایک معزول بادشاہ کی طرح اقتدار سے تو دور رہے لیکن اپنے خیالات کو اشعار کی صورت بیان کرتے رہے، ان کے اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ انہوں نے سیاست کی بجائے اپنے لیے علم و ادب کا میدان چن لیا تھا۔

امیروں اور وزیروں سے تجھے کیا کام ہے زیبا
طلب کر آشنائے شعر و انشاء کوئی اپنا سا

علم افراز ہوں میدان انشاء و بلاغت میں
رہیگا بعد مرنے کے بھی یوں بالا علم میرا

گو لذت حیات میسر نہیں تجھے — پر زیب شعر ہونگے ترے جاوداں لذیذ
پڑھنے والوں کو لطف آتا ہے — زیب کی نظم میں ہے گویا کھانڈ

عربی اور فارسی زبانوں پر قدرت کامل رکھنے کے باوجود زیب کی اردو غزلیں زبان و بیان کے حوالے سے انتہائی صاف ہیں اور ان کی اردو میں فارسی کی ایسی آمیزش نہیں جس سے اردو کا رنگ پھیکا پڑے۔ زیب کے کلام کے مطالعے سے ان کے ذخیرہ الفاظ کی وسعت اور عربی، فارسی اور اردو کے گہرے مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے، زیب کے یہاں قرآنی، روایتی عشقیہ اور فارسی تلمیحات کی فراوانی ہے، اور وہ ان تلمیحات کے ذریعے سینکڑوں کہانیاں جن میں پند و نصیحت، عبرت اور حقائق اور نتائج ہیں اشعار میں سناتے ہیں۔ زیب مگسی کے کلام میں جو تلمیحات عام طور پر استعمال ہوئی ہیں ان میں آدم ثانی، ابن ادھم، کلیم، طور، خضر، سکندر، دارا، محمود، ایاز، تخت طاؤس، قیس، لیلی، مجنوں، کوہکن، شیخ صنعان، یوسف، زلیخا، برادران یوسف، حسین، مسلم بن عقیل، نوشیروان اور ہرمز، فیلقوس، جیلخانہ روم، انوری، حور و غلمان، قصر شیریں، بہمن، درانی، فردوسی و فغانی، رستم زابل، حر، کربلا، کوفی، آب حیواں، فرعون، قیس، شاہجہاں، لقمان، قاروں، آدم، سامری، کلیم اللہ، یوسف، خضر، مسیح، وامق، منصور، دلدل، چشمہ زلال، کنعان، جشن جمشید، عقل جالینوس، بوعلی سینا، ہوشنگ، ابن سینا، ساغر کوثر، بیضہ سیمرغ، صاحبقراں، طوطی تاجر، تصور برہمن، کوہ بیستون، تیغ مہدی، دارا، شعلہ طور، خسرو، حلاج، عیسی، عنقا، دارا، حوا، ہابیل، خیرالبشر، زلیخا، جاہ کیانی، ایلچی روم، نوشابہ، ارسطو، اسماعیل، ابراہیم ادھم، پرویز ایرانی، محمود خراسانی، خاقانی، شیخ الرئیس (ابن سینا)، چنگیز، نادر شاہ، معراج، قلندر، افلاطون، ہما، شاہ غزنی، حضرت دانیال، چاہ کنعان، ابن سعد، بلال، پیر خرقان، کاؤس، قطب دہلوی، ضحاک، فریدوں، قنبر، جعفر، مانی

چین، تخت سلیمان، سگ اصحاب کہف، کوہ نور، شبلی، روئین دژ، عزازئیل، ابن سلام، ابن مریم، رابعہ بصری، عاد، آصف، عزیز مصر، مسلم بن عقیل، ہمایوں، نظام سقہ، وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ بلوچستان میں اردو شاعری میں زیب مگسی کی طرح ذخیرہ الفاظ اور تلمیحات کا استعمال شاید ہی کوئی دوسرا شاعر کر سکا ہو، وہ اس میدان میں یکا و تنہا اور منفرد ہیں۔ تلمیحات کے علاوہ تصوف کی اصطلاحیں، پند و نصائح اور اخلاقی موضوعات بھی زیب کے کلام میں کثرت سے ہیں۔

زیب کی غزلوں میں مضامین کی رنگا رنگی ہے وہ اپنی غزلوں میں معشوق کی زلفوں کی تعریف بھی کرتے ہیں اور برادران یوسف کا حوالہ بھی دیتے ہیں، ہجر و فراق کی باتیں بھی کرتے ہیں اور وصل کے لمحوں کی کہانی بھی سناتے ہیں، وہ شیخ اور ملا پر طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں اور اہل طریقت کے فقرا کے طریقہ کار کو بھی اشعار میں باندھتے ہیں۔ کہیں پیغمبروں کی مثال دے کر قرآن کی تفسیر کرتے ہیں تو کہیں اپنے تجربات کے حوالے سے فرنگیوں کی خصوصیات بتاتے ہیں، کہیں واقعہ کربلا کا ذکر کرتے ہیں تو کہیں حیدر کرار کی شان میں رطب اللسان ہیں۔ وہ عشق حقیقی اور عشق مجازی کے اشعار بھی کہتے ہیں اور فقہی تشریحات کو بھی اپنے شعروں کا موضوع بناتے ہیں وہ نجوم کا حوالہ بھی دیتے ہیں اور شرعی احکامات کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

تلمیحات کے ساتھ ساتھ ضرب الامثال کا استعمال زیب کے اشعار میں جا بجا نظر آتا ہے۔ زیب عموماً" مصرعہ اول میں کوئی اصول، نظریہ یا بیان دیتے ہیں اور مصرعہ ثانی میں دلیل کے طور پر کوئی مثال، تاریخی حقیقت یا اصول پیش کرتے ہیں۔ جسے دعوی دلیل دعوی کہا جاتا ہے۔ اکثر غزلوں کے اشعار مکالمے کی صورت میں ہیں۔

نظامی گنجوی سے مثنوی میں ہمسری کرنا
نہیں آساں کہ یہ لشکر کشی کرنا ہے ایراں پر

ہو اگر خواری سے خالی اہل دولت کی پناہ
سبزہ کیوں پامال ہو زیر درخت سایہ دار

عشق میں شہرت ہے یکساں، عاشق و معشوق کو
مشتہر محمود کے مانند ہے ہر جا ایاز

اخبار کی خبریں نہ سنا مجھ کو میاں جی
معشوق کی جانب سے کوئی بات سنا خاص

اس قدر غالب ہے اپنے دل پہ آتش عشق کی
دیکھ کر انشا کو میرے درد سے روتا ہے داغ

دوست گرچہ بے ہنر ہو بھی معاون ہے ترا
ہے ڈراتی خصم کو ہر چند خالی ہو تفنگ

پھنس گیا ہے زیب کا دل موئی ترسا زادہ میں
ہو نہ یارب کوئی مومن بندی قید فرنگ

جاہ و ذلت دونوں یکساں بے بقا ہیں زیر چرخ
ہر کمالے را زوالے، ہر زوالے را کمال

عورتوں کو ریش پیدا ہو ملے تب کوئی مرد
اب تو ہے اے زیب اس آفاق میں قحط الرجال

عہد طفلی میں ہی دے اطفال کو اپنے ادب
مونچھ کے بالوں کو اپنے بڑھنے سے پہلے سنبھال

اشارت ہائے ابرو فاش ہیں صورت پرستوں پر
سمجھنا فارسی کا ہے کہاں دشوار ایراں میں

ایجاد حکمتوں کے ہیں عشاق کے لیے
پہنچوں گا تیرے پاس ہوائی جہاز میں

مسافر ہو نہ جب تک شعر کو گھر میں نہیں وقعت
جواہر کی نہیں کچھ قدر و قیمت کنج معدن میں

قصائد میں غزل میں مثنوی میں نثر رنگیں میں
طفیل عشق مولا زیب تم مولا ہو ہر فن میں

وارثان تخت مرگ باپ پر ہوتے ہیں شاد
کیسی لذت ہے خدا جانے زلال جاہ میں

منصب باقی کو لازم ہے مصیبت دوستو
دیکھو سید کربلا میں، دیکھو یوسف چاہ میں

لخت دل آتے ہیں اشکوں کے عوض آنکھوں سے اب
گل بروں آتی ہے جب ہو آب کم، تالاب میں

انقلاب دہر میں ڈرتے ہیں. اکثر مالدار
کشتی پر بار کو تشویش ہے گرداب میں

جانتی ہے رابعہ بصری، حسن بصری کا راز
مرد و زن یکساں ہیں محرم، فقر کی درگاہ میں

نکلتا ہے وہی چمچے سے جو ہو دیگ کے اندر
زباں پر وہ ہی آ جاتا ہے جو اے زیب ہو دل میں

زیب کے اشعار میں رندی و سرمستی، عشق و عاشقی، محبوب کے خد و خال کے علاوہ تصوف کی چاشنی، فقہی مسائل اور شرعی حوالے بھی ہیں اور ضرب الامثال کی فراوانی بھی۔ وہ مسلکی مسائل پر بھی شعر کہتے ہیں اور فقہی اختلافات پر بھی ان کی نظر ہے، وہ زمانے سے نالاں بھی ہیں لیکن ان کے اشعار کے مطالعے سے یہ واضح ہے کہ وہ صلح کل، رند بے خوار اور زندگی سے لطف اٹھانے والے تھے۔ ان کے یہاں مایوسی، درد کی شدت، یا ناامیدی نہیں بلکہ وہ دنیا کو انتہائی معروضی طریقے سے دیکھنے والے تھے۔ تاریخ، مذہب، فلسفہ اور ادب پر زیب کی نظر انتہائی گہری ہے وہ مثالوں سے دلیل دے کر اپنی بات کو باوزن بناتے ہیں۔ زیب زندگی کی تلخیوں سے خوفزدہ اور خائف نہیں ہوتے وہ غموں کے

علاج سے واقف ہیں اور جینے کا ہنر جانتے ہیں ان کے اشعار میں رجائیت اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کی بھرپور جھلک نظر آتی ہے۔

غالب اور دیگر استادان فن کی زمینوں میں ان کے اشعار پڑھنے سے بلوچستان اور ہندوستان میں اردو کی ابتدائی شکل اور لسانی مزاج کا تقابلی مطالعہ بھی دلچسپ ہے۔

انتخاب کلام

چاہتے ہو کشف تو حافظ رہو اسرار پر
پالتے ہو عشق تو صابر رہو آزار پر
عیب بینی سے کرو بند آنکھیں مانند مسیح
پھر لگاؤ کان اپنے غیب کی گفتار پر
اقتلوا الاسود سنایا سرور کونین نے
رحم پیغمبر کو بھی آتا نہیں خونخوار پر
سر کشوں سے تند خوئی ہے نگہبان سرور
گل کی نسبت خار موزوں تر سمجھ دیوار پر
کر جلیس خصم سے پرہیز ہو وہ گر خسیس
اس مگس سے حذر کر بیٹھے جو زخم مار پر
سادہ لوحی سے ہے یہ انکار اس کا کیا کروں
ہنسی آتی ہے نہ غیرت، طفل کے اصرار پر
جیفہ ء دنیا پہ جو کتے نہیں، وہ کیا لڑیں
اے برادر لڑتے ہیں مردار ہی مردار پر
جن کو ہے پیمانہ عشق حقیقی سے خمار
چھینکتے ہیں ہتک خم پر، خمر پر، خمار پر

ابر کی تاریکی میں رہ ڈھونڈھتے ہیں برق سے
معصیت میں بھی نظر رکھ حیدر کرار پر
زیب جو سیدھے نہیں، ان سے یہی کرنا سلوک
پڑتا ہے آہستہ، چلنا راہ ناہموار پر

غصہ کش ہو نہ محبت کے گنہگاروں میں
شعلہ مت پھینکنا باروت کے انباروں میں
دردمندوں میں ہوں اور درد ہے دل کو منظور
نہ گروہ فقرا میں ہوں نہ دینداروں میں
زاہد خشک کی شدت پہ تعجب کیا ہو
حشم تو بیش ہوا کرتی ہے بیماروں میں
صدر اعزاز پہ رہتے تھے غنی مثل ایاز
عقل ہوتی تھی اگر آج کے دلداروں میں
جو ہیں آگاہ طریقت وہی رکھتے ہیں نگار
شمع کا ہونا تو لازم ہوا بیداروں میں
ذم رندوں کی نہ کر شیخ کہ اوصاف جمیل
حلم و ایثار و وفا سب ہیں قدح خواروں میں
فقر خود شکنی ہے گر فقر ہے دشمن شکنی
یہ کرامت تو ہے موجود جہانداروں میں
اہل ہمت ہی گرفتار بلا ہوتے ہیں
شیر زنجیر میں ہیں کتے ہیں بازاروں میں
حسن کامل کے تصرف کا تماشا دیکھو

گھر ہے وہ پردہ نشیں شور ہے بازاروں میں
تیغ ابرو پہ ہو کیا مائل زن سیرت شیخ
مرد ہی دیکھتے ہیں چہرے کو تلواروں میں
در خیبر پہ چلے جبکہ علی لے کے علم
عید تھی جام شہادت کے طلبگاروں میں
اس کی دھن میں ہی رہا گرچہ رہا ہوں اکثر
زیب جلسوں میں گلستانوں میں درباروں میں

ہو عامل ایسا کہ لکھ دے وہ خوبتر تعویذ
صنم ملے جو میں جاؤں گلے میں کر تعویذ
بڑھاتے ہیں بخدا بت حسن کی رونق
یہ جو لٹکتے ہیں جاناں کو تا کمر تعویذ
لگے مبادا نظر تجھ کو بد نگاہوں کی
گلے میں ڈالو بدفع شر نظر تعویذ
نہ سحر چلتا ہے اس پر، نہ ورد نے جادو
نہ اس کے قلب پہ کرتا ہے کچھ اثر تعویذ
عجوبہ ہے کہ وہ تعویذ کا بھی منکر ہے
اگرچہ مانتے ہیں جن اور بشر تعویذ
اگر یقین ہو وہ سیم بر کرے گا پیار
لکھاؤں اہل عمل سے بہ آب زر تعویذ
وصال کے لیے تعویذ لیتے ہیں عشاق
ہیں لیتے اہل حکومت پئے ظفر تعویذ

ہمیشہ ہوتا ہے بالا رقیب کا اقبال
دیا ہے خضر نے لکھ کر اسے مگر تعویذ
سفر میں بلکہ حضر میں بھی حرز بن نہ رہو
بلا کے حملے سے کرتا ہے بے خطر تعویذ
برائے حاصل مقصد قلم چلاتے رہو
کہ زیب آخرش ہوویں گے کارگر تعویذ

گھلتا جاتا ہے یہ تن از غم جاں آپ سے آپ
جوں پگھل بنتی ہے برف آب رواں آپ سے آپ
جس جگہ صبر کی منزل ہے کہا ملہم نے
ظفر آئیگا وہاں موج زناں آپ سے آپ
زر سے جب کچھ نہ بنا صبر کرو اے تن پرو
نرم ہو جائے گا وہ ترک جواں آپ سے آپ
کنج تنہائی میں مونس نہیں اپنا کوئی
کر رہے ہیں شب فرقت میں بیاں آپ سے آپ
جھکتے ہیں در پہ مرے خود بخود آ کر احرار
جیسا کعبے کو جھکا چل دمان آپ سے آپ
کون کر سکتا ہے اے زیب علاج تپ عشق
دفع ہو جاتا ہے یہ مرض گراں آپ سے آپ

ہوا نہ شاد دل اپنا کسی ٹھکانے میں
ابھی تو بیٹھتے ہیں جا کر شراب خانے میں

کمان و تیر فلک کے ہوئے مبارک گو
نکالا تیر جو اس ترک نے نشانے میں
نکال کر کروں تعویذ اس کو گردن کا
الجھ گیا ہو ترا مو کوئی جو شانے میں
گیا جو در پہ صنم کے تو وہ تھے واصل غیر
مگر کہا مجھے مصروف ہوں نہانے میں
تپش فراق کی یونہی اگر رہی غالب
تو پھر نہ سمجھو کوئی دیر جاں کے جانے میں
نہ کرتے رقص بر آواز تار اہل اللہ
نہ حظ روحی، گر اے شیخ ہوتا گانے میں
تلاش بیضہ سیمرغ کی کرو لیکن
وفا کا نام نہ لو زیب اس زمانے میں

مت ہلاؤ بحث مذہب کا کسی جا سلسلہ
ایسے جھگڑوں کا قیامت تک نہ ہو گا فیصلہ
منقبت گوئی مقدم ہے ثنائے شاہ سے
فرض پڑھنا ہے ضروری گو قضا ہو نافلہ
موت ہے ہر زہر پینا ہاں مگر زہر غضب
ہر گنہ رکھتا ہے لذت ہاں مگر جرم گلہ
بھیجنے میں بوئے پیراہن کے تجھ کو حرج کیا
لیک طالع پر ہے میرے بند راہ قافلہ
اس دل بدنام سے مت پوچھ دانش کی صلاح

اس دل بدنام سے مت پوچھ دانش کی صلاح
پوچھتا ہے کون میخواروں سے شرعی مسئلہ
یہ بھی رحمت ہے کہ پوچھے جائیں گے محشر میں جرم
خشم کم ہو جاتی ہے پڑ جاتا ہے جب فاصلہ

حال دل کا قید غم میں جا کے زندانی سے پوچھ
جاں پہ میری جو جفا ہے خود مرے جانی سے پوچھ
جاہ بے لذت ہے بن شیریں لبوں کے اے وزیر
گر نہیں باور تجھے پرویز ایرانی سے پوچھ
عشق سے ہی ہوتا ہے عاجز حکومت کا دماغ
اس بلا کا زور محمود خراسانی سے پوچھ
خون کے آنسو رلاتا ہے بزرگوں کو فراق
ہجر ظالم کا ستم یعقوب کنعانی سے پوچھ
مردم آبی ہوا حیراں مرے اشکوں کو دیکھ
موج اس طوفاں کی میرے آدم ثانی سے پوچھ
ٹھہر جاتی تھی قلم تصویر کش کے ہاتھ میں
اپنے جلوے کی کرامت جان من مانی سے پوچھ
سود کی امید پر ہندو بھی دیتا ہے ہزار
بے غرض دینے کا نشہ ابر نیسانی سے پوچھ
ماسٹر صاحب کہاں سمجھیں حلاوت شعر کی
اس شکر کا ذائقہ سعدی و خاقانی سے پوچھ
تیغ آہ زیب کی برش سے ہے واقف رقیب

جنگ رستم کی خبر جا طوس تورانی سے پوچھ

یاعلی کب جاوے تیرا عشق اس دل گیر سے
عشق میں ہوں عشق، کب جاوے سفیدی شیر سے
تو وہ ہے محبوب ذات حق کہ سبقت لے چلے
تیر آہ عاشقانت ناوک تقدیر سے
تخت طاؤسی عالمگیر پر رعشہ گرے
گر چلاوں ذکر تیری تیغ عالمگیر سے
قوس کو تیری کماں کے سامنے ہے صد سجود
صید خستہ ہے اسد تیری نظر کے تیر سے
مانگتا ہے علم تیرے سے عطارد روشنی
باکمال عاجزی جس طرح طالب پیر سے
آب حیواں سے بھی شیریں تر ہے تیری منقبت
عشق نافع تر ہے تیرا نسخہ اکسیر سے
ہند میں آ کر اذاں دے گر ترا قنبر غلام
بت بھی سجدے میں گریں اک نعرہ تکبیر سے
گر پڑوں قید مقلد میں بھی شیعہ ہو رہوں
یاعلی آواز نکلے حلقہ زنجیر سے
نام حیدر ورد کر زیبا کہ حیدر کی ثنا
ہے بروں باللہ حد تقریر اور تحریر سے

حوالہ جات

شرافت عباس، "مقدمہ زیب نامہ" انجمن فارسی بلوچستان، کوئٹہ ۱۹۹۵ء
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۶ء
بلوچ، اختر علی خان، "بلوچستان کی نامور شخصیات" رائل بک کمپنی کراچی ۱۹۹۸ء
زیب، نواب گل محمد خان نگسی، قلمی نسخہ
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، "بلوچستان میں فارسی شاعری" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ۱۹۶۸ء

عابد شاہ عابد

ولادت ۱۸۸۸ء وفات ۱۹۴۹ء

کوئٹہ کے مغرب میں کوہ چلتن کے دامن میں سر سبز و شاداب ایک چھوٹی سی بستی ہے جس میں صدیوں سے تقوی سادات آباد ہیں۔ یہ چھوٹا سا گاؤں جو اب کوئٹہ شہر کا حصہ بن چکا ہے "کلی کرانی" کہلاتا ہے اور یہاں کے رہنے والے سید "سادات کرانی" کہلاتے ہیں اور ان کی زبان قدیم فارسی کی ایک شکل ہے جو دہواری کہلاتی ہے۔ اپنے سیب' آڑو اور انگوروں کے باغات کیوجہ سے بھی یہ گاؤں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔

عابد شاہ عابد کلی کرانی میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے' آپ کے والد بزرگوار سید کریم بخش ایک نہایت نیک اور خدا پرست شخص تھے' آپ کی پیدائش سے تقریباً دس سال پہلے انگریز کوئٹہ پر قبضہ کر چکے تھے اور قدیم مدارس کی بجائے اردو اسکولوں کی بنیاد پڑ چکی تھی' آپ نے ابتدائی رسمی تعلیم کلی کرانی میں ہی حاصل کی جہاں عربی' فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی جس کے بعد آپ نے اردو کی تعلیم بھی حاصل کی۔

اس زمانے میں حکومت کی نوکری کو اعلی سماجی حیثیت کی علامت سمجھا جاتا اور انگریز معزز خاندانوں کے افراد کو سرکاری ملازمتیں دے کر کئی مقاصد حاصل کیا کرتے تھے' چنانچہ پہلے پہل آپ محکمہ پولیس میں سارجنٹ کی حیثیت سے بھرتی ہوئے لیکن بعد میں محکمہ مال میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور ترقی کرکے تحصیلدار بنے۔ اس زمانے میں کسی مقامی شخص کے لیے یہ ایک بہت بڑا عہدہ تصور کیا جاتا تھا۔

بنیادی طور پر عابد شاہ فارسی کے شاعر تھے' لیکن اردو کی اہمیت و حیثیت کا اندازہ لگاتے ہوئے آپ نے اردو میں بھی شعر کہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز بلوچستان میں اردو کو اپنے مقاصد کے لیے فروغ دے رہے تھے۔ سرکاری ملازمین حکومتی مقاصد کے حصول میں اپنا کردار ادا کرتے تھے' سردار یوسف خان پوپلزئی کی طرح سرکاری سرپرستی میں اردو کے

فروغ میں عابد شاہ عابد نے بھی بنیادی کردار ادا کیا۔

اردو اور فارسی کے علاوہ آپ براہوئی میں بھی شعر کہتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام "گلزار عابد" کے نام سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا۔ جس میں اردو کے پونے تین سو اشعار سمیت تقریباً سات سو اشعار ہیں۔

اڑاتا خاک سر پر جھومتا مستانہ آتا ہے
ہزاروں انگلیاں اٹھتی ہیں وہ دیوانہ آتا ہے
نہیں معلوم غصے میں وہ کیوں تیور بدلتے ہیں
مگر دل میں خیال یوسف دیوانہ آتا ہے
بدل کر تیوری رنگیں لب نازک سے یہ بولے
مگر وہ محتسب از جانب خم خانہ آتا ہے
بگڑ کر طبع نازک سخت تندی سے یہ بول اٹھی
کہ عابد بھی ز سوئے خانہ ء میخانہ آتا ہے
پکڑ کر دست عابد کو نکال اس جا سے اے یوسف
کہ قاضی بہر زجرش تند خو مستانہ آتا ہے

خون کر ڈالا ہے ظالم، عاشق ناشاد کا
ہاتھ خونی ہے گواہ اس بانی بیداد کا
لاکھ دیکھی بے قراری عاشق بے چین کی
رحم شیوہ ہی نہیں اس خوگر بیداد کا
ابروئے جاناں نہ دیکھی ہو تو جا کر دیکھ لو
نقش ثانی ہے بلا شک خنجر جلاد کا
شوخ چشمی تا بکے جاناں، جلانا چھوڑ دے

ڈالنا اچھا نہیں ہے ظلم کی بنیاد کا
آرزوئیں پیٹتی روتی ہیں یا رب العباد
خون قاتل نے کیا ہے کس دل ناشاد کا
سر جھکائے منتظر بیٹھے ہیں اپنے قتل کے
ہاتھ کیوں ہم پر نہ پھر پورا پڑے جلاد کا
ہاتھ جوڑے سو طرح منت سماجت کی مگر
رحم کیوں آتا کہ وہ شاگرد ہے شداد کا
دل نہیں قابو میں عابد نالہ پر درد سے
خون قاتل نے کیا ہے کس دل ناشاد کا

نہیں ایزد کوئی ثانی ترا، سارے زمانے میں
تو ہے بے مثل و واحد لاشریک اس کارخانے میں
ثمر اشجار میں دیکھو ہیں رنگا رنگ بستاں کے
ہویدا ہے تری قدرت غرض سب دانے دانے میں
ہزاروں بلبل و طوطی و قمری کو جو میں دیکھا
ثنا و حمد میں تیرے تڑپتا آشیانے میں
تو وہ قادر ہے جو مٹی کو طاقت کیمیا بخشے
رکھا ہے زندگی تم نے ہمارا آب و دانے میں
ہوئے مسرور بے خود سب سنی تعریف قدرت کی
عجب دیکھا ہوں میں تاثیر عابد کے ترانے میں

دل بیتاب ذرا ٹھہر، نہ کر آہ و فغاں

سن کے گھبرائے نہ وہ حور وش و رشک قمر
جا تو دروازے پہ ہے کون' وہ گھبرا کر بولے
شکل کو میری سیہ دیکھ کے مثل اخگر
رخ زیبا دو سیہ چشم کی سوگند تجھے
خستہ حالی کو مری دیکھ کے اب رحم تو کر
لطف سے یار نے امشب کو بلایا ہے تجھے
عابد خستہ جگر' شاد ہو اب نوحہ نہ کر

یہ فلک کیا کیا ستم ایجاد کرتا ہے سدا
موسم گل میں کیا پھر یار سے ہم کو جدا
مست و سودائی و مجنوں' جنگلوں میں دشت میں
اس بت بیداد سے کب تک رہوں گا میں جدا!
تیغ ابرو' خنجر مژگاں سے دل کو چیر کر
نیم لبسل کر دیا ہے یار با ناز و ادا
صدمہ داغ جدائی' اب سہا جاتا نہیں
وصل جاناں ہو میسر' جلد اے میرے خدا
رنج کے پیچھے ہے راحت' رات کے پیچھے ہے دن
شاد ہو عابد' یہ ہاتف نے سنائی ہے ندا

حوالہ جات

کوثر' ڈاکٹر انعام الحق' بلوچستان میں اردو' مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد'۱۹۸۶ء
عابد' سید عابد' گلزار عابد' دیو بند ۱۹۱۵ء

نواب میر یوسف علی خان عزیز مگسی

ولادت ۱۹۰۱ء وفات ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ میں نواب یوسف علی خان عزیز مگسی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو کو شعوری طور پر بلوچستان میں ذریعہ اظہار بنانے کا سہرا آپ کے سر ہے۔ آپ نے اردو زبان کو انگریزوں کے چنگل سے نکال کر ایک نئی زندگی دی اور اسے سرکاری دفاتر' عدالتوں' تجارتی منڈیوں سے نکال کر اہل بلوچستان کی زبان بنا دیا۔ اردو جسے انگریز مسلمانوں کے تاریخی اور تہذیبی ورثہ فارسی کے مقابلے میں اپنے سرکاری مفادات کے لیے استعمال کر رہے تھے' یوسف عزیز مگسی نے اسے بلوچستان میں رابطے کی زبان بنا دیا۔ بلوچستان میں اردو زبان میں اپنے خیالات' جذبات' احساسات اور افکار کو بیان کرنے کی شعوری کوشش یوسف عزیز مگسی نے کی' آپ نے صحافت سے سیاسی جلسوں اور افسانوں سے شاعری تک اردو کو ہی اظہار اور رابطے کا ذریعہ بنایا۔

نواب میر یوسف عزیز مگسی بلوچستان کے ان عظیم فرزندوں میں سے تھے جو ہزاروں سال کی دعاؤں کے بعد پیدا ہوتے ہیں' آپ نے بلوچستان کی سیاسی' سماجی' قبائلی' ثقافتی' ادبی اور لسانی روایات کو ایک نیا رنگ دیا۔ بلوچستان کی سیاست اور ادب پر آج بھی آپ کے گہرے اثرات موجود ہیں۔ آپ نے اردو کو بلوچستان کے عوام کی زبان اور آواز بنانے کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں۔

نواب یوسف عزیز مگسی ۱۹۰۱ء میں جھل مگسی میں پیدا ہوئے آپ اپنے والد نواب قیصر خان مگسی کے دوسرے بیٹے تھے' آپ کے بڑے بھائی نواب گل محمد خان زیب مگسی شاعر ہفت زباں تھے۔ آپ کے والد ایک صاحب ادراک' جہاں دیدہ اور مردم شناس شخص تھے' ایک قبائلی سردار ہونے کے ساتھ علم و ادب سے بھی گہری وابستگی رکھتے تھے۔ وہ حریت فکر و قلم پر یقین رکھنے والے اور علم کی عظمت سے آگاہ تھے۔ یہ انہی کی تربیت کا

اعجاز تھا کہ ان کے بڑے بیٹے نواب گل محمد زیب مگسی کی طرح، نواب یوسف عزیز مگسی نے نہ صرف قبائلی، سیاسی اور سماجی حوالوں سے گرانقدر خدمات انجام دیں بلکہ اپنے فکر و قلم کی جولانیوں سے ادبی، ثقافتی اور لسانی لحاظ سے بلوچستان اور اردو کی تاریخ میں انمٹ نقوش چھوڑے۔

یوسف عزیز مگسی کی ابتدائی تعلیم روایت کے مطابق ان کے گھر پر ہوئی، جہاں انتہائی لائق اساتذہ انہیں پڑھانے آتے۔ انہوں نے فارسی اور اردو کی تعلیم مولانا غلام قادر سے جبکہ دینی تعلیم قاضی رسول بخش سے حاصل کی۔ انگریزی زبان و ادب کی تعلیم لاہور کے نامور استاد کنہیا لعل سے حاصل کی جو ڈیڑھ سال تک جھل مگسی میں مقیم رہے۔ بلوچستان میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد آزادی کے چراغ کو روشن کرنے اور اس کا نور پھیلانے کے لیے آپ نے کم عمری میں ہی سیاست کی وادی پر خار میں قدم رکھا۔ یہ ایک ایسا پر آشوب دور تھا جب ایک طرف فرنگی جنگ آزادی کے مجاہدین پر عرصہ حیات تنگ کیے ہوئے تھا تو دوسری طرف ریاست قلات کے وزیر اعظم سر شمس شاہ، آزادی کے متوالوں کے لیے شمشیر برہنہ کی صورت قتل و غارت گری میں مصروف تھا۔ شمس شاہ کی مطلق العنانیت کا یہ عالم تھا کہ بقول اختر بلوچ "کوئٹہ کا کوئی آدمی ان سے راہداری لیے بغیر قلات میں داخل ہو ہی نہیں سکتا تھا، ہر سردار ہلاکو خان تھا، اس کی اپنی لیویز تھی، قید خانہ تھا، جس کو چاہتا پکڑتا، سزا دیتا، کاٹھ میں ڈال دیتا، مویشی لے جاتا، کوئی قانون اس کے سامنے حائل نہیں تھا۔ کچھی اس کے ظلم و ستم کا مستقل شکار تھا، بزگروں پر ہر قسم کے ٹیکس عائد تھے جن کے نام سے فصل کا بیشتر حصہ سردار لے جاتے، انگریزی حکومت کی ذہنیت کا یہ عالم تھا کہ سردار اس کے سامنے گیدڑ بنے ہوئے تھے، نواب محراب خان گچکی آف مکران کو معزول کیا گیا، نواب میر یعقوب خان نوشیروانی آف خاران کو قتل کرایا گیا، نواب گوہر خان زرکزئی کو مروا دیا گیا، جام علی خان کو قید کیا، نواب نور الدین مینگل، سردار شہباز خان گرگناڑی کو عمر قید کی سزا دی گئی، نواب قیصر خان مگسی کو جلا وطن کیا گیا، مری علاقہ پر لشکر کشی ہوئی، سردار رستم خان محمد حسنی، سردار رسول بخش مینگل اور میر جعفر

خان کو نظر بند کیا، حکومت کے تشدد سے تنگ آ کر بہت سے سردار افغانستان چلے گئے، زبان پر زبردست تالا تھا، ایسے وقت میں سیاست کرنا دوزخ میں چھلانگ لگانے کے برابر تھا۔" (اختر، ۱۹۹۵ء، ۱۲) سیاست میں آتے ہی آپ پر مشکلات کے دروازے کھل گئے، آپ کو بار بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں، جلا وطن ہونا پڑا، ۱۹۳۴ء میں آپ کو علاج کے بہانے انگلستان بھیجا گیا، انگلستان سے واپسی پر ۳۱، جنوری ۱۹۳۵ء کو آپ قائداعظم سے ملے اور ہندوستان کے صف اول کے تمام رہنماؤں سے رابطے میں رہے، لیکن اسے اہل بلوچستان کی بد قسمتی کہیے کہ ۳۱، مئی ۱۹۳۵ء کے زلزلے میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

یوسف عزیز مگسی کے سن شعور تک پہنچنے سے پہلے ہی انگریز تقریباً پورے بلوچستان میں اپنے پیر جما چکا تھا، مختلف معاہدوں کے تحت نہ صرف ریاست قلات بلکہ افغانستان کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا، صدیوں سے رائج سرکاری، عدالتی طریقہ کار اور قوانین کے ساتھ سرکاری زبان بھی بدل چکی تھی، فارسی عربی کی بجائے اردو انگریزی فرنگیوں کی سرپرستی میں فروغ پا رہی تھیں، نواب یوسف مگسی جنگ آزادی میں بلوچستان کے وہ پہلے مجاہد ہیں جنہوں نے اردو زبان کو تلوار بنا کر انگریزوں کے خلاف استعمال کیا۔ اور اردو کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں سے عوام الناس تک پہنچایا، اور اہل بلوچستان کو ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی آواز سے ہم آہنگ کیا۔ یہ نواب مگسی کی دور اندیش سیاسی بصیرت کا اعجاز ہے کہ بلوچستان نے تحریک آزادی کا وہ سفر بیس سال میں طے کیا جو ہندوستان کے مسلمان دو سو سال میں طے نہ کر سکے تھے۔

سرداری کا منصب سنبھالنے کے فوراً بعد علاقے کی تعلیمی پستی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ۱۵، اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جھل میں جامعہ یوسفیہ کا سنگ بنیاد رکھا اور پانچ سے نو سال کی عمر کے بچوں کے لیے جبری تعلیم کا حکم جاری کیا اور آمدنی کا دسواں حصہ تعلیم پر خرچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوسف عزیز بذات خود جامعہ میں معائنے کے لیے جاتے، تعلیمی حالات کا جائزہ لیتے اور تجاویز کی کتاب میں بہتر تعلیم کے لیے احکامات قلمبند کرتے ۔ جامعہ یوسفیہ جھل کے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے ۱۹۳۴ء میں ایک خوبصورت نظم میں فرماتے ہیں

شعاع علم سے روشن کرو تم اپنے سینے کو
تمہیں ہے ڈھونڈنا اک گمشدہ قومی دفینے کو
عزیزی جامعہ ہے درحقیقت دولت نایاب
کچھ اس کے سامنے سمجھو نہ قاروں کے خزینے کو
نہ جانے پائے ہاتھوں سے ذرا ہشیار ہو رہنا
کہ وہ انمول ہے، پایا ہے تم نے جس نگینے کو
یہ پراعجاز صنعت ہے، اسے اچھی طرح سیکھو
بنانا ہے تمہیں گوہر، بلوچوں کے پسینے کو
کرو صد جانفشانی سے سبق اسلام کے ازبر
اسی توشے کو لے کر چل سکو گے تم مدینے کو
چھپا کب تک رہے گا آہ، جہل کے تنگ گوشے میں
سربازار لاؤ حسن "یوسف" کے خزینے کو

(کوثر، صریر بولان، بہار ۱۹۹۵)

آپ نے بلوچستان میں تعلیم کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ سیاسی مضامین، افسانے، ذاتی خطوط، شاعری اور جلسے جلوسوں میں اردو کو ذریعہ اظہار بنا کر ایک قلیل مدت میں بلوچستان کی سیاسی، سماجی اور ادبی فضا کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

یوسف عزیز مگسی بلوچستان کے پہلے شخص تھے جو سر سید احمد خان، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان جیسے عظیم مفکروں اور رہنماؤں سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ شعوری طور پر ان سے وابستہ تھے اور دوسری طرف وہ انگلستان کے فرنگیوں کی نہ صرف زبان سے آگاہ تھے بلکہ اس کی سیاسی چالوں اور مکاریوں سے بھی باخبر تھے۔ آپ بیک وقت بلوچی، فارسی، عربی، اردو، انگریزی، سندھی اور سرائیکی زبانوں پر عبور رکھتے تھے لیکن آپ نے بلوچستان کے عوام سے گفتگو کے لیے اردو کا انتخاب کیا۔ آپ کے خطوط بلوچستان میں اردو نثر کا گرانقدر سرمایہ ہیں اور تاریخی اور لسانی حوالے سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

یوسف عزیز سے برصغیر کے بلند مرتبت مفکرین اور رہنما بھی ایک خاص تعلق خاطر رکھتے تھے، مولانا ظفر علی خان نے آپ کے متعلق فرمایا ہے

تم کو خفی عزیز ہے، ہم کو جلی عزیز
عارض کا گل تمہیں، ہمیں دل کی کلی عزیز
لفظ بلوچ مہر و وفا کا کلام ہے
معنی ہیں اس کلام کے یوسف علی عزیز

پروردگار عالم نے انہیں حسب و نسب، دولت، صورت و سیرت، قرطاس و قلم، زبان و بیاں، ہردلعزیزی و سرداری تمام نعمتوں سے مالامال کیا تھا، ان کی تحریر و تقریر دونوں پراثر اور ملتان سے گلستان (ضلع پشین) تک ان کے چاہنے والوں کی تعداد لاکھوں میں تھی، اور آج بھی بلوچستان کے تمام لسانی گروہ ان پر نازاں ہیں وہ ایک پاک دل اور راست باز، جذبہ حریت سے سرشار مسلمان تھے۔

نواب یوسف عزیز مگسی کی شاعری، مسلمانان برصغیر اور بلوچستان کے مظلوم عوام کی آواز اور سوز دروں کی شاعری ہے۔ آپ کی محبوبہ آزادی ہے اور آپ کی گفتگو بلوچستان کے عوام سے ہے۔ آپ کا مقصد اول و آخر انگریزوں سے نجات اور آزادی حاصل کرنا تھا۔ آپ کی شاعری قوم کو بیدار کرنے کے لیے ہے، آپ کی نظمیں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کی یاد دلاتی ہیں۔ آپ کے اشعار میں قرآنی تلمیحات، استعارات اور تشبیہات اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ آپ تاریخ اسلام، قرآن مجید اور احادیث نبوی پر گہری نظر رکھتے ہیں۔

میں اگر چاہوں تو ذرے کو بیاباں کر دوں
قطرہ آب میں پیدا سر طوفاں کر دوں
یہ ارادہ ہے کہ اسلام کا بن کر خادم
ساری دنیا کو نئے سر سے مسلماں کر دوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلاؤں سب کو

ہر بلوچ کو غرض حامل قرآن کر دوں
جی میں آتا ہے کہ پھر طور کو آباد کروں
آتش دل سے پہاڑوں کو چراغاں کر دوں
جوش میں آ کے اگر نعرہ اللہ ماروں
حق و باطل کے تفاوت کو نمایاں کر دوں
میں وہ مجنوں ہوں اگر چاہوں جہاں کو یکسر
طرہ یارؐ کی مانند پریشاں کر دوں
اس قدر شعلہ فشاں بزم جہاں میں ہو جاؤں
ذرے ذرے میں بپا حشر کا ساماں کر دوں
میں وہ مالی ہوں اگر کھول دوں دل کی سوتیں
خشک صحراؤں میں پیدا گل و ریحاں کر دوں
گاندھی و مالوی کے وعظ دھرے رہ جائیں
میں اگر قول محمدؐ نمایاں کر دوں
اسی ایقان براہیم کا وارث ہوں عزیز
اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کر دوں

ضرورت ہے کہ پھر شمع وطن پہ نذر ہونے کو
وطن زادوں سے ہر آتش بجاں پروانہ ہو جائے
فقط دانائیوں سے ہی مرادیں بر نہیں آتیں
ضرورت ہے کہ داناؤں میں اک دیوانہ ہو جائے
ضرورت ہے اک ایسے ہی بلا نوش و بلا کش کی
کہ بوتل توڑ، خم کو پھینک، خود میخانہ ہو جائے

ضرورت ہے وطن کو ایک ایسے مرد کامل کی
کہ دست جنس آزادی کا جو پیمانہ ہو جائے
ضرورت ہے اک ایسے کاسہ سر شعلہ دیدہ کی
شراب آتش الفت کا جو پیمانہ ہو جائے

کرم ہے تیغ جفا کا بقدر وسعت شوق
جسے ہو ذوق تماشا، کفن بدوش آئے
بنے گا کام نہ یاں اب قراردادوں سے
وہ سربلند ہے جو بن کے سرخ پوش آئے
نوائے گاندھی و جیکر سے کام بن نہ سکا
کمال سا کوئی اب ساز پر خروش آئے
اب آگے مرحلہ آتا ہے سخت کوشی کا
ہمارے ساتھ نہ اب کوئی عیش کوش آئے
نہ ہو سکے جو حریف خمار جام تو کیا
مزہ تو جب ہے کہ پینے سے اور ہوش آئے
جناب شیخ کو چلتے ہی بن پڑی آخر
کچھ ایسی شان سے محفل میں بادہ نوش آئے
اٹھ اے بلوچ، بدل دے نظام فطرت کو
جگر پہ تیر چلیں اور دل میں جوش آئے

قسم اس درد کی حصہ میں آیا جو نبوت کے
قسم اس جوش کی پہلو میں آیا جو محبت کے

قسم ہے ان نیازوں کی جو راز عشق بن جائیں
قسم ہے ان نمازوں کی جو ناز عشق بن جائیں
قسم ہے اس جنوں کی جو نصیب قیس دانا تھا
قسم ہے اس دہن کی جس پہ الفت کا ترانہ تھا
قسم رسوائیوں کی جن سے زینت ہے محبت کی
قسم بدنامیوں کی جن سے قیمت ہے محبت کی
قسم ہے کبریائے عشق شیطاں ساز کی یارب
قسم اس کبر اور انکار ایقاں ساز کی یارب
قسم ہے غزوہ بدر و احد میں مرنے والوں کی
قسم ہے کربلا کو خون سے تر کرنے والوں کی
قسم اس شور کی جو رونق غم خانہ ہوتا ہے
قسم اس درد کی جو زینت پیمانہ ہوتا ہے
قسم اس ناخدا کی جو ندیم جوش طوفاں ہو
قسم اس بادباں کی جو رفیق رعد و باراں ہو
قسم اس مرد غازی کی جو فطرت میں حجازی تھا
گلے پر جس کے خنجر تھا مگر پھر بھی نمازی تھا
قسم ہے امی بطحا کے ایثار و شجاعت کی
شکم پر سنگ خارا باندھنے والی سخاوت کی
کہ اپنے ملک سے داغ غلامی دھو کے چھوڑوں گا
بلوچستان کو آزادی کی مے پلوا کے چھوڑوں گا
جلا کر استخواں کے مغز سے شمع دل مضطر
عزیزان وطن کی بزم کو چمکا کے چھوڑوں گا

کٹا کر چند سر اور گردنیں اپنے رفیقوں کی
زکوٰہ فرض اپنی قوم سے دلوا کے چھوڑوں گا
میں پھر انداز نو سے نغمہ ء حب وطن گا کر
سکوت اندوز تار اسلام کا بجوا کے چھوڑوں گا
سبق دے کر اخوت کا شجاعت کا محبت کا
میں پھر بگڑی بلوچستان کی بنوا کے چھوڑوں گا
میں پھر اعلان کرتا ہوں میں پھر اقرار کرتا ہوں
میں اپنی بات پر پھر یوسفی اصرار کرتا ہوں
کہ اے اہل وطن جس وقت تم مجھ کو بلاؤ گے
مجھے سرباز دیکھو گے مجھے جانباز پاؤ گے

ہوئی حق کی خلافت تم کو عطا' مایوس نہ ہو اٹھ ہمت کر
پھر نعرہ باطل سوز سے تو دنیا کو جگا' اٹھ ہمت کر
وہ زیب عرب وہ فخر عجم روتا ہے تمہاری عظمت پر
اٹھ تھام لے باگیں دنیا کی' غازی کہلا' اٹھ ہمت کر
اک ہاتھ میں نیزہ ایوبی' اک ہاتھ میں سیف ہو خالد کی
مشرق بھی ترا'مغرب بھی ترا'اللہ کے لیے اٹھ ہمت کر
آلات حرب کے فقداں سے اور سیم و زر کے کتماں سے
مایوس نہ ہو اللہ پہ رکھ اللہ کو پکار اٹھ ہمت کر
ہے وقت عجب امت پہ پڑا' تاخیر کے معنی موت کے ہیں
تاخیر نہ کر تعجیل سے اٹھ' ایمان سے اٹھ' اٹھ ہمت کر
تجھے سیم و زر سے واسطہ کیا اور توپ مشینوں سے کیا کام

تکبیر سے اٹھ تبلیغ سے اٹھ شمشیر سے اٹھ اٹھ ہمت کر
معمور گناہوں کی دنیا کسی مرد خدا کی تاک میں ہے
اے ارض خدا کی قوت اٹھ، دنیا کو سنوار، اٹھ ہمت کر
اس عالم رنگ و بو میں اگر آئی ہے خزاں تو خیال نہ کر
کرنی ہے تجھے تعمیر جہاں، معمار جہاں اٹھ ہمت کر
بدیوں کے سلاسل کی کڑیاں اندر سے تو یہ سب کھوکھلے ہیں
بس ایک ضرب تکبیر کی پھر اے سیف خدا اٹھ ہمت کر
فاروقی سطوت لے کے اٹھ اور خالد کی پھر سیف بھی تھام
اے نائب حق فتنے کو مٹا فتنہ ہے بڑا اٹھ ہمت ک
تقدیر کا رونا یہ کب تک، تقدیر تمہاری خادم ہے
تو اپنے لیے اک اور نئی تقدیر بنا اٹھ ہمت کر
تو مورث ابراہیم کا ہے پھر آذر کی تقلید ہے کیوں
بت توڑ، خدا سے جوڑ کہ تو ہے عبد خدا اٹھ ہمت کر
تو فرزند توحید ہے گر، توحید پہ کٹ توحید پہ مر
سرمایہ ترا، سامان ترا، ہے ذات خدا اٹھ ہمت کر
مومن ہے تو پھر شرط ہے یہ، ایمان کی شعاعیں پیدا کر
اور دل کو امنگوں سے گرما، اے حزب خدا اٹھ ہمت کر

اے مطرب نغمہ نواز
ہاں گائے جا ہاں گائے جا
تانوں سے جی بھرمائے جا
اہل بلوچستاں کو پھر

شرمائے جا، شرمائے جا
اے مطرب نغمہ نواز
سن اور غلامی کیا ہے تو
اک پیکر لعنت ہے تو
جس قوم پہ نازل ہے تو
اس قوم پر ذلت ہے تو
اے مطرب نغمہ نواز
اے انقلاب دہر جاگ
پھر کھول دے بوتل کے کاگ
امرا تو کھائیں دال ساگ
مزدور کھائیں دال ساگ
اے مطرب نغمہ نواز
اے گردش ایام تو
قسمت کی باگیں موڑ دے
جو رہنما غدار ہو
تو اس کی گردن توڑ دے
اے مطرب نغمہ نواز
یہ نغمہ ہائے حریت
سن اور بلوچی قوم سن
اٹھ اور آنکھیں کھول دے
اے مست و سکر و نوم سن
اے مطرب نغمہ نواز

اس کو مٹا جلدی مٹا
سردار ہو انگریز ہو
جو قوت شیطان ہو
جو ثانی چینگیز ہو
اے مطرب نغمہ نواز

حوالہ جات

بلوچ، اختر علی خان، بلوچستان کی نامور شخصیات، ۱۹۹۵ء
نصیر، میر گل خان، تاریخ بلوچستان،
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، بلوچستان میں اردو،
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، یوسف عزیز مگسی، صریر بولان، انجمن فارسی بلوچستان کوئٹہ، بہار ۱۹۹۵ء

میر محمد حسین عنقا

ولادت ۱۹۰۷ء وفات ۱۹۷۷ء

اردو زبان و ادب کے فروغ میں اہل بلوچستان کا حصہ اور بلوچستانیوں کے اردو زبان و ادب سے شعوری تعلق کی کہانی میر محمد حسین عنقا کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہے۔ بلوچستان میں اردو کو شعوری طور پر رابطے کی زبان بنانے میں میر یوسف عزیز مگسی نے جس تحریک کا آغاز کیا، میر محمد حسین عنقا نے اسے تکمیل تک پہنچانے میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آپ نے بیک وقت سیاست، صحافت اور شاعری کے ذریعے بلوچستان میں اردو کو رابطے کی زبان اور اظہار کا وسیلہ بنانے کے ساتھ ساتھ اسے ادبی سطح پر متعارف کرانے میں اپنی پوری زندگی بتا دی۔

میر محمد حسین عنقا ۱۹۰۷ء میں ضلع بولان کے علاقہ مچکان میں پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار کا نام عبداللہ گزازئی تھا۔ ابتدائی تعلیم پرائمری سکول مچھ سے حاصل کرنے کے بعد آپ نے میٹرک کا امتحان سبی سے پاس کیا جس کے بعد سرکاری سکول میں استاد کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ ۱۹۲۶ء میں بلوچستان کی پہلی سیاسی جماعت "انجمن اتحاد بلوچاں" کے بنیادی رکن بنے جو میر یوسف عزیز مگسی کی سرپرستی میں قائم ہوئی، اور پھر ۱۹۳۲ء میں سرکاری ملازمت کو چھوڑ کر بلوچستان میں تحریک آزادی کو پروان چڑھانے کے لیے صحافت کے محاذ کو سنبھالا۔ میر یوسف عزیز مگسی کی سرپرستی میں سب سے پہلے "البلوچ" کا اجراء کیا۔

آپ نے بلوچستان میں تحریک آزادی کی جنگ بندوق کی بجائے قلم سے لڑی اور اس کی پاداش میں آپ کو قید و بند کی صعوبتوں کے ساتھ ساتھ جلاوطنی کی اذیتیں بھی جھیلنا پڑیں، آپ نے تقریباً بیس سال جیلوں میں اور دس سال جلاوطنی میں بسر کیے۔ آپ کی علم دوستی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو کہ آپ نے ایف اے، بی اے اور ایم اے کے

امتحانات جیل سے پاس کیے۔ آپ کے اخبارات بند ہوتے رہے لیکن آپ کی بلند ہمتی میں کمی نہیں آئی' آپ نے ہندوستان بھر کے دورے کیے اور بلوچستان کے حقوق کی خاطر دم آخر تک جدوجہد کرتے رہے۔ اہل بلوچستان کے مصائب کو بیان کرنے کے لیے ایک طرف تو آپ نے اخبارات و جرائد کا سہارا لیا اور دوسری طرف ہندوستان کے تمام رہنماؤں سے بالمشافہ ملاقاتیں کیں' آپ علامہ اقبال' مولانا ظفر علی خان سمیت اپنے عہد کے تمام بڑے رہنماؤں سے ملے۔

اپنے عظیم دوست اور مربی نواب یوسف عزیز مگسی کے طریقہ کار کو اپناتے ہوئے عنقا صاحب نے بلوچستان میں اردو کو رابطے اور اظہار کا ذریعہ بنایا اور اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر اپنی کتاب ”بلوچستان میں اردو“ میں لکھتے ہیں کہ ”محمد حسین عنقا کو اخوندزادہ عبدالحق زبور سے شاعری اور فلسفے کا تلمذ رہا ہے۔“ جس کا عکس آپ کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ آپ کی تحریروں کو عوام تک پہنچنے سے روکنے کے لیے ان لوگوں کو بھی سزائیں دی جاتی تھیں جو آپ کا اخبار پڑھتے' آپ اردو اور فارسی کے شاعر تھے' آپ کی اردو شاعری بلوچستان کی تاریخ میں اردو کا گرانقدر سرمایہ ہے۔

آپ کا مجموعہ کلام ”رحیل کوہ“ کے نام سے ۱۹۳۴ء میں کراچی سے شائع ہوا جس میں اردو کے علاوہ فارسی اشعار بھی شامل ہیں۔ ”رحیل کوہ“ تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔

بلوچستان میں اردو شاعری کی وہ روایت جو میر یوسف عزیز مگسی سے شروع ہوئی' آپ کے دم سے قائم رہی' آپ ۱۹۷۷ء میں ستر سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

بلوچستان میں اردو زبان کی ترویج و ترقی کے ساتھ ساتھ اردو صحافت' تاریخ نویسی' مکتوبات اور شاعری میں میر محمد حسین عنقا کی شخصیت انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ آپ کا اردو کلام آپ کے بیٹے میر نصرت حسین عنقا کے پاس محفوظ ہے جسے اب تک شائع نہیں

کیا جا سکا ہے۔

اک مرغ ہوا نے یہ کہا مرغ سرا سے
کیا ہی تجھے نسبت ہے بھلا مرغ ہوا سے
کی تو نے حیات اپنی گرو پیٹ کی خاطر
باہر تجھے آنا نہیں دیوار سرا سے
ناداں ہے تو کتنا کہ تو کرتا ہے فدا جاں
دیتا ہے اگر دشمن جاں تجھ کو دلاسے
کیوں بار اٹھایا ہے پروبال کا تو نے
کیوں شوق ہوا ہے یہ تجھے اپنی قضا سے
کیا تو نے یہی طاقت پرواز بہم کی
اوپر نہ اڑے گا تو سر خواجہ سرا سے
اپنا یہ مگر حال کہ دن رات مشاغل
رہتا ہے مجھے رفعت اجرام سما سے
یہ طنز و طاعن کا سخن ختم ہوا جب
کہنے یہ لگا مرغ سرا مرغ ہوا سے
میں رزق شکم کرتا ہوں حاصل تو بدل سے
پر اس کے لیے تجھ کو سروکار جفا سے
یہ وحشت و یہ وہم رہے اس کو جو بد ہے
ہوں نیک نہیں کوئی مجھے خوف بلا سے
فطرت نے مری مجھ کو سکھائی ہے محبت
وحشت سے گریزاں ہوں الفت ہے وفا سے
آقا بھی مرا سرور عالم بھی زمیں پر

گستاخ نہیں تا اڑوں اوپر میں سرا سے

کہو بہر خدا اے کوئٹہ والو
تمہیں کیا ہو گیا اے کوئٹہ والو
حقیقت میں تمہیں ہو کاروان میر
ہو پیچھے کیوں بھلا اے کوئٹہ والو
اگر سمجھوں تو کیا سمجھوں بتاؤ
مجھے بہر خدا اے کوئٹہ والو
سمجھتے یا نہیں ہو ہم کو بھائی
کہ ہم سے ہو جدا اے کوئٹہ والو
تمہیں کیا لت ہے معشوقانہ خو کی
کہ کھچتے ہو ذرا اے کوئٹہ والو
تمہیں یا ننگ ہے یہ صحبت اپنی
کہ تم تو ہو بلا اے کوئٹہ والو
مگر عنقا کی یہ تم سے گزارش
سنو بہر خدا اے کوئٹہ والو
اخوت، علم، تہذیب اور اسلام
تمہارا کیا ہوا اے کوئٹہ والو
یہ دن شکوہ طرازی کے نہیں ہیں
یہ چھوڑو مشغلہ اے کوئٹہ والو
تمہارے واسطے ہے سخت مضطر
تمہارا قافلہ اے کوئٹہ والو

اٹھو تا کارواں میری کوئی اور
نہ لیوے دیکھنا اے کوئٹہ والو

حوالہ جات

۱۔ بلوچ، اختر علی خاں "بلوچستان کی نامور شخصیات" رائل بک کمپنی، کراچی ۱۹۹۰ء
۲۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۶ء
۳۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق "علامہ اقبال اور بلوچستان" اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۹۸ء

میر گل خان نصیر

ولادت ۱۴، مئی ۱۹۱۴ء　　　وفات ۷، دسمبر ۱۹۸۳ء

میر گل خان نصیر کا شمار بلوچستان میں اردو کے ان اولین محسنین میں ہے جنھوں نے نظم و نثر، تحقیق و تنقید، سیاست و صحافت، اور تاریخ و ادب کے ساتھ ساتھ اردو اور بلوچی شاعری میں بھی یکساں طور پر قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ اور ترویج و ترقی میں میر گل خان نصیر کا نام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

میر گل خان نصیر ۱۴، مئی ۱۹۱۴ء کو نوشکی کے نواحی گاؤں "کلی مینگل" میں پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار کا نام میر حبیب اللہ خان تھا جو مینگل قبیلے کے اس طائفے سے تعلق رکھتے تھے جو "ذگر مینگل" کہلاتا ہے اور ضلع چاغی میں مقیم ہے۔ میر گل خان نصیر نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سنڈیمن ہائی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد لاہور کے اسلامیہ کالج سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ لاہور سے واپس آنے کے بعد آپ نے ریاست قلات میں نائب تحصیلدار کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور ترقی کرتے کرتے نائب وزیر کے عہدے تک پہنچے۔ لیکن بلوچستان کے دگرگوں سیاسی حالات، انگریزوں کی غلامی، اور ناانصافیوں کی وجہ سے اس قومی تحریک میں شامل ہو گئے جو میر یوسف عزیز مگسی، محمد حسین عنقا، ملک فیض محمد یوسف زئی، محمد حسن نظامی جیسے جنگ آزادی کے دیگر زعماء نے شروع کر رکھی تھی۔ بقول اختر بلوچ "اس وقت ریاست قلات میں پہلی سیاسی تنظیم "قلات نیشنل پارٹی" کے خدوخال اجاگر ہو رہے تھے اور مقامی ریاستی ملازموں کے لیے اس میں دلچسپی لینا یا شامل ہونا ممنوع نہیں ہوا تھا، چنانچہ دیگر ساتھیوں سمیت میر گل خان نصیر بھی قلات نیشنل پارٹی میں شامل ہو کر سیاست میں دخیل ہو گئے۔ انگریز حاکموں اور ان کے کارندوں نے اس صورت حال کا سنجیدگی سے نوٹس لیا اور پارٹی کے پہلے جلسے کو اپنے ہمنوا سرداروں کی مدد سے مستونگ میں بزور قوت درہم برہم کرا دیا اور پارٹی کو خلاف قانون قرار

دے کر گل خان نصیر سمیت ان کے ساتھیوں کو ریاست بدر کر دیا۔ . . . میر گل خان نصیر اور ان کے ساتھی کوئٹہ چلے آئے یہاں انہوں نے نیشنل پارٹی کا دفتر قائم کیا اور ریاستی ملازمتوں کو خیرباد کہہ کر وہ انگریز کے خلاف جد و جہد میں مصروف ہو گئے۔" آپ نے اپنی تحریر و تقریر اور شاعری کے ذریعے جد و جہد آزادی میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔

میر گل خان نصیر نے نہ صرف اردو اور بلوچی میں اپنے اشعار کے ذریعے بلوچستان میں عوام کی بیداری کا گرانقدر کارنامہ انجام دیا بلکہ اردو میں بلوچستان کی تاریخ اور ثقافت پر کئی کتابیں لکھنے کے علاوہ ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے پوری زندگی جدو جہد کی۔ بلوچستان کو صوبائی درجہ ملنے کے بعد آپ بلوچستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور وزیر تعلیم بنے۔ آپ ۷، دسمبر ۱۹۸۳ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

میر گل خان نصیر سات زبانوں پر عبور رکھتے تھے البتہ اردو کے علاوہ براہوئی، بلوچی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ میر گل خان نصیر کا اردو کلام سینتالیس (۴۷) نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے جو ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۰ء کے عرصے میں لکھی گئی ہیں اور ان کی بیٹی کے پاس محفوظ ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے بلوچستان میں تحریک آزادی کی تاریخ اور فرنگیوں کے ساتھ ساتھ سرداروں کے خلاف بلوچستان کے مظلوم بلوچوں اور پشتونوں کی اس جدوجہد کا پتہ چلتا ہے جو انہوں نے انگریزوں اور سرداروں کے خلاف بیک وقت کی تھی۔ یہ تمام نظمیں کچھ فنی اور لسانی خامیوں کے باوجود بلوچستان میں اردو شاعری کے اس دور کی یادگار ہیں جب طرحی مشاعروں کی بجائے حالی اور اقبال کے انقلابی خیالات نے اہل بلوچستان کو متوجہ کیا اور اس عظیم جد و جہد میں شریک کیا جس میں برصغیر پاک و ہند کے تمام مسلمان مصروف تھے۔

میر گل خان نصیر کی بعض نظموں میں ہندی الفاظ کا استعمال ہمیں نظیر اکبر آبادی کی یاد دلاتا ہے، اور ان کے انقلابی اور حریت پسندانہ کلام میں اقبال کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ "دعا" "حلف نامہ آزادی" "شہادت میر محراب خان غازی" "ندامت کے آنسو" "کیسے مانوں" "راج کرے سردار" "نوائے وقت" "قبائلی سرداروں سے" جیسی نظمیں

اپنے موضوع، روانی اور جذبہ کی وجہ سے اچھی نظمیں ہیں۔ میر نصیر خان نے بلوچی شاعر بالاچ کی ایک نظم کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔

تاثیر سوز دل سے سدا بے قرار ہوں
پروانہ وار شمع وطن پر نثار ہوں
مہمان ایک شب کا ہوں میں شمع کی طرح
دنیا میں ایک ہستی ناپائیدار ہوں
تر ہو رہا ہے دامن دل سیل اشک سے
فکر وطن میں شام و سحر اشکبار ہوں
جب خود نہ اپنے راز دروں کو چھپا سکا
مشکل ہے پھر کسی کا جو میں راز دار ہوں
کہتے ہیں کرو مشق سخن کے لیے نصیر
ورنہ میں اپنے شعر پہ خود شرمسار ہوں

کفر کے ظلمت کدے میں نور ایماں چاہیے
کشتی بے بادباں کو فضل یزداں چاہیے
چاہتے ہیں ہم کہ کاٹیں سب غلامی کی جڑیں
یعنی ہم کو پیروی درس قرآں چاہیے
حریت کی رحمتیں برسیں گی ملک و قوم پر
ہاں براہیمی منانا عید قرباں چاہیے
جیل بہہ جائے نکل جائیں، اچکزئی اور کرد
اشک کے سیلاب میں کچھ ایسا طغیاں چاہیے
گرچہ ہم بیدار ہیں پر راستہ ملتا نہیں

رہنمائی کے لیے یوسف علی خاں چاہیے

کون کہتا ہے کہ ہم کچھ کر نہیں دکھلائیں گے

ناصح مشفق ہمیں شہباز خاراں چاہیے

کونسا عقدہ ہے جو وا ہو نہیں سکتا نصیر

کام کرنے کو جوانمردی و ایماں چاہیے

اٹھ کے اب دنیا میں پھر جینے کا ساماں کیجئے

آج اس کانٹے کو ہمرنگ گلستاں کیجئے

لب و دلور اور جرگے کے یہ جھگڑے چھوڑ دے

یعنی دل کو بے نیاز کفر و ایماں کیجئے

"کلمتہ الحق" آ گیا زنجیر باطل توڑنے

آیئے اب دوسری ہستی کا ساماں کیجئے

دیجئے بیتاب دل کو درس آزادی مدام

ان غلاموں کو ذرا آزاد انساں کیجئے

دیکھیے کیا رنگ دکھلائے گی یہ شور و شغب

کھویئے اپنے کو تو پھر ان کا ارماں کیجئے

یہ مرا پیغام اب شہباز سے کہہ دو نصیر

زندگی بھر شکوہ جور عزیزاں کیجئے

آ گیا وقت امتحان بلوچ   اب ہے کچھ اور آسمان بلوچ

قید سے کیوں انہیں ڈراتے ہو   طفل ناداں نہیں جوان بلوچ

خوف زنداں نہیں بلوچوں کو   جان پر کھیلنا ہے شان بلوچ

ملک و ملت کے واسطے قرباں   مال و دولت عزیز و جان بلوچ

ہوئے گی آخر ایک دن آزاد   آج اگر بند ہے زبان بلوچ

زور باطل سے دب نہیں سکتا   دیکھ لے، آزما، کمان بلوچ

کچھ نہیں ہے مگر خدا کے سوا   جس سے قائم ہے آن بان بلوچ

رکھ توقع نصیر خالق پر   ہے وہ خلاق پاسبان بلوچ

غیروں سے شکایت یہ مرا کام نہیں ہے

سچ بات ہے اپنوں سے بھی آرام نہیں ہے

بجلی بھی گرے مجھ پہ ستم پر ستم آئے

خاموش رہوں میں یہ مرا کام نہیں ہے

سردار سیہ کار ہو زانی ہو کہ لوطی

سردار ہے بس اس لیے بدنام نہیں ہے

بجلی نہ گرائی تری مسند پہ تو کہتا

اسلام کا فرزند مرا نام نہیں ہے

اسلام و شریعت کا ہے سودا مرے سر میں

قائم نہ شریعت ہو تو آرام نہیں ہے

ناکردہ گناہوں کی سزا جھیل رہا ہوں

الزام یہی ہے کہ کچھ الزام نہیں ہے

ہم جیل میں جانے کی شکایت نہ کریں گے

تکلیف ہی کیا ہے اگر آرام نہیں ہے

شہباز نے ہم کو جو بھلایا تو بھلایا

ہم اس کو بھلا دیں تو وفا نام نہیں ہے

اٹھ اے قوم بلوچی اٹھ' بہ انداز دل آرائی
دکھا دے آج پھر دنیا کو وہ شان مسیحائی
اٹھو اور نعرہ تکبیر سے دنیا کو تھرا دو
دکھا دو قوت بازو کی پھر عالم کو گیرائی
اٹھ اے یوسف تو پھر جام بقا دے قوم مردہ کو
جو اب بیدار ہو سکتی ہے لے کر ایک انگڑائی
اٹھا ان زیر دستوں کو ذرا خاک مذلت سے
جگا دے خفتہ بختوں کو بہانگ کار فرمائی
بلوچی زندگی کی شان پھر دنیا کو دکھلا دے
بتا دے ان کو کر سکتی ہے کیا یہ قوم صحرائی

نواب میر یوسف علی خان مرحوم

ارادہ تھا کہ اک دنیا نئی آباد کر لیں گے
عدو کے ہاتھ سے ہم ملک کو آزاد کر لیں گے
اکھاڑیں گے بلوچستان سے ہم بیخ باطل کی
وطن کے دشمنوں کو یک قلم برباد کر لیں گے
مٹا ڈالیں گے جرگہ کی یہ ایماں سوز رودادیں
شریعت سے مسلمانوں کو پھر دلشاد کر لیں گے
اٹھا دیں گے بلوچوں کو پھر اس خاک مذلت سے
ثریا پر ہم ان کا آشیاں آباد کر لیں گے
مٹا دیں گے لب و ولور کے جھگڑے ملک سے یکسر

پرانی بدعتوں سے ملک کو آزاد کر لیں گے
مگر اے بخت بد تو نے کہیں کا بھی نہیں رکھا
ترے ہاتھوں سے روز حشر تک فریاد کر لیں گے
نہیں بھولے گی تیری یاد اے یوسف عزیز ہم کو
رہے گی زندگی جب تک تمہیں ہم یاد کر لیں گے

رہیں گے ہم گرفتار بلائے آسماں کب تک
جلائیں گی ہماری جھونپڑی کو بجلیاں کب تک
میسر ہوں انہیں دیبا کی اور اطلس کی پوشاکیں
لگائیں جھونپڑی پر سوت کی ہم دھجیاں کب تک
رہائش کے لیے ان کی بنے ہوں قصر جمشیدی
ہماری تیرہ بختی کے لیے ہوں جھگیاں کب تک
میسر ہوں انہیں آرام و آسائش کی سب چیزیں
رہیں محروم ہم ان سے اٹھائیں سختیاں کب تک
نہیں ملتی ہو ہم کو جو کی روٹی پیٹ بھرنے کو
اڑائیں عیش میں وہ مال و دولت رائیگاں کب تک
کریں برباد وہ ہم کو زر شاہ اور زر سر ہے
یہ ظلم ناروا کب تک یہ قہر آسماں کب تک
بشکل جونک سرداروں نے ہم کو چوس رکھا ہے
الٰہی رنگ لائیگا یہ خون بے زباں کب تک
اٹھو اے نوجوانو! اب عمل کا وقت آیا ہے
یہ طفلانہ تسلی اور یہ آہ و فغاں کب تک

بھروسہ تم کو کرنا چاہئے اب زور بازو پر
یہ لا حاصل حکایات اور یاد رفتگاں کب تک
یہ پیغام نصیری ہے اٹھو گر جوش ہے تم میں
غلامی کی مصیبت میں رہو گے نیم جاں کب تک

کنارے دریا جیونی کے میں غم کے آنسو بہا رہا ہوں
تمہارے وعدوں کو یاد کر کے جگر کی شمعیں جلا رہا ہوں
گماں نہ تھا اس قدر بگڑ کر بنیں گے پھر نہ عزیز ہم سے
اسی تفکر میں غرق ہو کر میں سر کو اپنے جھکا رہا ہوں
خیال یہ تھا کہ سختیوں میں نہ بھول جائیں گے آپ ہم کو
غلط یہ نکلا مرا تصور میں اسکے برعکس پا رہا ہوں
غزل سمجھ کر اسے نہ پڑھنا تڑپتے دل کی یہ داستاں ہے
رہ طلب میں خراب ہو کر میں دل کی بتی جلا رہا ہوں
عجیب ہے یہ نظام دنیا عجب ہے گردش یہ آسماں کی
فریب ایفائے عہد کھا کر میں عمر اپنی گنوا رہا ہوں
نصیر کہنے کی ہیں یہ باتیں نہیں ہے کچھ لطف دوستی میں
میں اس حقیقت کو بعد مدت کے بے نقاب آج پا رہا ہوں

"ندامت کے آنسو"

کیوں بگڑتے ہو دل ناشاد تم ہر بات پر
ضرب یوں کاری لگی ہے کیا ترے جذبات پر
اب ہوا محسوس تم کو تیر غم کھانے کے بعد

نوجوانان وطن کے دیس سے جانے کے بعد
شرم اب آتی ہے تم کو روٹھ اب جاتے ہو تم
خشک اب ٹہنی ہوئی ہے ٹوٹ اب جاتے ہو تم
اب ندامت کا پسینہ پونچھتے ہو بدنصیب
آ گیا جب ہاتھ عزرائیل کا سر کے قریب
پے بہ پے غداریوں سے آج گھبرایا ہوا
غیر کا روندا ہوا دشمن کا ٹھکرایا ہوا
دوستوں سے عہد و پیمان وفا کو توڑ کر
دشمنان قوم سے عہد وفا کو جوڑ کر
خون پی کر ان ضعیفوں بیکسوں کا بے حیا
لقمہ تر کے لئے کی قوم سے تو نے دغا
وعدہ و اقرار سب بھولے قسم اللہ کی
خیال تک آیا نہیں تم کو قسم اللہ کی
ملک و ملت کے جو نغمے رات دن گاتے رہے
روح آزادی کو ان نغموں سے شرماتے رہے
روح کو تیری نہ ہو گا حشر تک حاصل قرار
ٹھوکریں کھاتا رہیگا تا ابد تیرا مزار
پیٹھ پھیری تم نے کیوں ان سرفروشوں سے بتا
کیوں علیحدہ ہو گئے ان گرمجوشوں سے بتا
چند ٹکوں کے لئے قومی حمیت بیچ دی
شرم کیوں آئی نہیں تم کو جو عزت بیچ دی
نخل آزادی کی بنیادیں ہلانے کے لئے

قوم کا سرمایہ غیروں پر لٹانے کے لئے
مل گئے اغیار سے جاہ و حشم کے واسطے
اس سراب آسا وزارت اور رقم کے واسطے
اے قتیل عشوہ منصب امارت کا غلام
ایسے غداروں سے میرا لاکھ توبہ صد سلام

اٹھ اے بلوچ نوجوان سپیدہ دم ہوا عیاں
بڑھا چلا وہ کارواں یہ کہہ رہا ہے ساربان
نہیں یہ خواب کا سماں تو قافلے کے ساتھ چل
بڑھا کے قوت عمل نہ ہو جہاں میں مضمحل
کہ کاہلی میں ہے خلل یہ قید و بند جاں گسل
نکل تو ان کو توڑ کر سبو و جام پھوڑ کر
نشاط و عیش چھوڑ کر دلوں کو دل سے جوڑ کر
حوادثوں کو موڑ کر تو مرد کار زار بن
شجاع و شہسوار بن دلیر و جاں نثار بن
جوان کامگار بن عدو پہ برقبار بن
جلا کے ان کو خاک کر وطن کو ان سے پاک کر
قبائے رسم چاک کر نہ خوف کر نہ باک کر
لگا نشانہ تاک کر یہ لات کو منات کو
بتان سومنات کو یہ پیکران ذات کو
یہ مغربی بنات کو شباب ذات و پات کو
وطن سے یوں نکال دے تجھے نہ پھر وبال دے

نہ رنج دے ملال دے خدا تجھے کمال دے
کہ ہر بشر یہ حال دے بلوچ تیز گام ہے
ہمیشہ خوش خرام ہے نہ بند قید و دام ہے
سکوں اسے حرام ہے نصیر خوش کلام ہے
میرا اسے سلام ہے

تصویر زیست

"زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے"
خشک و چٹیل دشت ناپیدا کنار
اور اس میں جھونپڑیوں کی قطار
کڑکڑاتی دھوپ تپتا ریگ زار
ہر طرف چھایا ہوا گرد و غبار
چند جانیں نیم عریاں بے قرار
صاحبان جاہ و دولت کے شکار
سر چھپائے جھگیوں میں اشکبار
موت کا کرتے ہیں اپنی انتظار
لوگ کہتے ہیں کہ یہ تقدیر ہے
زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے

جوئبار و سبزہ و اونچے مکان
جن کی رفعت کو نہ پہنچے آسمان
جا بجا بجلی کے پنکھے سائبان

سرد رویاء آفرین جنت نشان
سیج پھولوں پر پڑے آسودہ جان
داد عشرت دے رہے ہیں ہر زماں
کچھ خیال سود نے خوف زیاں
یہ زمین ان کی ہے ان کا آسماں
دولت و سرمایہ کی تنویر ہے
زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے

نیم عریاں فاقہ کش مزدور ہے
پیٹ پل سکتا نہیں مجبور ہے
خانماں برباد ہے رنجور ہے
محنت پیہم سے چکنا چور ہے
محنت اس کی سعی نامشکور ہے
زندگی اس کی سدا بے نور ہے
زیست کی آسائشوں سے دور ہے
ناتواں ہے اس لئے مقہور ہے
ناتوانی کی یہی تفسیر ہے
زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے

عیش میں کھویا ہوا سرمایہ دار
جس کی آنکھوں سے چھلکتا ہے خمار
عقل پر چھایا ہے دولت کا غبار

لوٹنا مزدور کو اس کا شعار
خواب دولت کے اسے لیل و نہار
مضطرب رکھتے ہیں بے صبر وقرار
روح اس کی طائر مردار خوار
منڈلاتا سر پہ ہے دیوانہ وار
گردش سرمایہ کی نخچیر ہے
زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے

کڑکڑاتی دھوپ میں ننگا کسان
ہل چلاتا ہے ضعیف و ناتوان
کاشتا بوتا ہے لیکن رائیگان
لوٹتے ہیں اس کا حاصل مالکان
خود نہیں ملتی ہے اس کو نیم جان
دوسروں کے سامنے رکھتا ہے خوان
ریڑھ کی ہڈی ہے لیکن نیم جان
مٹ رہا ہے اس کی ہستی کا نشان
کینہ پرور آسمان پیر ہے
زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے

اور وہ جاگیردار جونک خو
چوستا ہے جو کسانوں کا لہو
ریشمیں ملبوس میں آشفتہ رو

کر رہا ہے خدمت جام و سبو
بے نیاز انتقام ما و تو
عید نو کی ہر گھڑی ہے جستجو
لوٹتا ہے بے کسوں کی آبرو
خون دہقاں سے وہ کرتا ہے وضو
ظلم کا گہوارہ یا جاگیر ہے
زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے

اور شاعر کا دل اندوہگیں
دیکھ کر یہ حال ہوتا ہے حزیں
بے نوا مزدور کا کوئی امیں
ڈھونڈنے سے بھی یہاں ملتا نہیں
سب غلام صاحب تاج و نگیں
چوکھٹ شاہی پہ ہے سب کی جبیں
چاہئے اک انقلاب آتشیں
سرخ شعلوں سے لپٹ جائے زمیں
یہ دعائے شاعر دل گیر ہے
زندگی کی یہ بھی اک تصویر ہے

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فضا پے بہ پے آگ برسا رہی ہے
جہنم کی صورت نظر آ رہی ہے

غلامی ستم پر ستم ڈھا رہی ہے
گلستاں نذر خزاں ہو رہے ہیں
میرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں
ہواؤں میں شورش ہے طوفاں بپا ہے
پڑا سو رہا ناؤ کا ناخدا ہے
شکستہ ہے پتوار و سکاں جدا ہے
خدا کا فقط ایک ہی آسرا ہے
مقدر کو مایوس جاں رو رہے ہیں
نہ اہل وطن کو تباہی کا دکھ ہے
نہ کھوئی ہوئی بادشاہی کا دکھ ہے
نہ در در کی ٹھوکر گدائی کا دکھ ہے
نہ افلاس کا بینوائی کا دکھ ہے
پڑے خواب میں نقد جاں کھو رہے ہیں
میرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں
کسی کو نہ احساس سود و زیاں ہے
نہ ہاتھوں میں طاقت نہ منہ میں زباں ہے
جوانی میں پیری کی صورت عیاں ہے
کہ باغ وطن میں خزاں ہی خزاں ہے
مکینوں سے خالی مکاں ہو رہے ہیں
میرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں
شب و روز فاقے ہیں عریاں بدن ہے
نہ روٹی نہ کپڑا نہ گور و کفن ہے

مشقت مصیبت ہے رنج و محن ہے
نہ احساس قومی نہ ننگ وطن ہے
تباہ حال پیر و جواں ہو رہے ہیں
میرے دیس کے نوجوان سو رہے ہیں
لگی آگ چاروں طرف کو بہ کو ہے
فقط زندہ رہنے کی اک آرزو ہے
جو چاک گریباں کو کرتا رفو ہے
اک ہم ہیں کہ ہم کو نہ یہ آرزو ہے
یونہی زندگی رائیگاں کھو رہے ہیں
میرے دیس کے نوجوان سو رہے ہیں
تمہیں غم کا دکھڑا سناؤں کہاں تک
سرشکوں کے موتی بہاؤں کہاں تک
کسی کو میں غیرت دلاؤں کہاں تک
میں خونابہ دل بہاؤں کہاں تک
میرے ساتھ کون و مکاں رو رہے ہیں
میرے دیس کے نوجواں سو رہے ہیں

بولان

(مورخہ ۱۵ مارچ ۴۸ء کو بولان سے گزرتے وقت لاری میں لکھے گئے)

خشک و بے مہر چٹانوں کا تراشیدہ حصار
تپش و مہر سے جھلسی ہوئی سنگین دیوار
جھریاں چہرہ پرہول پہ ادواروں کی

گھاؤ رستے ہوئے شمشیر سے تماروں کی
پیر فرتوت کہن سالہ زابل کی طرح
بھنویں سکڑی ہوئی ابھرے ہوئے ماتھے پہ تناؤ
جیسے کوہزاد سے رستم کے بگڑ جانے پر
اس نے زابل کے بلوچوں پہ نظر ڈالی تھی
اس طرح آج بھی بولان کی گھاٹی ہر دم
اسی مشتاق مگر تند نظر سے ہم کو
دیکھتی ہے! کسی کوہزاد سے ٹکرانے کو

"اے میرے پیارے وطن تجھ کو میں چھوڑوں کیسے"
نیند آنکھوں میں نہیں سر میں ہجوم افکار
روح بے چین ہے اور دل کو نہیں صبر و قرار
سر پہ چھائے ہوئے منڈلاتے ہیں غم کے بادل
بجلیاں خرمن ہستی پہ گراتی ہیں شرار
پر میرے پیارے وطن تجھ کو میں چھوڑوں کیسے
تجھ سوا اور کہیں دل کو میں موڑوں کیسے
جانتا ہوں کہ یہاں ظلم ہے تعزیریں ہیں
بیڑیاں پاؤں میں ہیں ہاتھوں میں زنجیریں ہیں
اونچے سردار ہیں زردار ستم ڈھانے کو
اور بیچارے کماکاروں پہ شمشیریں ہیں
پر میرے پیارے وطن تجھ کو میں چھوڑوں کیسے
شیشہ دل کو میں پر دیس میں جوڑوں کیسے

جانتا ہوں کہ یہاں راج ہے زرداروں کا
حکم ہے ظلم ہے اور قہر ہے سرداروں کا
زندگی بوجھ ہے جو مجھ سے اٹھائے نہ اٹھے
خوں ہے ارزاں یہاں بیکس و ناداروں کا
پر میرے پیارے وطن تجھ کو میں چھوڑوں کیسے
دیدہ و دل کو میں پردیس میں چھوڑوں کیسے
تیری مٹی میں ملا ہے میرے اجداد کا خون
نوجوانوں کا لہو طالع برباد کا خون
نرگسی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے رنگیں آنسو
اور ناکام محبت دل ناشاد کا خون
تب مرے پیارے وطن تجھ کو میں چھوڑوں کیسے
خون اور خاک کے رشتے کو میں توڑوں کیسے
میں نہ چھوڑوں گا تجھے ظلم و ستم سے ڈر کر
میں نہ چھوڑوں گا تجھے رنج و الم سے ڈر کر
میں نہ چھوڑوں گا تجھے ہاتھوں میں سرداروں کے
میں نہ بھاگوں گا کہیں جاہ و حشم سے ڈر کر
تیری آغوش میں ہی مجھ کو فنا ہونا ہے
تیرے ماتھے سے مجھے داغ سیاہ دھونا ہے

"کیسے مانوں"

کیسے مانوں کہ میرا دیس بھی آزاد ہوا
جب کہ ہے نشہ حکومت کا وہی ساز وہی

کیسے مانوں کہ یہ اجڑا چمن آباد ہوا
جب کہ ہے زاغ و زغن کا پر پرواز وہی
کیسے مانوں کہ فرنگی کی حکومت نہ رہی
جب کہ ہے جرگہ و جرمانہ و تعزیر وہی
کیسے مانوں کہ غلامی کی مصیبت نہ رہی
بیڑیاں پاؤں میں اور ہاتھوں میں زنجیر وہی
کیسے مانوں کہ یہاں وقت ہے دلشادی کا
جبکہ کشکول لیے پھرتا ہے مجبور وہی
کیسے مانوں کہ یہ لوگوں کی حکومت ہو گی
جبکہ مسند پہ جمے بیٹھے ہیں سردار وہی
کیسے مانوں کہ یہاں ختم رعونت ہو گی
جبکہ فرعون بنے بیٹھے ہیں زردار وہی
کیسے مانوں کہ یہاں ہوگا شریعت کا نفاذ
جب کہ ساقی ہے وہی شاہد و میخانہ وہی
کیسے مانوں کہ بدل جائیں گے ان کے انداز
جب کہ ہے نعرہ لادینی و مستانہ وہی
کیسے میں قطرہ بے مایا کو دریا کہہ دوں
کیسے میں خاک کے ذرے کو ثریا کہہ دوں

"عید کا چاند"

عید کا چاند دیکھ کر اے دوست
تم مسرت کے گیت گاتے ہو

اور آئے ہو مجھ کو بہلانے
چکنی چپڑی مجھے سناتے ہو
عید کیسی؟ خوشی کہاں اے دوست
یہ تو یونہی سا اک دکھاوا ہے
اپنی ناکامیوں کے مدفن پر
حسرت و یاس کا چڑھاوا ہے
ملک و ملت کے جانثار سپوت
آج بیٹھے ہیں جیل خانوں میں
اور ہم عید کی منائیں خوشی
ہنس کے بیٹھیں نگار خانوں میں
اور وہ شمع وطن کے پروانے
جل کے شعلوں میں راکھ ہو جائیں
پھر بھی ہم شادماں ہوں جینے پر
شرم سے کیوں نہ خاک ہو جائیں
بجھ گیا دل تو زندگی کیسی
دل سے ہی زندگی عبارت ہے
چلتے پھرتے نظر جو آتے ہیں
بے حیائی کی یہ جسارت ہے
اپنی اس زندگی سے اے ہمدم
کیوں نہ چلو میں ڈوب مر جائیں
زندہ رہ کر ذلیل ہونے سے
ہے یہی خوب زود مر جائیں

"راج کرے سردار"

بچے رو رو نین گنوائیں — بوڑھے در در ٹھوکر کھائیں
چھپ چھپ مائیں نیر بہائیں — بھیک ملے نہ ادھار ...رے بھیا
راج کرے سردار

بلک بلک کر بچے روئیں — بھوکے پیٹ بجنوا سوئیں
سجنی گھر کی لاج ڈبوئیں — تو نہ بھرے زر دار ... رے بھیا
راج کرے سردار

بھوکی ننگی قوم بچاری — گھر گھر ماتم گریہ زاری
لینے کو سردار بگاری — مالی اور بجار ...رے بھیا
راج کرے سردار

گردن کاٹے جیب مروڑے — جونک بنے اور خون نچوڑے
ہڈی پسلی بیجا پھوڑے — جرگے کا ہتھیار ...رے بھیا
راج کرے سردار

جھگڑا ڈالے پریت مٹائے — بھائی کو بھائی سے کٹائے
دولت دونوں ہاتھ لٹائے — رشوت کے انبار ...رے بھیا
راج کرے سردار

پاک وطن کی ریت نیاری — بھوکی ننگی جنتا ساری
سن کر جھومیں دھن کے پجاری — روپوں کی جھنکار ...رے بھیا
راج کرے سردار

داتا اپنے راج دلارے — بے غم لیٹے پاؤں پسارے
کس کی سنیں اور کون پکارے — دھرتی کے اوتار ...رے بھیا

راج کرے سردار

"میر عبدالعزیز کرد اور عبدالصمد خان اچکزئی کی رہائی کے موقع پر"

پھر پرتو بلوچ سے روشن وطن ہے آج
پھر محو گلفشانی و شیریں سخن ہے آج
پھر متفق ہیں بادہ و پیمانہ دور میں
مست خرام پھر وہی رند کہن ہے آج
پھر خدمت وطن پہ ہوئے متفق بلوچ
پھر شادمان طبقہ اہل وطن ہے آج
پھر ضیغم بلوچ وہ عبدالعزیز کرد
مثل گلاب صدر نشین چمن ہے آج
عبدالصمد مجاہد ملت اچکزئی
پھر گلستاں میں زینت سرو سمن ہے آج
آزادی وطن کے لیے سر بکف کھڑا
ہر نوجوان اہل وطن خندہ زن ہے آج
مصروف شعر و شاعری کب تک رہوں نصیر
گلشن میں جا کے دیکھیے کیا بانکپن ہے آج

حوالہ جات

بلوچ، اختر علی خان "بلوچستان کی نامور شخصیات" رائل بک کمپنی کراچی ۱۹۹۷ء
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۹ء
قلمی دیوان از میر گل خان نصیر (غیر مطبوعہ)

آغا صادق حسین نقوی

ولادت ۲۵، دسمبر ۱۹۰۹ء وفات یکم، جولائی ۱۹۷۷ء

قیام پاکستان کے بعد بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں آغا صادق حسین نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آپ نے نہ صرف درس و تدریس کے ذریعے بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں انتہائی اہم کردار ادا کیا بلکہ بلوچستان کے نوجوانوں کی فکری تربیت کے لیے بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے ادبی اور تنقیدی محفلوں اور مشاعروں کے ذریعے نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی ایک ایسی جماعت بھی بنائی جو آج تک بلوچستان میں اردو کے فروغ کے لیے کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہے۔ آپ نے ایک استاد فن کی حیثیت سے نوجوانوں کو نہ صرف علم عروض سے آشنا کیا بلکہ طرحی مشاعروں کی روایت کو قائم رکھ کر ادبی ریاضت کے ذریعے بااستعداد شعراء کی ایک نسل بھی تیار کی، عین سلام، رفیق راز، عطا شاد اور نور محمد ہمدم آپ کے ان شاگردوں میں سے ہیں جن کے دم قدم سے آج بھی بلوچستان میں اردو شاعری کا چراغ روشن و منور ہے۔

میں وہ شاعر ہوں جو بیدار ہے بیدار کرتا ہے
جو نیکی کا محافظ ہے بدی پر وار کرتا ہے
وہ شاعر ہوں جو امکانات فردا کا اشارا ہے
میں وہ شاعر ہوں جس کو رفعتوں نے خود پکارا ہے
دماغ عیش جس کی شاعری پر چھا نہیں سکتا
ادب بہر ادب کے پیچ و خم میں آ نہیں سکتا

آغا صادق حسین اس زمانے میں بلوچستان آئے جب تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی بلوچستان میں آزادی کے پروانے علامہ اقبال کے افکار و خیالات کے تحت آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ آغا صادق حسین علامہ اقبال کے ان شیدائیوں

اور چاہنے والوں میں سے تھے جن کی روح فکر اقبال کے عشق سے سرشار تھی جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں کہ "جب سے ہوش سنبھالا ہے اقبال مست ہوں' بادہ اقبال پیتا بھی رہا ہوں اور پلاتا بھی رہا ہوں۔" اور بقول ڈاکٹر سلیم اختر " ہمارے ناقدین' دانشوروں اور اقبال شناسوں کے پہلو بہ پہلو عشاق اقبال کی صورت میں ایک اور طبقہ بھی ملتا ہے جو سر تا سر علامہ کی محبت میں سرشار' ان کے اسلوب کا قتیل اور افکار کا متوالا ہے اور بلا شبہ آغا صادق بھی قبیلہ عشاق اقبال کے ممتاز رکن ہیں۔ جو عمر بھر شعر کی صورت میں علامہ اقبال کو احساساتی سطح پر خراج عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے افکار کی تشریح کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں بروئے کار لاتے رہے۔"

آپ نے بلوچستان میں نوجوانوں کی تربیت اور فکر اقبال کو پھیلانے کے لیے نہ صرف اردو اور فارسی میں اشعار کے بلکہ نثر میں بھی اقبال کے خیالات کو عام کرنے کے لیے شب و روز کام کیا۔ قیام پاکستان سے قبل تخلیقی سطح پر میر یوسف عزیز مگسی' محمد حسین عنقا' فضل احمد غازی' میر مٹھا خان مری جیسے نوجوانوں نے بلوچستان میں اردو زبان و ادب کا جو بیج بویا تھا' آغا صادق حسین نے اس پودے کی آبیاری اور نشوونما کے لیے ایک طرف نوجوانوں کی علمی اور فنی استعداد بڑھانے پر توجہ دی تو دوسری طرف ادبی انجمنوں' تنقیدی نشستوں اور مشاعروں کے ذریعے اردو کے فروغ کا فریضہ انجام دیا اور نوجوان نسل کی فکری تربیت کی۔ آپ نے فکر اقبال کو پھیلانے میں نظم و نثر اور تحریر و تقریر کا سہارا لیا۔ آپ نے مشاعروں کے علاوہ کوئٹہ میں مرثیہ خوانی کی روایت کو بھی پروان چڑھایا' آپ کے مدحیہ اشعار اور مرثیے اردو شاعری کا گرانقدر حصہ ہیں۔ آپ کے مدحیہ اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ آپ عشق رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حب اہل بیت میں سر تا پا ڈوبے ہوئے تھے اور انہی کی سیرت و کردار کو نوجوانوں میں پھیلانا چاہتے تھے۔

آغا صادق حسین ۲۵' دسمبر ۱۹۰۹ء کو مشرقی پنجاب میں ڈیرہ سیداں میں پیدا ہوئے' اور ۱۹۴۳ء سے مستقل طور پر کوئٹہ میں آباد ہو گئے' قیام پاکستان کے بعد آپ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں فارسی پڑھانے پر مامور ہوئے اور زندگی بھر درس و تدریس کے ساتھ ساتھ

شعر و ادب کی خدمت کرتے رہے۔

آپ کے صاحبزادے ڈاکٹر نوید حسن آپ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "آغا صاحب کے جد امجد فارسی اور عربی کے جید عالم تھے۔ آپ کے والد سید خیر علی شاہ اپنے باپ کی طرح جامع کمالات تھے۔ خوش نویسی' موسیقی' تیراکی' شکار اور اسلام کی تبلیغ مشاغل میں شامل تھے۔ آغا صادق کا بچپن خالص علمی اورر مذہبی ماحول میں گزرا۔ ان کی تربیت میں والد' والدہ اور خاص طور پر ان کے ماموں سید ظفر علی شاہ کا ہاتھ تھا (جو بعد میں ان کے سسر بھی ہوئے)

تعلیم کے مدارج بتدریج طے ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اُس کے بعد کچھ عرصہ تک ملازمت اختیار کی پھر دوبارہ تعلیم شروع کی۔ ایف اے' منشی فاضل' ادیب فاضل اور بی اے پاس کیا۔ پھر کچھ عرصہ تک محکمہ انہار میں بطور سگنیلر ملازمت اختیار کی۔ آغا صاحب نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز گورنمنٹ مڈل سکول ننگل انبہاء (مشرقی پنجاب) میں بطور فارسی اور اردو استاد کیا۔ ۱۹۳۸ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایم اے فارسی کی ڈگری حاصل کی اور دو سال بعد انہیں ایم او ایل M.O.L کی ڈگری ملی جو اردو' فارسی اور عربی کے ماہر کو دی جاتی تھی۔ اس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں فارسی اور اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں سینئر لیکچرر اور پانچ سال بعد پروفیسر بنائے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے ممتحن مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں کالج کے پرنسپل بنا دیئے گئے اور ون یونٹ کے بعد کوئٹہ کے علاوہ پنجاب کے مختلف علاقوں میں بطور پرنسپل خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں محکمہ تعلیم سے فراغت حاصل کی۔

آغا صاحب کی محکمہ تعلیم سے وابستگی کم از کم تیس سال تک رہی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا اکثر قیام کوئٹہ میں ہوتا تھا انہیں اس شہر سے بہت محبت تھی سردیوں میں پنجاب کے شہر ملتان میں بھی رہا کرتے تھے۔ آغا صادق نے شعر و سخن میں قدم ۱۹۲۸ء کے قریب رکھا۔ شروع میں اپنے والد صاحب سے اصلاح لی اس کے بعد لبھو رام جوش ملسیانی جو اس دور اور علاقے کے مشہور شاعر تھے سے رابطہ قائم کیا۔

غزل کی اصلاح اور تلمذ علامہ اقبال کے ایک شاگرد میاں محمد اختر لدھیانوی سے بھی کیا اور ان کے مراسم حضرت بیخود دہلوی کے ایک شاگرد رشید حضرت شیخ عبدالواحد یکتا سے بھی رہے۔ پاکستان بننے کے بعد عبدالمجید سالک اور سر عبدالقادر سے ادبی رسم و راہ رہی۔

آغا صاحب کی ادبی خدمات میں نثر، نظم، غزل، آزاد نظم، رباعیات، مضامین سب شامل ہیں ان کی غزلوں کے چھ مجموعے منظر عام پر آئے، ان پر اقبال کا بہت اثر تھا۔ آزاد نظموں کا مجموعہ "پریشاں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ آغا صاحب کا نظریہ شاعری فن برائے فن نہ تھا بلکہ وہ فن برائے زندگی کے قائل تھے۔ اس لیے ترقی پسند تحریک سے ان کے رشتے مضبوط تھے۔ کچھ عرصہ حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری رہے لیکن بعد ازاں بزم اقبال اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ رہے۔ رائٹرز گلڈ سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ آغا صادق مرحوم کے شاگردوں میں عبدالعزیز خالد، عین سلام، رفیق راز، نور محمد ہمدم، کبیر انور جعفری، عطا شاد اور عاشور کاظمی قابل ذکر ہیں۔

یکم جولائی ۱۹۹۷ء کو آغا صادق اپنے خالق حقیقی سے جاملے ان کے شاگرد عبدالعزیز خالد نے "زر داغ دل" میں ان کی وفات پر ایک نظم لکھی جس کا آخری شعر ہے"

وارفتہ الحان انیس و اقبال
وابستہ دامان حسین ابن علی

بلوچستان میں آپ کی شاعری کا چرچا قیام پاکستان سے بھی پہلے تھا اور آپ کی نظمیں "آنسو" اور "دوشیزہ" زبان زد خاص و عام تھیں لیکن قیام پاکستان کے بعد آپ کی دو نظموں کی شہرت تو دور دور تک پھیل گئی، یہ دو نظمیں "فطرت اسلام" اور "کشمیر ہمارا" تھیں، ان نظموں میں آغا صادق نے قوم میں پھیلی ہوئی یاسیت کو رجائیت میں تبدیل کرنے کی نہایت پر اثر کوشش کی ہے۔

علامہ اقبال کے اشعار پر آپ کی تضمینیں ایک طرف تو اردو اور فارسی پر آپ کی بھرپور گرفت کی نشاندہی کرتی ہیں تو دوسری طرف آپ کے افکار و خیالات کے ساتھ آپ

کے وسیع مطالعے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ آپ نے مشرق و مغرب کے فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ دقت نظر سے کیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ قرآن و سیرت پاک پر بھی آپ کی گہری نظر تھی۔

آغا صادق حسین نظم و غزل، رباعی و قطعہ، حمد و نعت، منقبت وسلام، قصیدہ و مرثیہ، ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے، آپ نے عشقیہ اشعار بھی کہے اور قومی نظمیں بھی۔ آپ کی تیس سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے مطالعے سے آپ کے ذخیرہ الفاظ، قدرت کلام، زبان و بیاں پر بھرپور گرفت، اور عروض پر دسترس کا باآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آپ کی مطبوعہ کتب میں "بردوش ہوا" (۱۹۶۲ء)، "نوا" (۱۹۶۶ء) ۳۔"صبح صادق" (۱۹۶۶ء)، "زخمہ و ساز" (۱۹۶۸ء)، "رنگ و بو" (۱۹۶۹ء)، "آہنگ شیراز" (۱۹۷۳ء)، "شاخ طوبیٰ"، "منزو مزہ" (۱۹۶۹ء)، "چشمہ کوثر" (۱۳۹۳ھ)، "نکات فن" (۱۹۸۹ء)، کیف و کرب" "رگ سنگ"، "تلخ و شیریں"، "جلوت و خلوت"، "نکات حیات"، "حریم عصمت"، "پریشاں"، "شہر نامہ"، "طفلستان" (۱۹۷۳ء)، "تبسمات"، "راگ رنگ"، "جائزہ" "طائف امتحانی"، "جوہر عروض"، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آغا صادق حسین بلوچستان کے بسیار گو شعراء میں سے تھے، ان کے یہاں قرآنی تلمیحات، استعارات اور تشبیہات کے ساتھ ساتھ خوبصورت اور اچھی تراکیب ملتی ہیں جو ان کے وسیع مطالعے کی غماز ہیں، فن عروض پر دسترس رکھنے کی وجہ سے وہ انتہائی مشکل زمینوں میں سہولت سے شعر کہتے ہیں، ان کے کلام سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ فن برائے فن کے قائل نہیں بلکہ شاعری کو عظیم مقاصد کے حصول اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا وسیلہ سمجھتے ہیں، ان کی شاعری کے موضوعات زندگی اور اس کے فلسفہ کے موضوعات کے طرح پھیلے ہوئے ہیں، وہ حمد و نعت، منقبت و سلام، مرثیہ و قصیدہ، مثنوی و مسدس، ہر صنف سخن میں شعر کہتے تھے۔ آپ نے بچوں کے لیے انتہائی اچھی نظمیں کہی ہیں جو اردو ادب کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔ بچوں کے لیے نظموں کے علاوہ آپ نے منظوم پہیلیاں اور

منظوم لطائف بھی لکھے ہیں۔ بلوچستان میں بچوں کے ادب کے حوالے سے آپ کی تخلیقات ممتاز و منفرد ہیں۔

آغا صادق حسین نے علامہ اقبال کے اشعار پر جو تضمینیں کہی ہیں ان کے بارے میں خود فرماتے ہیں کہ " اقبال کی شاعرانہ اور مفکرانہ عظمت کا سکہ اگرچہ ارباب نظر کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قلندر اعظم کے اسرار و رموز کو ہم میں سے کتنے ہیں جو کما حقہ سمجھتے ہیں۔ ان راز ہائے سربستہ کی نقاب کشائی اور اس پیام کی شرح و تفسیر وقت کا اہم تقاضا ہے' میری تضمینیں بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

لاالہ الا اللہ

خودی کی روح رواں لاالہ الااللہ
خودی ہے تیر کماں لاالہ الااللہ
خودی کا حسن بیاں لاالہ الااللہ
"خودی کا سر نہاں لاالہ الااللہ"
خودی ہے تیغ فساں لاالہ الااللہ

زمانہ احمد بے میم کی تلاش میں ہے
جہاں نجات کی تعلیم کی تلاش میں ہے
یہ وقت عدل کی تقویم کی تلاش میں ہے
"یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے"
صنم کدہ ہے جہاں لاالہ الااللہ

ضرر رساں ہے یہ جنس شعور کا سودا
فریب دے گا تجھے مکر و زور کا سودا
غلام کو تو سمجھتا ہے نور کا سودا
"کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا"

فریب سود و زیاں لاالہ الااللہ

عیال و خویش و اقارب یہ دختر و فرزند
ترے بلند تخیل کے واسطے ہیں کمند
فنا پذیر صدا در گرہ ہیں مثل سپند
"یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند"
بتان وہم و گماں لاالہ الااللہ

بشر کی عقل ہے وہم و گماں کی زناری
طلسم بود و نبود جہاں کی زناری
کبھی زمیں کی کبھی آسماں کی زناری
"خرد ہوئی ہے زماں و مکاں کی زناری"
نہ ہے زمان و مکاں لاالہ الااللہ

نہیں ہے وقت کا آہنگ دلنشیں پابند
ہوا ہے نالہ دل نے کا بھی کبھی پابند
کہاں ہے رنگ و نسب کا اصول دیں پابند
"یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند"
بہار ہو کہ خزاں لاالہ الااللہ

خلوص و مہر کہاں دہر کے مکینوں میں
ریا کے نقش نمایاں ہیں ان جبینوں میں
چھپے ہیں مکر و دغا گرچہ ان کے سینوں میں
"اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں"
مجھے ہے حکم اذاں لاالہ الااللہ

حمد

اے کہ تری ذات ہے زندگی بخش وجود
جلوہ گہ دہر ہے تیرے کرم کی نمود
نور سے ہے رشک طور ایمن کون و مکاں
عکس پذیر جمال آئینہ ہست و بود
تیری طرف گامزن سلسلہ مرگ و زاد
تیری طرف رہنما قافلہ دیر و زود
اک روش دلبری تذکرہ برق طور
اک نظر قاہری قصہ عاد و ثمود
عرش پہ ہیں نغمہ سنج فوج ملک کے ہجوم
فرش پہ ہیں چہرہ سا جن و بشر کے جنود
فیض سے ہیں فیض یاب خشک و تر کائنات
لطف سے ہیں شاد کام پست و بلند وجود
تجھ سے ہے صورت پذیر مصلحت اختلاف
کش مکش خوب و زشت کیف و کم ہست و بود
گریہ ابر بہار خندہ برق و شرار
عرصہ لیل و نہار دورہ ء چرخ کبود
آب میں تجھ سے ہے آب آگ میں ہے التہاب
باد میں تجھ سے سفر خاک میں تجھ سے جمود
شاخ میں تجھ سے لچک، سبزے میں تجھ سے لہک
پھول میں تجھ سے مہک مرغ میں تجھ سے سرود
لالے کا دل داغ داغ گل کا جگر چاک چاک
رشتہ ء جاں تار تار جامہ تن پود پود

بخشے گئے ہیں تری بارگہ پاک سے
موج کو بے تابیاں ساحل یم کو جمود
سبزے کو شادابیاں خار کو لب تشنگی
غنچے کو خاموشیاں جوئے چمن کو سرود
تیری تمنا میں ہے عابد شب زندہ دار
وقف رکوع و سجود صرف قیام و قعود
تیرا طلب گار ہے صادق آزادہ رو
چھوڑ کے قید رسوم توڑ کے بند قیود

محمد صلی اللہ علیہ وسلم

"میم" کہتا ہے کہ محبوب کا جلوہ ہوں میں
حجت "ح" ہے کہ وحدت کی تمنا ہوں میں
دوسرا میم مصر ہے کہ مدینہ ہوں میں
دعوے "دال" کہ دلدار سراپا ہوں میں
چاند بھی دیکھ کے اس نور کو شرماتا ہے
کوئی نقطہ نہیں، بے داغ نظر آتا ہے
میم وہ میم کہ جس پر ہے محبت کا مدار
"ح" وہ "ح" جس میں ہوا حمد خدا کا اقرار
میم جس میم پہ آتا ہے ملائک کو بھی پیار
دال پر دین بھی دنیا بھی دل و جاں سے نثار
چاند بھی دیکھ کے اس نور کو شرماتا ہے
کوئی نقطہ نہیں، بے داغ نظر آتا ہے
صفت میم میں ہوں مہر بلب کیا کہئے

میم ہے مہر عجم ماہ عرب کیا کہئے
مقصد کون و مکاں مرضی رب کیا کہئے
خود خدا نے کہا لولاک تو اب کیا کہئے
چاند بھی دیکھ کے اس نور کو شرماتا ہے
کوئی نقطہ نہیں، بے داغ نظر آتا ہے

"ح" کی توصیف میں حیران ہوا جاتا ہوں
آئینہ خانہ توحید میں آ جاتا ہوں
عبد و معبود کے اسرار جو پا جاتا ہوں
راز کی بات ہے سینے میں چھپا جاتا ہوں
چاند بھی دیکھ کے اس نور کو شرماتا ہے
کوئی نقطہ نہیں، بے داغ نظر آتا ہے

سجدہ کرتے تھے فرشتے جسے وہ میم ہے یہ
رحمت خالق غفار کی تعمیم ہے یہ
عالم انفس و آفاق کی تنظیم ہے یہ
عین امید ہے یہ قاطع ہر بیم ہے یہ
چاند بھی دیکھ کے اس نور کو شرماتا ہے
کوئی نقطہ نہیں بے داغ نظر آتا ہے

دال میں دل ہے وہ عالم کے وفاداروں کا
دال پر صاد ہے خالق کے پرستاروں کا
دال دانش کدہ دانش کے طلبگاروں کا
دال درماں بھی ہے دیوانوں کے آزاروں کا
چاند بھی دیکھ کے اس نور کو شرماتا ہے

کوئی نقطہ نہیں بے داغ نظر آتا ہے

میم سے کاش مسلماں بھی مسلماں ہو جائے
ح سے الحمد کی قندیل فروزاں ہو جائے
میم سے مرکز اسلام کا ساماں ہو جائے
دال سے دہر کی تقدیر درخشاں ہو جائے
چاند بھی دیکھ کے اس نور کو شرماتا ہے
کوئی نقطہ نہیں بے داغ نظر آتا ہے

عید غدیر

آج مضمون مرا شاہد زیبائی ہے
نکتے نکتے سے عیاں مستی و رعنائی ہے
میری مخمور طبیعت کی یہ انگڑائی ہے
خم میں پنہاں تھی جو ساغر میں چھلک آئی ہے
اک نئے ڈھنگ سے الٹی ہے نقاب معنی
میرے لفظوں سے ٹپکتی ہے شراب معنی

مجھ سے کہتے ہیں یہ مجلس ہے کہ میخانہ ہے
محفل پاک میں جرات تری رندانہ ہے
میں یہ کہتا ہوں طہوری مرا پیمانہ ہے
خدمت ساقی کوثر میں یہ نذرانہ ہے
بوند بوند اس کی چراغ رہ عقبیٰ ہو گی
آدمی کیا ہے فرشتوں کو تمنا ہو گی

پی کے آیا ہوں خمستان محبت سے میں
آج سرشار ہوں صہبائے ولایت سے میں

بات کرتا ہوں تو ایماں کی حرارت سے میں
آشنا ہوں مے و ساغر کی حقیقت سے میں
یہ وہ مے ہے جسے پی کر سر منبر پہنچوں
نشہ اترے گا نہ جب تک لب کوثر پہنچوں

عترت پاک کا دیوانہ مجھے کہتے ہیں
سرخوش و بے خود و مستانہ مجھے کہتے ہیں
سالک جادہ ء رندانہ مجھے کہتے ہیں
میں وہ مے کش ہوں کہ مے خانہ مجھے کہتے ہیں
ایک دو تین پیالوں کی حقیقت کیا ہے
چودہ جب تک نہ پیوں پینے میں لذت کیا ہے

ہوئے مختار محمد کے وزیر آج کے دن
ہو گئے وارث کونین امیر آج کے دن
پھر جواں بخت ہوا عالم پیر آج کے دن
چھلکی پڑتی ہے مئے خم غدیر آج کے دن
کہوں کس منہ سے کہ پینے سے حیا آتی ہے
جام کوثر کے چھلکنے کی صدا آتی ہے

ہے بچھی اس کی خلافت کی بساط عشرت
شان میں جس کی ہے اتممت علیکم نعمت
یوم اکملت لکم جس کی نیابت کی صفت
نائب ختم رسل حجت حق کی حجت
آج من کنت کی تقریب ہے یہ نام خدا
ذرے ذرے کی زباں پر ہے علی مولی

بتلاش منزل خودگری میں یونہی نہیں تگ و تاز میں
کہ حقیقتوں کا سراغ بھی مجھے مل گیا ہے مجاز میں
مری خامشی سے تجھے گماں ہے کہ مجھ میں تاب فغاں نہیں
تجھے کیا خبر کہ مزے ہیں کیا مرے ضبط سینہ گداز میں
کبھی ہوں جو مائل التجا میں اٹھا کے ہاتھ پئے دعا
تو اسیر ہوں تری رحمتیں بھی مری کمند نیاز میں
نہ عتاب کر مرے جرم پر مری چشم تر پہ بھی اک نظر
کہ جھلک رہی ہیں ندامتیں مرے اشک عذر طراز میں
شب انتظار نے بارہا مری آرزو کا لہو پیا
میں فریب خوردہ پھر آ رہا ہوں فریب وعدہ ناز میں
میں بتا سکوں گا نہ تا سحر ہمہ تن اگرچہ زباں بنوں
کہ برنگ شمع ہے نیم جاں مرے راز زہرہ گداز میں
تری چشم ذرہ نواز نے اسے آفتاب بنا دیا
مری مشت خاک جو منتشر تھی کبھی نشیب و فراز میں

تن آسانو تمہیں کیا عقدہ مشکل کا اندازہ
دل بسمل کو ہے بیتابی بسمل کا اندازہ
مرے دل میں ابھی کچھ اور بھی گنجائش غم ہے
کیا ہے دینے والے تو نے ظرف دل کا اندازہ
مری بربادیاں؟ آبادیوں کا حال کہہ دیں گی
بجھی شمعوں سے ہو گا گرمئی محفل کا اندازہ
مجھے ماضی کی تلخ آشامیوں کی یاد کیا کم تھی

که اب ہونے لگا تلخاب مستقبل کا اندازہ

بھری ہیں دل میں کیا کیا حسرتیں دل ہی سمجھتا ہے
کسی کو ہائے کیا ہو گا کسی کے دل کا اندازہ

مصیبت میں ہی قدر عافیت معلوم ہوتی ہے
لب ساحل سے ہو سکتا نہیں ساحل کا اندازہ

مآل برق و باراں پر نظر رکھتا ہوں میں صادق
مجھے حاصل سے پہلے ہو گیا حاصل کا اندازہ

تھوڑی سی اور ہمت مردانہ دوستو
وہ سرنگوں ہے شوکت شاہانہ دوستو

لاتے ہیں مانگ مانگ کے غیروں سے جام و خم
کیا خوب ہے یہ حرمت میخانہ دوستو

اس انجمن میں شمع یقیں بجھ کے رہ گئی
دل جل رہے ہیں صورت پروانہ دوستو

افسانہ بھی وہی ابھی کردار بھی وہی
بدلی ہے صرف سرخی افسانہ دوستو

جینے کی آرزو ہے تو قیمت ادا کرو
ہے جد و جہد زیست کا پیمانہ دوستو

دیکھو تو ایک بھی نہیں اپنا کہیں جسے
سوچو تو کوئی بھی نہیں بیگانہ دوستو

صادق بھی ہے مآل تصادم کا منتظر
دنیا ادھر ادھر دل دیوانہ دوستو

کلی کلی صورت جراحت خزاں گزیدہ سماں سماں ہے
بہار کے گیت گانے والو چمن چمن کیوں دھواں دھواں ہے

کہیں یہ ترک ادب نہ کرنا غضب نہ کرنا غضب نہ کرنا
شکایت آلود لب نہ کرنا یہ زندگی ایک امتحاں ہے

گماں بھی اک صورت یقیں ہے اگر ہو شمع ضمیر روشن
نہیں جو شمع ضمیر روشن یقیں بھی اک صورت گماں ہے

جو دل کا احوال پوچھتے ہیں وہ دل کا احوال کچھ نہ پوچھیں
یہ اک شکستہ سا ہے سفینہ جو بحر مواج پر رواں ہے

جناب واعظ سے کوئی اے دل کہے کہ ان مشوروں سے حاصل
جمی ہوئی ہے جنوں کی محفل یہاں مجال خرد کہاں ہے

بہت ہیں گردش میں جام ساقی مگر یہ کیا اہتمام ساقی
جو تشنہ لب تھا وہ تشنہ لب ہے جو نیم جان تھا وہ نیم جاں ہے

بہت ہیں احسان ہمدمی کے فریب کھائے ہیں دوستی کے
ہمیں خبر ہی نہ تھی یہ صادق کہ اس زمیں پر بھی آسماں ہے

آنسو

بزم مستی میں ہزاروں دل ہیں میخانے مرے
میں شراب درد ہوں آنکھیں ہیں پیمانے مرے

رونق بزم الم ہوں ترجمان غم ہوں میں
شمع حرماں ہوں چراغ محفل ماتم ہوں میں

محفل عیش و طرب میں بار مل سکتا نہیں
آہ وہ چاک جراحت ہوں کہ سل سکتا نہیں

بے کسی کا ماتمی ہوں، حسرتوں کا نوحہ گر
میرے آئینے میں خون آرزو ہے سربسر
درد سا جب اٹھتا ہے آنکھوں میں بھر آتا ہوں میں
مثل شبنم دیدہ تر سے ٹپک جاتا ہوں میں
چشمہ خون جگر سے ہے مری * نشوونما
جل گیا جب خون آہوں سے تو آنسو بن گیا
برق خرمن سوز ہیں میری یہ آتش باریاں
دیکھنا دامن سے ہیں لپٹی ہوئی چنگاریاں
دل جلا ہوں دل جلوں کی داستاں کہتا ہوں میں
صورت سیماب آتش زیر پا رہتا ہوں میں
مل نہیں سکتا کہیں آرام انگاروں پہ ہوں
دل سے آیا آنکھ میں آنکھوں سے رخساروں پہ ہوں
دفعتہً رخسار سے دامن پہ بہ جاتا ہوں
ایک داغ نامرادی بن کے رہ جاتا ہوں میں
گوہر پرآب ہوں میں تیغ جوہر دار ہوں
آبروئے چشم تر ہوں غازہ رخسار ہوں
جب کسی مظلوم کی آنکھوں میں آجاتا ہوں میں
درد کی تصویر دنیا کو دکھا جاتا ہوں میں

بادام کے درخت

سر سبز پر بہار ہیں بادام کے درخت
بولان کا سنگھار ہیں بادام کے درخت

ہر شاخ برگ و بار سے یوں ہے لدی ہوئی
گویا کہ تاجدار ہیں بادام کے درخت
پیتے ہیں دودھ اور اگلتے بھی دودھ ہیں
کیا طفل شیر خوار ہیں بادام کے درخت
فطرت جھلک رہی ہے نئے رنگ و روپ میں
آئینہ بہار ہیں بادام کے درخت
سر سبز چوٹیوں پہ یہ کرنیں چمک اٹھیں
یا سرو زر نگار ہیں بادام کے درخت
اس وادی حسیں کو لگے ان سے چار چاند
تزئین کوہسار ہیں بادام کے درخت
اس خطہ کہن کی حفاظت کے واسطے
شمشیر آبدار ہیں بادام کے درخت
پر مغز، دلفریب، طرب زا، نظر نواز
قدرت کے شاہکار ہیں بادام کے درخت

انگور کی بیلیں

کیا حسن کی تصویر ہیں انگور کی بیلیں
بادام کی ہمشیر ہیں انگور کی بیلیں
نوخیز، دل آویز، لچکدار، ملائم
پر شیرہ و پر شیر ہیں انگور کی بیلیں
بل کھا کے لچکتی ہیں سمٹ کر ہیں لپٹتی
گویا کوئی زنجیر ہیں انگور کی بیلیں

کرنوں کی طرح شوخ ہیں انگور کے خوشے
خورشید کی تنویر ہیں انگور کی بیلیں

خوشے یہ سنہری ہیں کہ سونے کی ہیں ڈلیاں
مٹی میں بھی اکسیر ہیں انگور کی بیلیں

ہلکی سی یہ سبزی ہے کہ دل کھینچ رہی ہے
جاں پرور و دلگیر ہیں انگور کی بیلیں

معلوم یہ ہوتا ہے کہ لب کھول رہی ہیں
آمادہ تقریر ہیں انگور کی بیلیں

اس خطہ ء دلکش میں ہیں قدرت کا عطیہ
بولان کی تقدیر ہیں انگور کی بیلیں

حوالہ جات

۱۔ کوثر' ڈاکٹر انعام الحق ' بلوچستان میں اردو' مقتدرہ اردو زبان اسلام آباد
۲۔ آغا صادق حسین' چشمہ کوثر' گورا پبلشرز لاہور' ۱۹۹۴ء
۳۔ آغا صادق حسین' "رنگ و بو" مکتبہ آغا صادق کوئٹہ' ۱۹۶۹ء
۴۔ آغا صادق حسین' "ید بیضاء" مکتبہ آغا صادق کوئٹہ' ۱۹۷۱ء
۵۔ آغا صادق حسین' "غلستان" مکتبہ آغا صادق کوئٹہ' ۱۹۷۳ء
۶۔ دھنک مرتبہ مرکز ادب کوئٹہ قلات پبلشرز مستونگ' ۱۹۶۴ء
۷۔ حسن' ڈاکٹر نوید حسن اقبال شناسی اور آغا صادق سنگ میل لاہور' ۱۹۹۵ء
۸۔ آغا صادق حسین نکات فن انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر لندن ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ

ولادت ۱۹۱۴ء وفات ۱۹۶۷ء

بلوچستان میں اردو کے فروغ اور ادبی ذوق کی ترویج میں طرحی مشاعروں اور گھروں میں ہونے والی ان ادبی محفلوں اور شعری نشستوں کا بھی بڑا عمل دخل اور حصہ ہے جن میں ادیب اور شاعر مل بیٹھتے۔ یہ شعری نشستیں عموماً" کسی صاحب حیثیت ادب دوست شخص کے گھر پر منعقد ہوا کرتی تھیں جن میں مقامی شعراء کے علاوہ باہر سے آنے والے مہمان شاعروں کی خاطر مدارت کا بھی خوب انتظام ہوا کرتا تھا' قیام پاکستان کے بعد کوئٹہ میں ایسی نشستوں کے اہتمام اور انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے اور مہمانوں کی خدمت میں خوشدلی اور دریا دلی کیساتھ پیش پیش رہنے والوں میں ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ سرفہرست تھے۔

ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ ۱۹۱۴ء میں کوئٹہ کے نواحی گاؤں چشمہ اچوزئی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد لعل محمد خان زمیندار تھے جو زمینداری کے علاوہ شکار کے بہت شوقین تھے۔ ڈاکٹر عبدالحمید کاکڑ نے ابتدائی تعلیم کوئٹہ کے معروف تعلیمی ادارے سنڈیمن ہائی اسکول سے حاصل کی اور میٹرک کا امتحان پنجاب سے پاس کرنے کے بعد اندور میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔

آپ کا مجموعہ کلام "خار گل" کے نام سے آپ کی وفات کے بعد بزم ثقافت کوئٹہ کے زیر اہتمام شائع ہوا جس میں اردو کے علاوہ ان کے پشتو اشعار بھی ہیں۔ خار گل کا تعارف معروف شاعر اثر جلیلی نے رقم کیا جس میں وہ لکھتے ہیں کہ " ڈاکٹر عبدالحمید مرحوم کی شخصیت اس علاقہ کی ادبی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے'..... وہ پشتو اور اردو میں یکساں روانی سے شعر کہتے تھے اور اردو کی شاعرانہ روایات سے اس قدر مانوس تھے کہ ان کے لب و لہجہ سے کوئی اجنبیت نہیں ٹپکتی ہے' وہ اپنی زبان اور اپنے بیان کے اعتبار سے قطعی کلاسیکی شاعری کا نمونہ ہیں۔ ان کے شعروں میں آپ کو ایک محسوس قسم کی غنائیت

ملے گی‘ یہ غالباً" فن موسیقی سے ان کی دلچسپی کا نتیجہ ہے وہ موسیقی سے فنی طور پر کماحقہ‘ واقف تھے‘ وہ مشاعروں میں اپنی غزلیں ترنم سے پڑھتے تھے... ان کے اشعار سادہ ہوتے ہیں اور یہ سادگی شعر کی غنائی قدروں کو اور بھی اجاگر کرتی ہے۔"

"خار گل" کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بیشتر غزلیں طرحی مشاعروں کا حاصل ہیں۔ موضوعات کے حوالے سے بھی ڈاکٹر صاحب حسن و عشق کے معاملات‘ محبوب کے سراپے اور ہجر و وصال سے آگے نہیں بڑھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں مصرعوں کی روانی‘ بیساختگی اور نغمگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اردو میں اظہار پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔

کہتے ہیں کسے حسن کرم یاد رہیگا
ظالم ترا بخشا ہوا غم یاد رہیگا
کیونکر میں کہوں اپنی وفا یاد رہیگی
لیکن ترا انداز ستم یاد رہیگا
ہر روز مجھے وعدہ فردا پہ جو ٹالا
اے وعدہ شکن تیری قسم یاد رہیگا
وہ شوخ جوانی وہ ترا روٹھنا مجھ سے
ابرو پہ وہ بل زلف کا خم یاد رہیگا
کیا گذری گزر گاہ حسیناں میں نہ پوچھو
تازیست یہ افسانہ غم یاد رہیگا
کیا دن تھے کہ سر اپنا جھکا اپنے ہی گھر میں
کیونکر نہ ترا نقش قدم یاد رہیگا
یک قالب و دو جاں کی طرح بھی رہے برسوں
ہم تم بھی رہے برسوں بہم یاد رہیگا

ان دونوں گھروں نے مجھے گھر تیرا دکھایا
یہ تذکرہ دیر و حرم یاد رہیگا
اب کیا کہیں دل ہاتھ سے جاتا رہا کیونکر
یہ حادثہ کوئے صنم یاد رہیگا
ہنستے ہوئے ہر رات حمید آپ کا آنا
کلیوں کے تبسم کی قسم یاد رہیگا

بات کل کی نہیں‘ کل ہو گا جو ایجاں ہو گا
آج منہ اپنا دکھا دو گے تو احساں ہو گا
یونہی کب ساغر لبریز چھلک جاتا ہے
کسی میخوار کا غم سینے میں پنہاں ہو گا
جب بہار آئیگی اچھلے گا جنوں بھی اے دوست
پھر نہ دامن ہی رہے گا نہ گریباں ہو گا
یاد جب آئے گی تڑپائے گی بجلی کی طرح
ابر بھی ساتھ مرے راتوں کو گریاں ہو گا
اس رخ صاف کا نظارہ بہت مشکل ہے
سامنے آئے گا جو دیدہ حیراں ہو گا
بیٹھتے اٹھتے جو مژگاں کا خیال آتا ہے
دوستو دل کی جگہ سینے میں پیکاں ہو گا

دوستو عشق بجز جوش جنوں ہو تو غلط
بے اثر چشم فسوں گر کا فسوں ہو تو غلط

عشق کی چوٹ کا اظہار جو یوں ہو تو غلط
آنکھ سے شام و سحر بارش خوں ہو تو غلط

درد دل باعث رسوائی جو یوں ہو تو غلط
ان پہ ظاہر یہ مرا حال زبوں ہو تو غلط

بستہ درد محبت ہے ازل کے دن سے
دل بیتاب کو ارمان سکوں ہو تو غلط

کنج تنہائی میں اک تیرے تصور کے سوا
غم اگر ہو تو غلط، سوز دروں ہو تو غلط

تیری سرکار سے بڑھ کر کوئی سرکار نہیں
اپنا سر اور کسی در پہ نگوں ہو تو غلط

اپنے انداز سے باہر نہیں درد فرقت
کم اگر ہو تو غلط اور فزوں ہو تو غلط

صحن گلشن کی تمنا ہو بیابانوں میں
یہ اگر شیوہ ارباب جنوں ہو تو غلط

آپ آئیں تو اٹھے ہاتھ گریباں کی طرف
سامنے سب کے عیاں جوش جنوں ہو تو غلط

میرے ہر تار گریباں پہ ہے احساں ان کا
آمد موسم گل وجہ جنوں ہو تو غلط

اے حمید آپ شب غم سے کہاں واقف ہیں
کسی کروٹ بھی میسر جو سکوں ہو تو غلط

طلب دل کی نظر کی تشنگی دیکھی نہیں جاتی

ترے قربان مجھ سے یہ کمی دیکھی نہیں جاتی

ترے دیوانگان عشق کی تقلید مشکل ہے
جگر افگار پھولوں کی ہنسی دیکھی نہیں جاتی

انہیں کے غم کے صدقے میں سکون قلب ملتا ہے
انہیں سے میری طرز میکشی دیکھی نہیں جاتی

بغیر یار سوئے گلستاں جایا نہیں جاتا
بغیر یار پھولوں کی ہنسی دیکھی نہیں جاتی

بہار آئی ہے تم آؤ تو شاید وہ بھی کھل اٹھے
گلستاں میں کلی کی بے کلی دیکھی نہیں جاتی

نہ گلشن دل کو راس آیا نہ صحرا دل کو راس آیا
دل ویران کی ویرانگی دیکھی نہیں جاتی

محبت کی قسم بدلو ذرا چشم تغافل کو
کہ اب ہم سے تمہاری بے رخی دیکھی نہیں جاتی

نہ یاران طریقت ہیں نہ ساقی ہے نہ میخانہ
حمید ایسے میں صورت ابر کی دیکھی نہیں جاتی

اب تم سے دوبارہ ملنے کا معلوم ہوا امکان گیا
تم منہ سے کہو یا اب نہ کہو مطلب میں تمہارا جان گیا

میں تم سے ملوں گا ناممکن، تم مجھ سے ملو گے مشکل ہے
ملنے کا جو تجھ سے ارماں تھا اب دل سے وہ ارمان گیا

تسلیم کہ تجھ کو جانا تھا، معلوم کہ تجھ کو جانا تھا
یہ ظلم مگر کیا تو نے کیا اک دوست کی لے کر جان گیا

وہ دور جو تھا خوشحالی کا وہ دور دوبارہ آئے گا
اس دور کی اب امید نہیں، اس دور کا اب امکان گیا
حالات نے ظاہر کر ہی دیا کچھ تم کو وفا سے کام نہیں
انکار میں جس کا کرتا تھا وہ بات مرا دل مان گیا
بے حال حمید مضطر ہوں وہ حال مرا جس حال میں تھا
اس حال میں مجھ کو چھوڑ گیا اب لطف کا سب سامان گیا

کاکڑ، ڈاکٹر عبدالحمید، "خار گل" بزم ثقافت کوئٹہ ۱۹۶۷ء
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۶ء
"دھنک" مرکز ادب، قلات پبلشرز، مستونگ ۱۹۶۳ء

محشر رسول نگری

ولادت ۲۹، مارچ ۱۹۱۶ء   وفات ۲۴، دسمبر ۱۹۸۴ء

بلوچستان میں شاعری کے حوالے سے محشر رسول نگری کا نام نامی دنیائے اردو میں خورشید کی طرح روشن و تابندہ ہے۔ محشر رسول نگری نے بلوچستان میں اردو شاعری کی قدیم روایتوں اور اصناف کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اپنے فکر خوش اور دل باصفا سے اس میں وہ گلکاریاں کی ہیں جو بلوچستان ہی نہیں جہان اردو میں بھی ایک یادگار ہیں۔ ایک باعمل صوفی ہونے کی وجہ سے آپ نے اصلاح احوال کے لیے علامہ اقبال کے پیر و مرشد مولانا روم کی تقلید میں اشعار کو ذریعہ اظہار بنا کر علامہ اقبال کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے نہ صرف اردو میں مثنوی کو نئی زندگی دی بلکہ اس کے ذریعے قرآنی افکار اور سیرت پاک کو پھیلانے کا کام لیا۔

ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے بعد سر سید احمد خان اور مولانا حالی نے اردو میں مثنوی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں، مولانا حالی نے خود مثنویاں لکھیں اور سر سید احمد خان کے زیر اثر مولانا محمد حسین آزاد نے بھی مثنویاں لکھیں، خود علامہ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار کو مثنویوں کے ذریعے پیش کیا۔ سید کی لوح، انسان اور بزم قدرت، رخصت اے بزم جہاں، کے علاوہ ساقی نامہ اردو زبان کی نہایت اچھی مثنویاں ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے بھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن شہرت و قبولیت کے حوالے سے ابوالاثر حفیظ جالندھری کی مثنوی مد و جزر اسلام جو "شاہنامہ اسلام" کے نام سے مشہور ہے، ہمارے عہد کی طویل ترین مثنوی ہے۔ محشر رسول نگری کی مثنوی "صحیفہ فطرت" ہمارے عہد میں اردو کی کہی ہوئی آخری مثنوی ہے۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر صحیفہ فطرت کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ "محشر رسول نگری ان عصری اہل فن میں سے ہیں جن کا فن زمانہ ایک مدت بعد جانتا اور تسلیم کرتا ہے، ان کا آخری شہکار مثنوی "صحیفہ فطرت" ہے جس

کی امتیازی خوبی اس کی "روح عشق" ہے جو اس کی حیات جاوید کی ضامن ہے۔"

آپ ایک صوفی منش شخص تھے اور اس کی وجہ ممتاز مفتی اپنی کتاب "الکھ نگری" میں بجا طور پر بیان کرتے ہیں کہ "محشر صاحب کے آباواجداد خود برگزیدہ لوگوں میں سے تھے لہٰذا طلب حق کی تڑپ محشر نے ورثہ میں پائی" اور بقول ڈاکٹر نصیر احمد ناصر "محشر اہل عشق و وفا، صاحب جذب و مست اور فنا فی الذات تھے، ان کی شخصیت حلم و انکسار، تواضع و مروت اور حسن خلق سے مزین تھی۔ اس لیے اس میں بلا کی کشش و جاذبیت تھی، گفتگو سادہ، رویہ دلنواز اور کردار قلندرانہ تھا۔ لیکن اہل علم و نظر سے محو تکلم ہوتے تو معرفت و حکمت کے دریا بہاتے، عقل حیران ہوتی کہ اس مجذوب شاعر میں کوئی حکیم و عارف بول رہا ہے۔ رہ نوردان شوق سمجھ لیتے کہ محشر میں روح عشق بول رہی ہے۔ بول شیریں و دلنشین اور فکر انگیز و عشق آفریں ہوتے۔" محشر رسول نگری کی شاعری نہ صرف خطہ بلوچستان بلکہ اردو شاعری کا قابل فخر سرمایہ ہے۔

محشر رسول نگری کا پورا نام نثار احمد جبکہ محشر آپ کا تخلص ہے اور رسول اللہ کی نگری کے حوالے سے رسول نگری۔ آپ ۲۹ مارچ ۱۹۱۶ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد میاں الٰہی بخش ۱۸۹۰ء میں پنجاب کے ضلع گجرات کے ایک گاؤں رسول نگر سے بلوچستان آ کر بس گئے تھے۔ محشر صاحب نے ۱۹۳۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال سینئر انگلش ٹیچر کے طور پر محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔ آپ نے زمانہ طالب علمی سے شعرگوئی کا آغاز کر دیا تھا اور مدحت زبیری نامی ایک شخص سے فن عروض کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کی شاعری ابتداء سے ہی تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی، ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی لکھتے ہیں کہ "مئی ۱۹۳۱ء میں "بزم اقبال" کی ایک مجلس میں ان کی غزل سنی، تو اس میں کلام اقبال سے آگاہی اور اسی اسلوب میں شعرگوئی کی استعداد کا اندازا لگا لیا تھا۔"

محشر صاحب کی مطبوعہ کتب میں "تیغ و قرآن" "نظام نو" "مثنوی صحیفہ فطرت" حصہ اول (۱۹۵۷ء) شمشاد خراماں" (۱۹۷۸ء) "فخر کونین" حصہ اول (۱۹۶۲ء) اور حصہ دویم

(جولائی، ۱۹۶۴ء) اور فخر کونین حصہ سوم ہیں۔ آپ ۲۴، دسمبر ۱۹۸۴ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

محشر نے تاریخ اسلام کو قرآنی آیات اور سیرت پاک کے ساتھ نہایت ہی عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ "انہوں نے مسائل کی توضیح کے لیے طبع زاد حکایات کی بجائے تاریخ اسلام کے مستند واقعات کو قلم بند کیا"۔

دشوار ہے یہ مرحلہ نعت کس قدر
میں چل رہا ہوں تیغ برہنہ کی دھار پر
سرمست ہوں اگرچہ فروغ نشاط سے
رکھتا ہوں ایک ایک قدم احتیاط سے

آپ نے اپنی پوری زندگی اسلام کے آفاقی پیغام کو حیات طیبہ کی روشنی میں پھیلانے کے لیے وقف کر دی تھی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سیرت پاک کو منظوم انداز میں "فخر کونین" کے نام سے تین جلدوں میں مکمل کر کے پیش کرنے کی سعادت بھی آپ کو حاصل ہے۔ "فخر کونین" کا پہلا حصہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پیدائش سے ہجرت مدینہ تک کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور مسدس میں ہے۔ فخر کونین کے پہلے حصے میں اشعار کی تعداد ایک ہزار چار سو ستر (۱۴۷۰) ہے جبکہ دوسرے حصے میں ہجرت سے فتح مکہ کی تاریخ کی تفصیل بیان ہے۔ اس حصے میں اشعار کی تعداد ایک ہزار سات سو پچیس ہے۔ تیسرا حصہ فتح مکہ سے حضور صلی اللہ و علیہ و آلہ وسلم کے وصال تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ ان تینوں حصوں کو یکجا کر کے دوبارہ شائع کیا گیا تھا جو اب نایاب ہے۔

"فخر کونین" کے پہلے حصے کا دیباچہ مختار صدیقی، دوسرے حصے کا دیباچہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے "فخر کونین" کے بارے میں لکھا ہے کہ "کسی جگہ بھی شاعرانہ مبالغے سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ اس انداز کی نظموں کی ابتدا شبلی نعمانی نے کی تھی مگر ان کے بعد کیفی چڑیا کوٹی اور محمود اسرائیل وغیرہ نے بھی اس

روایت کو قائم رکھا۔ حفیظ جالندھری کا "شاہنامہ اسلام" اس سلسلے کی ایک بڑی مربوط اور کامیاب کوشش ہے۔ محشر رسول نگری نے اس انداز میں تازگی کو قائم رکھتے ہوئے بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔"

"فخر کونین" کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں کہ "حالی کے زیر اثر اقبال نے ہمالہ' تصویر درد' شمع و شاعر' خضر راہ' طلوع اسلام' شکوہ و جواب جیسی عمدہ نظمیں اردو شاعری کو دیں اور مسدس کو اردو شعرا کی توجہ کا مرکز بنا گئے۔ اس توجہ کے نشانات آپ کو اکثر جگہ ملیں گے لیکن اس سلسلے میں جسے نشان منزل اور منزل دونوں کا نام دے سکتے ہیں وہ اقبال ہی کے مکتبہ فکر کے ایک خوش فکر شاعر محشر رسول نگری کی طویل نظم "فخر کونین" ہے۔

صحت واقعات اور تاریخی ربط کے لحاظ سے اسے منظوم سیرت النبی کا نام دیں تو بے جا نہ ہو گا۔ ہر واقعہ اور ہر خیال کے سلسلے میں شاعر نے قرآن و حدیث اور سیر و تواریخ کے مستند ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔ شاعرانہ قادر الکلامی کا یہ عالم ہے کہ آیات قرآنی' احادیث نبوی اور اقوال صحابہ کرام کے بعض فقرے "تلمیحاً" اس خوبصورتی سے نظم میں داخل ہو گئے ہیں گویا ان کا تعلق عربی سے نہیں' اردو کے روز مرہ سے ہے۔" (فخر کونین' ۱۹۶۳ء' ۱۴-۱۵)

سید اقبال عظیم نے "فخر کونین" کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے کہ "سیرت رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جس پہلو کو مصنف نے نمایاں طور پر ابھارا ہے وہ حضور کا رحمت عالم ہونا ہے' اور ابتدا سے انتہا تک مصنف نے اپنے اس مقصد کو فراموش نہیں کیا۔ واقعات کی تاریخی ترتیب اور سوانح کی مربوط تدوین سے اس نظم کو ایک فائدہ یہ بھی پہنچا ہے کہ نظم میں تسلسل بیان کے لطف کے ساتھ ساتھ وہ تاثر بھی پیدا ہو گیا ہے جس کے بغیر کوئی شعری تخلیق قابل توجہ نہیں ٹھہر سکتی۔ اس کے علاوہ شاعر کو فن اور اظہار خیال پر بھی پوری قدرت حاصل ہے۔" مولانا ماہر القادری کے مطابق "عقیدت و محبت کا دریا ہے جو اس مسدس میں ہلکورے لے رہا ہے' انداز بیان شگفتہ' فکر سلجھی ہوئی

اور تخیل پاکیزہ۔ بعض مقامات پر تو شاعری اپنے عروج کمال پر پہنچ گئی ہے۔" اردو کے معروف شاعر احمد ندیم قاسمی نے محشر صاحب کی کتاب پر کیا خوب تبصرہ کیا ہے کہ "میری رائے میں محشر صاحب کی مثنوی "صحیفہ فطرت" اردو شاعری میں ایک بے بدل اضافہ ہے کہ اس کی وجہ سے شاعری کے آفاق میں توسیع ہوئی ہے اور علم و عرفان کے نکات کو سادہ' سلیس اور رواں اور پختہ انداز میں بیان کرنے کی ایک ایسی روایت قائم ہوئی ہے جس کے امکانات بے شمار اور بے حساب ہیں۔"

اخلاق الٰہی

اے مسلماں! یہ سمجھنے کی ہے بات
ہیں صفات ذات ہی اخلاق ذات
مومن و قدوس و رحمن و رحیم
قادر و قیوم و جبار و حکیم
ذرہ خاکی سے تا خورشید و ماہ
آسماں سے تا گل و خار و گیاہ
کارفرمائی صفات حق کی ہے
جلوہ آرائی صفات حق کی ہے
تو بھی اپنے دل میں پیدا کر انہیں
پھر جہاں میں کارفرما کر انہیں
تو خلیفہ ہے جہاں کا اے ندیم
ہے کہاں غافل تری عقل سلیم
نظم و ضبط بحر و بر کے واسطے
انضباط خشک و تر کے واسطے
تجھ کو ہونا چاہیے مولا صفات
کر سکے تا اہتمام کائنات

"قادر"

شان حق تجھ سے اگر ظاہر نہ ہو
تو عناصر پر اگر قادر نہ ہو
اہل باطل کو جھکا سکتا نہیں
مرکز وحدت پہ لا سکتا نہیں

"مومن"

ہو اگر برپا فساد بحر و بر
بند ہوں سب امن کی راہیں اگر
اے اسیر ممکنات شش جہات
ہوں اگر تجھ میں نہ مومن کی صفات
کون دے گا بے نواؤں کو اماں
کون بخشے گا انہیں تاب و تواں

"قیوم"

گو فنا انجام ہے یہ کائنات
شان قیومی سے ہے اس کو ثبات
جادہ ہائے عدل و حق پر اے ندیم
تو اگر خود ہی نہیں ہے مستقیم
دوسروں کو تیرا ضعف بندگی
حق پہ قائم کر نہیں سکتا کبھی

"رحمن و رحیم"

صاحب جبروت و عظمت ہے خدا
چاہے تو پل میں کرے سب کچھ فنا
پھر بھی وہ رحمن ہے غفار ہے

عفو کا مالک ہے اور ستار ہے
اس کی رحمت ہے محیط بیکراں
اس کی رحمت ہے بہار جاوداں
صاحب رحمت نہ ہوتا وہ اگر
عافیت ملتی نہ ہم کو لمحہ بھر
ہم خطا کار اور وہ ستارالعیوب
ہم گنہ گار اور وہ غفار الذنوب
تو بھی احساس کرم بیدار کر
خار زار دہر کو گل زار کر
جس سے ظاہر شان رحمانی نہیں
وہ سزاوار جہاں بانی نہیں

"حکیم"

صاحب حکمت ہے ذات ذوالجلال
ذرے ذرے سے عیاں اس کا کمال
کون سی شے پر اسے قدرت نہیں
پھر بھی اس کا امر بے حکمت نہیں
حکمت مولا کے صدقے جائیے
امر حق میں غور تو فرمائیے
کس طرح اک بندہ بے داد نے
اک شہنشاہ ستم ایجاد نے
موسی عمراں کو پالا شوق سے
جان بے ساماں کو پالا شوق سے
خود ہی اٹھ کر سایہ داماں کیا

آپ اپنی موت کا ساماں کیا
جوہر حکمت ترا صیقل نہیں
ورنہ چھا جاتا جہاں پر تیرا دیں
ہے کوئی جو یہ صفت پیدا کرے
انقلاب دین حق برپا کرے

"قدوس"

ذات مولا پاک ہے قدوس ہے
اک وہی تو حافظ ناموس ہے
اب کہاں وہ عفت قلب و نظر
قرن اول میں رہی جو کارگر
جس نے اونچا کر دیا حق کا علم
دوست دشمن جس کی کھاتے تھے قسم
مرد ہیں تو صاحب عفت نہیں
عورتوں میں جوہر عصمت نہیں
پردہ شرم و حیا اب چاک ہے
دیدہ نظارہ جو بیباک ہے
اب کہاں پابندی "غض بصر"
جس کو دیکھو ہے وہ آوارہ نظر
ضبط نفس اک کوشش فرسودہ ہے
"پیر زن" بھی اب ہوس آلودہ ہے
جس کے باعث عام ہے زور و زنا
انتہا ہے، انتہا ہے، انتہا
گھٹ کے رہ جائے نہ کیوں جوش نمو

ہوں نہ کیونکر نوجواں پھر زرد رو
کوئی مرد آہنی ان میں نہیں
جذبہ شیر افگنی ان میں نہیں
سلب ان کی طاقت اعصاب ہے
اور بدن میں رعشہ سیماب ہے
صحت قومی ہو جب اتنی خراب
سرد ہو پھر کیوں نہ جوش انقلاب
اے جواں تجھ میں صلابت کیوں نہیں
اے عزیز احساس غیرت کیوں نہیں
تیرا دل کیوں جوش میں آتا نہیں
کفر و باطل سے تو ٹکراتا نہیں
پاک فطرت صورت "قدوس" بن
پردہ دار عزت و ناموس بن
تاکہ تیری قوتیں بیدار ہوں
غیر حق سے بر سر پیکار ہوں
نفس کو قابو میں رکھ اور تن کے رہ
ان "زلیخاؤں" میں یوسف بن کے رہ

"جبار"

گرچہ راہ زیست ناہموار ہے
مالک ارض سما جبار ہے
ہر خرابی کو وہ کر دیتا ہے دور
شان جباری کا ہے پیہم ظہور
ورنہ نقش اپنا ابھر سکتا نہیں

یہ بگڑ کر پھر سنور سکتا نہیں
تیرا کام اعمال کی تدبیر ہے
تیری طاعت کی غرض تعمیر ہے
تو اگر تخریب میں ہے مبتلا
اپنا جوہر تو نے ضائع کر دیا
کس طرح محکم تری تعمیر ہو
جب نہ پہلے فکر کی تطہیر ہو
ذوق جباری کو پھر بیدار کر
جادہ فکر و عمل ہموار کر
جام حق سے روح کو سرشار کر
خارزاروں کو گل و گلزار کر
جس کے دل میں ذوق جباری نہیں
اس میں کچھ بھی بوئے دینداری نہیں

حدیث عشق

لب پہ پھر عشق و رضا کا ذکر ہے
عاشقان مصطفےٰ کا ذکر ہے
مر کے جو عشق نبی میں جی گئے
چاک دل، تار نظر سے سی گئے
اک صحابی جان نثار مصطفےٰ
اہل دل، پروانہ شمع ہدیٰ
تھا یگانہ رسم و راہ عشق میں
جب بھی آتا بارگاہ عشق میں

روئے انور پر جما لیتا نظر
ٹکٹکی باندھے ہوئے تکتا ادھر
دل نثار لذت گفتار دوست
جاں فدائے مستی دیدار دوست
مسکرا کر ایک دن سرکار نے
اہل دل کے مرکز دیدار نے
اس سے فرمایا کہ ہاں میں بھی سنوں
تم مجھے یوں دیکھتے رہتے ہو کیوں
سن کے یہ کہنے لگا وہ جاں نثار
مجھ کو رکھتا ہے خیال اک بے قرار
اے شہنشاہ زمن، خیرالانام
آپ کا ہے ارفع و اعلیٰ مقام
کب پس مرگ آئے گا موقع یہ ہاتھ
آپ ہوں گے خلد میں نبیوں کے ساتھ
آپ تک میری رسائی پھر کہاں
کیا کروں گا میں پئے تسکین جاں
پا سکے گا مجھ سا نادار و غریب
باغ رضواں میں کہاں قرب حبیب
پھر اسی دنیائے فانی میں نہ کیوں
دولت دیدار دلبر لوٹ لوں
سن کے یہ "حسن ازل" بھی جھوم اٹھا
قدسیان عرش کو وجد آ گیا
کیفیت حضرت پہ طاری ہو گئی

آیت حق لب پہ جاری ہو گئی
"جو اطاعت کیش ہے وہ بالیقیں
ہو گا عقبیٰ میں نبی کا ہم نشیں"
حق کا یہ مژدہ سنا کر پھر کہا
خوب سن لو طالبان باصفا
"جو ہمارے عشق سے ہے بہرہ یاب
خلد میں ہو گا ہمارا ہمرکاب
عشق ایماں، عشق عرفاں، عشق دین
عشق قرآں، عشق فرقان مبین
عاشق اول فقط ذات نبی
جس پہ حق نے ختم کی پیغمبری
عشق جس کا عین ذات ہے
ذات جس کی فخر موجودات ہے
عشق کیا ہے، اتباع مصطفےٰ
عشق کیا ہے، صبر و تسلیم و رضا
عشق کیا ہے، انکساری سروری
سوز صدیقی و زور حیدری
عشق ہے فاروق اعظم کا ضمیر
عشق ہے سرمستی سلمان پیر
عشق ہے وہ قوت آفاق گیر
ہیچ جس کے سامنے سلطان و میر
کار زار زیست میں شبیر عشق
قوت یک ضرب عالمگیر عشق

عشق ہے آشوب سیل بے پناہ
سامنے جس کے یہ دنیا مشت کاہ
عشق ہے شیرازہ بند کائنات
عشق سے ہوتی ہے تعمیر حیات
روح کو بیدار کر دیتا ہے عشق
نار کو گلزار کر دیتا ہے عشق
عشق پیدا کر کہ تو زندہ رہے
صورت خورشید تابندہ رہے
سحر باطل سے ہیں دل خوار و زبوں
عشق پیدا کر کہ ٹوٹے یہ فسوں
زیست کا عنوان ہے عشق نبی
مرد حق کی شان ہے عشق نبی

حوالہ جات

۱۔ محشر رسول نگری "صحیفہ فطرت" سجاد بہلی کیشنز کوئٹہ

۲۔ محشر رسول نگری "فخر کونین" پاکستان پریس کوئٹہ، جولائی ۱۹۶۴ء

۳۔ ممتاز مفتی "الکھ نگری" الفیصل اردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء

۴۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، "علامہ اقبال اور بلوچستان" اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۱۹۹۸ء

عبدالرحمن غور

ولادت ۱۹۲۰ء　　وفات ۷ مارچ ۱۹۸۴ء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی تاریخ میں عبدالرحمن غور کی خدمات انتہائی اہم ہیں، آپ نے ادبی کتابوں اور اخبارات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ نظم و نثر میں اپنی تخلیقات کے ذریعے یکساں طور پر بلوچستان میں اردو کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ سید کامل القادری نے بلوچی دنیا کے غور نمبر میں آپ کے بارے میں کیا خوب لکھا تھا کہ "غور کی شاعری ایک جام جہاں نما ہے جس میں ہر طرح کا عکس نظر آتا ہے، ایک ایسا خوش رنگ ممزوج ہے جس کے لطف و کیف کا احساس تلخی کام و دہن کی آزمائش کے بغیر شریانوں میں موجزن ہوتا ہے، ایک ایسا نظریہ حیات و کائنات ہے جس کی تمنا ہر انسان کے دل میں خوابیدہ رہتی ہے لیکن اس کے اظہار کے لیے کوئی مناسب لفظ اب تک وضع نہیں ہو سکا اورر یہ اس لیے ہے کہ وہ فطری شاعر ہے، اس کی شاعری احساسات کی شاعری ہے، نظریے، فکر یا متعقدات کی شاعری نہیں، جو کچھ محسوس کرتا ہے، صاف و شستہ اور بے تکلف انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ اسلوب بیان میں جدیدیت کی ندرت اور کلاسیکل اردو شاعری کے رنگ و آہنگ کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، اس کے پیانہ شعری میں جو کچھ ہے وہ اس کے احساس کی بھٹی میں تپ کر اور جگر کی چھلنی سے چھن کر نکلی ہوئی شے ہے۔ محض قال نہیں، حال ہے ......"

شاعری میں آپ کے استاد آغا صادق مرحوم نے لکھا تھا کہ "غور، مشاعرے فتح کرنے والا شاعر نہ سہی، جس کی مشاعروں میں ان دنوں مانگ ہو، وہ ان وقتی ہنگامہ آفرینیوں کے حربوں سے مسلح نہ سہی، مگر اس کی تحریریں، نظم ہوں یا نثر، ناول ہو یا تاریخ، سیرت ہو یا گیت، بلوچستانی عوامی ادب کا حصہ بنے رہیں گے اور ادب و صحافت کا کوئی مورخ اسے نظرانداز نہیں کر سکے گا۔"

عبدالرحمن غور بیسویں صدی کی تیری دہائی میں سبی کے نواح میں "کچھ ولہاری خان" نامی گاؤں میں منشی لال خان بلوچ کے یہاں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں والد کی وفات کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے لیکن علم و ادب سے فطری دلچسپی کی وجہ سے ۱۹۴۵ء میں سبی کے "ادارہ ادب بلوچستان" کی بنیاد پڑی تو اس میں بھرپور طریقے سے حصہ لینا شروع کیا اور اسی ادارے کے زیر اہتمام کئی ادبی کتابیں شائع کیں۔ تحریک آزادی میں ادبی محاذ پر آپ کا حصہ قابل قدر رہا۔ آپ ۷، مارچ ۱۹۸۴ء کو اس دار فانی سے رخصت ہوئے۔

یونیورسٹی، کالج اور اردو زبان و ادب کے مرکزی اداروں سے دوری کے باوجود، بلوچستان کے دور افتادہ مقام سبی میں رہتے ہوئے اردو زبان وادب کی ترویج و ترقی میں عبدالرحمن غور کی خدمات نہ صرف قابل قدر ہیں بلکہ قابل تقلید بھی۔ آپ نے بے سرو سامانی کے باوجود بلوچستان میں اردو زبان کے فروغ میں نہ صرف صحافتی اور اشاعتی سطح پر کام کیا بلکہ نظم و نثر میں یکساں طور پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے پھول بھی سجائے۔ آپ کے دوسرے مجموعہ کلام "متاع بردہ" کے دیباچہ میں فیض احمد فیض نے لکھا ہے کہ "عبدالرحمن غور صاحب کا نام بلوچستان کے ادبی حلقوں میں ایک زمانے سے معروف ہے' ان کے کلام کے مطالعے کے بعد مجھے تاسف ہوا کہ ان کی شمع سخن کا حلقہ بزم زیادہ وسیع کیوں نہیں ہے' اگر ان کے حالات مساعد ہوتے تو مجھے یقین ہے کہ دیگر اطراف وطن میں بھی شائقین ادب ان کے فکر وخیال سے زیادہ باخبر ہوتے' غور صاحب شعوری طور سے ترقی پسند اور بامقصد کاوش سخن کرتے ہیں' اس میں تکلف یا بناوٹ تو الگ' محض حسن نیت یا حصول ثواب کے محرکات کو بھی چنداں دخل نہیں' جو کچھ کہتے ہیں' لگن سے کہتے ہیں' چنانچہ ان کے دل و نگاہ کا انتخاب عقیدے سے زیادہ تجربے پر مبنی ہے' اسی تجربے سے انہوں نے اپنے عقائد اخذ کیے ہیں اور ان عقائد کو خلوص اور صداقت سے نبھانے کی کوشش کی ہے.... اپنے وطن اور ابنائے وطن سے ان کا لگاؤ گہرا اور بے لاگ ہے اور ان کے بیشتر موضوعات اسی جذبے سے مشتق ہیں۔"

عبدالرحمن غور کا پہلا شعری مجموعہ "پھندے" فروری ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا اور دوسرا شعری مجموعہ "متاع بردہ" کے نام سے ۱۹۶۷ء میں چھپا جبکہ تیسرے شعری مجموعے کی اطلاع بلوچی دنیا ملتان کے غور نمبر میں رفیق راز کے مضمون سے ملتی ہے جس میں راز نے لکھا ہے کہ "عبدالرحمن غور کے دو مجموعے اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں ان میں خلوص سے بھرا دل' زندگی کی امنگ' لہو کی ترنگ اور آگے قدم بڑھاتے رہنے کا عزم بدرجہ اتم موجود ہے' اس کے باوجود ان کی شاعری میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی جسے انقلابی شاعری یا ترقی پسند شاعری کہا جا سکے' .... ان کی شاعری میں سوز و گداز پیدا ہو گیا ممکن ہے اس کی وجہ ان کی طویل علالت اور مفلسی ہو کیونکہ انہوں نے اپنا تیسرا مجموعہ کلام بعنوان "شعلے" دوران علالت ترتیب دیا ہے۔" شعری مجموعوں کے علاوہ غور نے اردو میں افسانے بھی لکھے اور "مشعل" کے نام سے بلوچستان کے شاعروں اور ادیبوں کا انتخاب بھی شائع کیا"ہماری جد و جہد" کے نام سے بلوچستان میں تحریک آزادی کی تاریخ' ۱۹۵۴ء میں' فروری ۱۹۵۵ء میں افسانوں کا مجموعہ "ناقابل فراموش ہستیاں"' بچوں کے لیے "سچی کہانیاں"' نغمہ کوہسار' (اس کتاب میں پندرہویں صدی عیسوی سے عصر حاضر تک کے تئیس بلوچی شاعروں کے حالات درج ہیں) کے علاوہ متعدد مضامین لکھے۔

چمن کا حسن' گلوں کا نکھار ہم بھی ہیں
شریک قافلہ نو بہار ہم بھی ہیں
ہماری سمت بھی دیکھو نظر اٹھا کے ذرا
مثال غنچہ و گل دل فگار ہم بھی ہیں
ہمیں بھی خواہش کیف و سرور ہے ساقی
اسیر گردش لیل و نہار ہم بھی ہیں
ترے کرم سے ہے وابستہ زندگی اپنی
تری نگاہ کے امیدوار ہم بھی ہیں
جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکی

وہ اک چراغ سر رہگزار ہم بھی ہیں
کچھ اس طرح ہے ترے نام سے ہمیں نسبت
کہ حسن و عشق کے آئینہ دار ہم بھی ہیں
یہ ظرف دیکھیے دنیا کے ساتھ ساتھ ہیں غور
کسی کی یاد میں گو اشکبار ہم بھی ہیں

کبھی جو مائل فریاد درد مند ہوئے
فضا میں زور سے کچھ قہقہے بلند ہوئے
یہ فصل گل ہے کہ یارو خزاں کا موسم ہے
مسرتوں کے ترانے بھی زہر خند ہوئے
رہ حیات میں ایسی بھی منزلیں آئیں
قدم قدم پہ جہاں حوصلے بلند ہوئے
چمن میں آئی ہے ایسی بہار، دیدہ ورو
کہ پھول پھول سے شعلے بھی کچھ بلند ہوئے
ہمیں نے زیست کو ہر طرح تازگی بخشی
ہمارے حوصلے دنیا میں سود مند رہے

چمن کے پھول چمن کے لیے ترستے ہیں
روش روش پہ کرن کے لیے ترستے ہیں
نظر اٹھا تو سہی اے نگار صبح حیات
تری جبیں کی شکن کے لیے ترستے ہیں
نہ چھیڑ قصہ عہد بہار، رہنے دے

ابھی تو سرو سمن کے لیے ترستے ہیں
صبا ہے پا بہ سلاسل، بہار مہر بہ لب
قفس نصیب چمن کے لیے ترستے ہیں
وہی ہے عالم غربت کی دشت پیمائی
وطن میں رہ کے وطن کے لیے ترستے ہیں
ہجوم ظلمت شب ہی کا بول بالا ہے
سحر پرست کرن کے لیے ترستے ہیں
ادا سے مارنے والے تجھے خبر بھی ہے
ترے شہید کفن کے لیے ترستے ہیں
ہوئے ہیں جب سے حریم سخن میں ہم خاموش
سخن شناس، سخن کے لیے ترستے ہیں
غم جہاں کے تقاضے شدید ہیں لیکن
وہ اہل فن ہیں کہ فن کے لیے ترستے ہیں

اٹھ ترے دور کا آغاز ہوا

مژدہ اے تازہ بہاروں کے گھر بار زمیں
جاگ اٹھے ہیں تری عظمت رفتہ کے مکیں
صورت مہر جہاں تاب ہے ذروں کی جبیں
آج ہر فرد ہے اس دیس کی عظمت کا امیں
اور ہر اشک ترا مایہ صد ناز ہوا
اٹھ ترے دور جہاں ساز کا آغاز ہوا
زندگی راہگزاروں پہ بھٹکتی تھی کبھی

روشنی دور خلاؤں میں سسکتی تھی کبھی
جستجو اپنے ہی سائے سے بھجکتی تھی کبھی
ہر خوشی یاس کے دامن میں ہمکتی تھی کبھی
آج ہر ذرہ نئی صبح کا غماز ہوا
اٹھ ترے دور جہاں ساز کا آغاز ہوا

آج ہر سمت ہیں گلریز ہوا میں رقصاں
رخ ہستی پہ نہیں کوئی اداسی کا نشاں
علم و حکمت سے درخشاں ہے جبین انساں
اور اک تو ہے ابھی آہ بلب نوحہ کناں
طائر ذوق جنوں مائل پرواز ہوا
اٹھ ترے دور جہاں ساز کا آغاز ہوا

حسرت و یاس کے پرہول اندھیرے نہ رہے
غم کی شامیں نہ رہیں دکھ کے سویرے نہ رہے
جادہ نور پہ ظلمت کے لٹیرے نہ رہے
اجنبیت کے فسوں ساز پھریرے نہ رہے
فکر و احساس کا اب اور ہی انداز ہوا
اٹھ تری دور جہاں ساز کا آغاز ہوا

طلوع امید

ہمدم خوشی سے جھوم، سویرا قریب ہے
دامن فضا کا چوم، سویرا قریب ہے
اک آگ سی برستی رہی ہے تمام رات

اب تھم گئی سموم، سویرا قریب ہے
مانا کہ جس کی چاہ تھی یہ وہ سحر نہیں
ہر غم بھلا کے جھوم، سویرا قریب ہے
اب زندگی رنج و الم کا ہے اختتام
ہر سو ہے اس کی دھوم، سویرا قریب ہے
امید انقلاب بر آنے کو ہے ندیم
خوشیوں کا ہے ہجوم، سویرا قریب ہے
اب تیرگی ظلمت شب دیرپا نہیں
دھندلا گئے نجوم، سویرا قریب ہے
پینا پڑے گا خون جگر غور تا بکے
بڑھ کر سبو کو چوم، سویرا قریب ہے

لٹن روڈ

یہ ٹھنڈی سڑک اور چناروں کے سائے
کبھی تم بھی آؤ، خدا تم کو لائے
بہار آفریں ہے عجب اس کا منظر
عیاں اس کے منظر سے ہوتا ہے اکثر
کہ جیسے یہ شاہراہ خلد بریں ہے
ذرا دور جائیں تو جنت یہیں ہے
یہاں دن کو میلا سا رہتا ہے اکثر
فسوں کار پھرتے ہیں بہتر سے بہتر
تصادم نگاہوں کا ہوتا ہے یکسر

غرض یہ کہ ہر شے یہاں کی ہے برتر
یہ شاہراہ تفریح گاہ جہاں ہے
یہ دولت کے بندوں کی روح رواں ہے
اسی شاہراہ پر کنارے کنارے
اک آباد بستی ہے جس کے نظارے
غریبوں کی دنیا پہ اک "طنز پیہم"
تہی دست گویا ہیں اخلاق سے ہم
حقیقت میں لیکن کچھ ایسا نہیں ہے
شرافت کا معیار پیسہ نہیں ہے

حوالہ جات

۱۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، بلوچستان میں اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۱۹۸۶ء

۲۔ غور، عبدالرحمن، متاع بردہ، مکتبہ بلوچی دنیا، ملتان ۱۹۶۷ء

۳۔ غور، عبدالرحمن، پھندے، ادارہ ادب بلوچستان، سی فروری ۱۹۴۹ء

۴۔ "بلوچی دنیا" ملتان۔ غور نمبر، جلد نمبر۹، شمارہ نمبر ۳۔۴، جون، جولائی ۱۹۶۵ء

محمد انور خان

ولادت ۱۹۲۲ء　　وفات ۱۹۹۷ء

اپنے اعلیٰ شعری ذوق، وسیع مطالعے، خوش شکلی و خوش اطواری، جہاں دیدگی، اور دنیاوی مقام و مرتبے کے حوالے سے محمد انور خان المتخلص بہ طالب شیرازی، بلوچستان کے وہ کثیراللسان شاعر تھے جن کی شاعری بلوچستان کا سرمایہ افتخار ہے۔ محمد انور خان بیک وقت اردو، فارسی اور انگریزی میں اعلیٰ پایہ کے شعر کہنے کی پوری استعداد رکھنے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی، عربی اور جرمن زبان و ادب پر بھی عبور رکھتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل بلوچستان کے جن شعراء نے ہندوستان میں اپنی شعرگوئی کا لوہا منوایا ان میں آپ کا نام نامی بطور خاص یاد رکھنے کے قابل ہے۔

محمد انور خان ۸، ذیقعد ۱۳۴۰ھ بروز جمعہ بمطابق ۱۹۲۲ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد سردار محمد سرور خان ایک وسیع المطالعہ عالم فاضل شخص تھے جو تاریخ اور ادب کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے، ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ انہیں افغانستان اور بلوچستان کے ہر قبیلے کا شجرہ نسب زبانی یاد تھا، ان کے دادا اور والد انیسویں صدی کے ربع آخر میں قندہار سے نقل مکانی کر کے کوئٹہ میں آباد ہو گئے تھے۔ سردار محمد سرور خان نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی اور ان کے علمی استعداد کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ ان کے شعری ذوق کو پروان چڑھانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

محمد انور خان نے اپنی ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ سے حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان ۱۹۳۷ء میں پاس کیا جس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے اپنے زمانے کے بہترین تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۴۱ء میں بی اے اور ۱۹۴۳ء میں انگلش لٹریچر میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ اس زمانے میں لاہور میں میرا جی اور ن م راشد جیسے جلیل القدر شعراء کا چرچا تھا، قیوم نظر، الطاف

گوہر اور اعجاز بٹالوی جیسے دوستوں کے ساتھ انہوں نے تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ لاہور کی ادبی فضا میں زمانہ طالب علمی ہی میں ایک بلند مقام پیدا کر لیا' آپ کی نظمیں ہندوستان کے ادبی رسالوں میں سال کی بہترین نظموں کے طور پر چھپنے لگیں اور اپنی تازگی' شگفتگی اور زبان و بیان کی صفائی و روانی کی وجہ سے ادبی حلقوں میں آپ کا شمار ایک معتبر شاعر کے طور پر ہونے لگا۔ لاہور کے ساتھ ساتھ آپ نے بلوچستان میں بھی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور چھٹیوں میں کوئٹہ کے قیام کے دوران یہاں کی ادبی تنظیموں میں فعال کردار ادا کرتے رہے۔ آپ بلوچستان کے پہلے مقامی نوجوان تھے جو ۱۹۴۲ء میں "بزم ادب کوئٹہ" کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ آپ نے بزم ادب کوئٹہ کے زیر اہتمام مشاعروں کے علاوہ ادبی نشستوں کے انعقاد میں اہم کردار ادا کیا جن میں تنقید و تحقیق کے ذریعے ادب شناسی کو فروغ دیا اور اردو ادب کے بڑے مراکز کے ساتھ بلوچستان میں ہونے والی تخلیقات کو ہم آہنگ کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ واپس بلوچستان آئے اور نائب تحصیلدار کی حیثیت سے حکومت میں ملازمت اختیار کر لی' بلوچستان میں آمد کے بعد آپ نے مشاعروں' تنقیدی نشستوں اور ادبی محفلوں میں جدید شعری رجحانات کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ انتہائی اعلیٰ درجے کی تخلیقی کاوشیں کیں۔

قیام پاکستان کے بعد آپ فارن سروس میں چلے گئے اور افغانستان' ایران' سعودی عرب' اومان' ماریشس اور زمبابوے میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے آپ بلوچستان سے تعلق رکھنے والے پہلے شخص تھے جو سفارت کے عہدے پر متعین ہوئے' ملک سے باہر رہنے کیوجہ سے آپ کا تعلق براہ راست تو ادبی محفلوں سے ٹوٹ گیا لیکن آپ نے سفارت کاری کے میدان میں رہتے ہوئے بھی اپنی تخلیقی سرگرمیوں کو جاری رکھا اور رسائل و جرائد کے ذریعے اپنا ربط ادبی دنیا سے برقرار رکھا۔

فارن سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ کوئٹہ آ گئے اور تین سال تک فیڈرل سروس کمیشن کے ممبر بھی رہے' آپ ۲۹ جنوری ۱۹۹۷ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

۱۹۷۹ء میں ماریشس سے آپ کا انگریزی مجموعہ "Songs of Separation" شائع ہوا۔ جس میں بہت خوبصورت نظمیں ہیں ان نظموں میں بلوچستان کے موسم اور کہساروں کی خوشبو بھی ہے اور اردو اور فارسی غزلوں کی بہار بھی۔ آپ فارسی میں رباعی' دو بیتی اور غزلوں کے بہت بڑے شاعر تھے' اردو میں آپ کی نظمیں شاہکار ہیں۔

اثر جلیلی

ولادت یکم جنوری ۱۹۲۲ء وفات ۷ اپریل ۱۹۸۱ء

بلوچستان میں اردو مرثیہ نگاری اور زبان و ادب کے فروغ میں بطور خاص جناب اثر جلیلی کا نام نامی یاد رکھا جائے گا۔ آپ نے نہ صرف اپنے کلام کے ذریعے بلوچستان میں اردو شاعری کے خزانہ میں لعل و گہر سجائے بلکہ مشاعروں، ادبی نشستوں، ریڈیو کے پروگراموں، مرثیہ کی مجلسوں اور نوجوانوں کی تربیت میں نہایت اہم اور گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آپ کی شخصیت اس عظیم تہذیب کی تمام خوبیاں لیے ہوئے تھی جو مسلمانان پاک و ہند کا قابل فخر سرمایہ ہے۔ اردو زبان کو اس کے پورے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کے ساتھ بلوچستان میں روشناس کرانے اور پروان چڑھانے میں آپ کا کردار ایک عملی نمونہ تھا۔

اردو کے ممتاز شاعر، ادیب اور نقاد رئیس امروہوی اثر جلیلی کے مجموعہ "عکس کربلا" کے بارے میں لکھتے ہیں "یہ حقیقت ہے کہ اثر جلیلی کی زندگی میں ان کی شاعرانہ عظمت، ان کی قدرت بیانی، ان کی روح تخیل اور ان کی لطافت سخنی سے ہم لوگ یعنی ان کے احباب بے خبر رہے لیکن ان کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ کتنا بڑا، پرگو، خوش گو اور قادرالکلام شاعر ہمارے درمیاں سے اٹھ گیا۔ ہم کس نادر سخن ور کو اس کی زندگی میں نہ پہچان سکے، یہ ساتوں مرثیے اساتذہ کی طرز مرصع میں کہے ہیں اور مرثیے کی تمام رعایات کو ملحوظ رکھا گیا ہے، یعنی تشبیب، آمد ممدوح کے مناقب کی طرف گریز اس کی عظمت و جلالت کا بیان، میدان کربلا کی عام فضا میں بزم کے بعد رزم کا بیان، گھوڑے اور تلوار کے متعارفی مضامین کی طرف اشارہ، مصائب، بکاانگیز اشارے، مناقب کے پہلو بہ پہلو مصائب کا بیان، حقیقت یہ ہے کہ ان مراثی میں اردو کلاسیکی مرثیہ اپنی پوری شان اور آن بان کے ساتھ نظر آتا ہے۔ واقعی "عکس کربلا" کے مطالعہ سے اندازا ہوا کہ ہم کس جوہر

قابل کو گم کر بیٹھے۔ مجھے امید ہے کہ کلاسیکی مراثی کی دنیا میں اثر جلیلی مرحوم کا یہ مجموعہ ہمیشہ اپنا مقام اور اپنی منزلت برقرار رکھے گا"۔

اثر جلیلی کا پورا نام سید عبدالاحد تھا' آپ یکم جنوری ۱۹۲۲ء کو سید عبدالحمید کے یہاں اجمیر شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ نے منشی فاضل تک تعلیم حاصل کی اور شاعری میں آپ کے استاد حضرت جلیل مانک پوری تھے جن کی وجہ سے آپ کا تخلص جلیلی ہے۔ آپ نے عملی زندگی کا آغاز گیمن پاکستان میں ملازمت سے کیا اور بعد میں آپ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کوئٹہ منتقل ہوئے جہاں آپ نے اپنی پوری زندگی گزاری۔

مرثیہ نگاری کے علاوہ اثر جلیلی غزل' سلام اور رباعی بھی کہتے تھے' ان کی رباعیاں فنی اور موضوعاتی حوالوں سے اردو کی بہترین رباعیاں ہیں بقول ڈاکٹر نعیم تقوی " اثر جلیلی نے رباعی کی فنی قیود کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو افکار پیش کیے ہیں وہ ان کے جذبات و احساسات کے ترجمان ہیں' مثلاً" جو رباعی سب سے پہلے پیش کی جا رہی ہے وہ نعت احمد مختار صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حوالے سے عاشقان رسول کریم کے لیے ارمغان روحانی ہے' اثر جلیلی کا ایمان تھا کہ ارشاد احدیت کے مطابق حضور انور کو مرکزیت حاصل ہے' رحمت کونین سے وابستہ ہونے والا حوادث دوراں کا رخ موڑ دیتا ہے' بحر ہستی میں لاکھ طوفاں انھیں جاں نثار شہہ لولاک کے لیے مدینہ منورہ ساحل امید کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا عشق رسول کی دولت بیدار سے مالا مال ہونے والے کی زندگی قابل رشک ہوتی ہے۔"

ہے ساحل امید مدینہ میرا
گرداب شکن خود ہے سفینہ میرا
ہے لطف رسول دو سرا شامل حال
کیوں رشک کے قابل نہ ہو جینا میرا

مرثیہ' رباعی اور غزل کے ساتھ ساتھ آپ نے سلام نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھلائے ہیں اور حق سلام گوئی کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں اس کے فروغ

میں بنیادی کردار ادا کیا۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین نے آپ کی شاعری اور شخصیت کے بارے میں کیا خوب لکھا ہے کہ " سید عبدالاحد جعفری المتخلص بہ اثر جلیلی مرنجان مرنج' صاف دل' صوفی منش آدمی تھے۔ شاعری میں وہ حضرت جلیل مانک پوری کے مشورے میں تھے' استاد کے مشورے اور خود اپنی محنت اور مشق سخن کی بناء پر وہ رموز فن سے آشنا ہو چکے تھے' معائب شعری سے امکانی حد تک ان کا کلام پاک تھا وہ "یک فنے" نہیں تھے۔ بیشتر معروف اصناف سخن میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اسی کے ساتھ صاف ستھری نثر میں انہوں نے متعدد تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں' قدما کی نظر دیکھے ہوئے وہ اپنے معاصرین میں ہردل عزیز اور نئے شعراء میں محترم تھے۔

اثر جلیلی کی غزلیں بھی خوب ہیں اور جہاں تک مرثیوں کا تعلق ہے وہ خوب تر ہیں' غزل سے مرثیہ تک کا سفر بظاہر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے مگر اتنا عجیب بھی نہیں' اسی عہد میں کئی شاعروں نے یہ سفر بخیر و بخوبی طے کیا ہے۔

اثر جلیلی کے مرثیوں کو دیکھ کر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کی غزل گوئی ایک تربیت تھی' مرثیہ گوئی کے لیے۔ وہ تمام عناصر جو ان کی غزل میں مجملاً" پائے جاتے ہیں مرثیوں میں پھول بن کر کھل گئے ہیں۔"

اثر جلیلی کے مرثیوں کا مجموعہ "عکس کربلا" کے نام سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی' جس میں سات مرثیے اور سلام ہیں۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین کے علاوہ تابش دہلوی اور پروفیسر سردار نقوی کے مضامیں بھی مجموعے میں شامل ہیں۔

اردو کے مایہ ناز نقاد پروفیسر سحر انصاری ایک عرصہ تک جامعہ بلوچستان میں بھی رہے۔ اس دوران آپ کو اثر جلیلی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا' اثر جلیلی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " اثر جلیلی نے اپنے مرثیہ میں ان تمام اجزائے ترکیبی کو ملحوظ رکھا جنہیں روایتی مرثیے کا خاصہ سمجھا جاتا ہے۔ چہرہ' سراپا' منظر نگاری' ماحول نگاری' مبارزت طلبی' گھوڑے اور تلوار کی تعریف' رجز' شہادت اور بین۔ یہ اجزاء ان کے کم و بیش سبھی مرثیوں

میں ملتے ہیں ان کے بیشتر مرثیوں کا چہرہ زمانے کے تضادات اور طرفگی کی شکایت اور وضاحت سے شروع ہوتا ہے۔ گویا خیر و شر، نور و ظلمت، صبا و سموم، عدل و جبر کے مابین فرق کرتے ہوئے اقدار حیات کا ایک واضح تصور پیش کرتے ہیں۔

قدم قدم پہ یہاں ہے تضاد کا عالم
عجب ہے عالم کون و فساد کا عالم

یہ تصوراقدار ہمارے عہد کی ضرورت بھی ہے اور لمحہ فکریہ بھی فراہم کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں جب امام عالی مقام اور کربلا کے دیگر جاں نثاروں کا تذکرہ آتا ہے تو اس سے موجودہ عہد کے آدمی کو بھی حوصلہ بصیرت اور آگہی حاصل ہوتی ہے۔"

پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی اثر جلیلی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ایک مرثیہ نگار اگر حیات انسانی اور تہذیب کے آفاقی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کی فنکارانہ رفعت کو دوام حاصل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اثر جلیلی ہمیں مقام اعتبار پر نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی فنکارانہ خوش قامتی کو میں اس لیے بھی معتبر سمجھتا ہوں کہ وہ آفاقیت اور ہمہ گیری کے صحت مند اصولوں پر شعوری طور سے کاربند تھے۔ بعض نام نہاد جدیدیت پسند افراد کی طرح وہ خلا میں معلق نہیں رہے بلکہ آفاقیت کے ساتھ ارضیت کو بھی بدرجہ کمال اپنایا، ان کا انداز مجھے بے حد پسند ہے کہ وہ زمین سے بھی ہم رشتہ رہے اور آفاقی کائناتی مسائل کے شارح کی حیثیت سے اپنی مرثیہ نگاری کو فروغ دینے میں کوشاں رہے، اس فکری تطابق نے ان کی عزائیہ شاعری کو گنجہائے گراں مایہ بنا دیا۔ موسم کا ذکر اکثر مرثیہ نگاروں نے کیا ہے مگر جس طرح انہوں نے کوئٹہ کے جغرافیائی حالات کے تحت برف باری پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے انداز میں جس سرگرمی کا ثبوت دیا ہے اس سے قارئین کے شعلہ جاں میں مزید حرارت پیدا ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔ ان کا مرثیہ بعنوان "برف نامہ" پڑھ کر ایمان کی حرارت بڑھتی ہے۔ یہ مرثیہ موضوع کے اعتبار سے بھی قابل ذکر ہے اور اشقیا کی آل رسول سے سرد مہری کا بیان ایسی شعلہ سامانی سے کیا گیا ہے کہ کیسا ہی سنگ دل کیوں نہ ہو مصائب کے دو تین بند سن کر پگھل

جائے۔"

مرثیہ
(برف نامہ)

خیمہ زن فصل خزاں ہے چمنستانوں میں
کوہساروں سے سوا برف ہے میدانوں میں
منجمد خون ہوا جاتا ہے شریانوں میں
سرد ہے آتش سیال بھی پیمانوں میں
خوں لب زخم تک آتے ہوئے گھبراتا ہے
فرش پر قطرہ جو گرتا ہے وہ جم جاتا ہے

نہ کہیں مہر منور نہ کہیں ماہ و نجوم
آتش شوق حرارت سے ہوئی ہے محروم
کھو گئیں نظریں ہوا برف کا اس درجہ ہجوم
جم کے رہ جائے جو آ نکلے ادھر باد سموم
آگ کا دائرہ بھی برف کا آغوش ہوا
ابھی بھڑکا بھی نہ تھا شعلہ کہ خاموش ہوا

مارے سردی کے ہے پہلو کا بدلنا دشوار
نفس گرم ہے برفانی ہواؤں سے دوچار
شعلہ جاں میں حرارت کے نہیں ہیں آثار
آگ کے پاس سے اٹھتے ہیں تو چڑھتا ہے بخار
گر نظر بھی کہیں دو چار قدم جاتی ہے
اس قدر برف کی شدت ہے کہ جم جاتی ہے

مانند ہے برف کے آگے شہ خاور کا جلال
خوف برفاب سے شعلوں کی زبانیں ہوئیں لال
کر دیا *شدت سرما نے زبوں آگ کا حال
برف سے سرد ہیں انگارے، شرارے پامال
آگ نے اپنی روایت کو فراموش کیا
برف نے شعلہ بیانوں کو بھی خاموش کیا

کو بہ کو برف سر راہ گذر برف ہی برف
ہے سر دشت و دمن کوہ و کمر برف ہی برف
ہے ادھر برف ہی برف اور ادھر برف ہی برف
پوری وادی میں ہے تا حد نظر برف ہی برف
فرش تا عرش فضا پر ہے اجارا اس کا
کھائے جاتا ہے نگاہوں کو نظارا اس کا

چپہ چپہ ہے یہاں کاہکشاں سے بڑھ کر
وہ سپیدی ہے ٹھہرتی نہیں نظریں جس پر
دیکھ لے اس کو تو خیرہ ہو سکندر کی نظر
وہ تجلی ہے کہ حیران ہیں سب آئینہ گر
وادی نور کو نظارا یہ شرماتا ہے
کوئٹہ آئینہ خانہ سا نظر آتا ہے

برف باری ہے یہاں مشغلہ شام و سحر
برف ہی برف ہے جس سمت بھی اٹھتی ہے نظر
نہ کہیں چھت نہ کہیں صحن نہ دیوار نہ در
برف کے کوچہ و بازار ہیں اور برف کے گھر

کہیں آنے کا مزہ ہے نہ کہیں جانے کا
رابطہ ٹوٹ گیا شمع سے پروانے کا

ہاں مگر اہل ولا رنگ پہ ہیں آئے ہوئے
آتش شوق سے دل سب کے ہیں گرمائے ہوئے
زخم سینوں پہ محبت کے ہیں جو کھائے ہوئے
کچھ وفا کیش کراچی سے بھی ہیں آئے ہوئے
ہے چراغ الفت شبیر کا روشن ان سے
رشک گلشن ہیں عزاداروں کے دامن ان سے

ان سے دنیا میں محبت کا چلن باقی ہے
رونق حلقہ احباب سخن باقی ہے
مرثیہ گوئی کا اس شہر میں فن باقی ہے
اہل دل باقی ہیں اور ذکر محن باقی ہے
حق محبت کا یہی لوگ ادا کرتے ہیں
شان سے تذکرہ کرب و بلا کرتے ہیں

دل شہیدوں کی محبت سے نہاں رکھتے ہیں
ہمت کوہ کن و عزم جواں رکھتے ہیں
شعلہ عشق کو سینوں میں نہاں رکھتے ہیں
سوز دل رکھتے ہیں یہ سوز بیاں رکھتے ہیں
سرخی قصہ ارباب وفا ہیں یہ لوگ
موسم برف میں بھی شعلہ نوا ہیں یہ لوگ

ہے جنوں زندہ تو آباد ہیں ویرانے بھی
فصل گل آئے تو جاگ اٹھتے ہیں دیوانے بھی

رند آئیں تو چھلک جاتے ہیں پیمانے بھی
شمع روشن ہو تو آ جاتے ہیں پروانے بھی
کم نہیں ہیں غم شبیر منانے والے
برفباری میں بھی آتے رہے آنے والے

کیوں نہ پھر اوج پہ ہو طالع بیدار سخن
بن گیا قلب تپاں نقطہ پرکار سخن
چشم خوں بار بنی ابر گہر بار سخن
قابل دید ہے یہ گرمیٔ بازار سخن
واہ رے بخت کہ یوسف ہیں خریداروں میں
جنس غم کی ہے طلب مصر کے بازاروں میں

سب پہ قادر ہے خداوند علیم و مختار
وہ اگر چاہے تو صحرا میں چلی آئے بہار
آگ کو چاہے تو اک پل میں بنا دے گلزار
برف کو چاہے تو وہ بخش دے شعلوں کا شعار
وہ دل سنگ میں چاہے تو کرے غم پیدا
سینۂ دشت سے ہو چشمۂ زمزم پیدا

حامل کفر کو وہ صاحب ایماں کر دے
گبر کو چاہے تو اک پل میں مسلماں کر دے
دم میں ہر منزل دشوار کو آساں کر دے
کور چشموں کو بھی وہ حافظ قرآں کر دے
صدف خام کی آغوش میں در مل جائے
لشکر باطل و بد خواہ میں حر مل جائے

اپنے بندوں کو طلب سے وہ سوا دیتا ہے
دشت کو غیرت گلزار بنا دیتا ہے
پرتو مہر سے ذروں کو جلا دیتا ہے
زہر کو خاصیت آب بقا دیتا ہے
وہ اگر چاہے تو پیری کو جوانی دے دے
دہن برف کو وہ شعلہ بیانی دے دے

فضل رب ہو تو سنور جاتی ہے پل میں تقدیر
محترم دہر میں ہو جاتے ہیں اک دم میں حقیر
دشت ہو جاتا ہے اک آن میں فردوس نظیر
ظلمت شب سے ابھرتی ہے سحر کی تنویر
رات کو ظلم کی آغوش میں جو سوتے ہیں
آنکھ کھلتی ہے تو وہ حق کی طرف ہوتے ہیں

حر سے ثابت ہے جو ہو لطف خدا شامل حال
وہی ہو جاتا ہے ممکن جو بظاہر ہو محال
نیک طینت ہے وہی جس کا کہ ہے نیک مآل
ہو بدوں میں بھی تو آ جاتا ہے نیکی کا خیال
لطف اللہ کا جب شامل حالات ہوا
بخت خود خضر رہ وادی ظلمات ہوا

رات ہی رات میں یہ اوج و شرف ہاتھ آیا
الفت آل پیمبر کا خزینہ پایا
مل گیا خوبی قسمت سے عجب سرمایہ
آخر وقت ملا پرچم حق کا سایا

اوج تقدیر کا اللہ غنی ایسا ہو
خوش نصیب ایسا ہو قسمت کا دھنی ایسا ہو

شاہ نے کوفیوں سے مانگی جو مہلت شب کی
صاف ظاہر ہے کہ تھی اس میں مشیت رب کی
منتظر حر کی تھی اللہ کی رحمت کب کی
کاش پھر جائے یونہی دہر میں قسمت سب کی
وہ شب جبر کٹی صبح کا تارا چمکا
اور ادھر حر کے مقدر کا ستارا چمکا

تھا پشیماں کہ ستم آل نبی پر ڈھایا
کیوں انہیں گھیر کے میں دشت بلا میں لایا
تھی خلش دل کو کہ کیا کھویا ہے اور کیا پایا
آخر شب فقط اک حل یہ سمجھ میں آیا
جان قربان پئے سبط پیمبر کر دے
سر کو شبیر کے قدموں پہ نچھاور کر دے

اپنی بے مائیگی و تشنہ لبی یاد آئی
گہہ مرحمت آل نبی یاد آئی
کی تھی جو شاہ سے وہ بے ادبی یاد آئی
بخشش سبط رسول عربی یاد آئی
لشکر کیں میں ٹھہرنا اسے آزار ہوا
ایک لمحے کے توقف پہ نہ تیار ہوا

ہو گیا قلب حزیں رنج و محن سے آزاد
نہ بن سعد کا خوف اور نہ غم ابن زیاد

مل گیا در نجف حر کو کہ تھا نیک نہاد
کھل گیا غنچۂ دل ایسی چلی باد مراد
راتیں آنکھوں میں کٹی تھیں اسی دن کی خاطر
ان پہ مرنے چلا بے چین تھا جن کی خاطر

اس طرف شہ نے کیا آخری حجت کو تمام
اس طرف شام کے لشکر میں اٹھا اک کہرام
یاعلی کہتے ہوئے حر نے سنبھالی صمصام
بھائی تھا ایک طرف دوسری جانب تھا غلام
وہ صف لشکر اعدا سے دلاور نکلا
تیرگی ختم ہوئی مہر منور نکلا

شور تھا فوج میں لو عاشق شبیر چلا
غل پڑا چار طرف صاحب تقدیر چلا
حر عجب شان سے تولے ہوئے شمشیر چلا
کوئی تلوار اٹھی اور نہ کہیں تیر چلا
یوں عدو سہمے کہ ناوک فگنی بھول گئے
تیغیں دیکھا کیے اور تیغ زنی بھول گئے

اے خوشا مرتبہ دبدبہ و شوکت و جاہ
کس میں جرات ہے کہ روکے خردی جاہ کی راہ
دیکھتی رہ گئی حسرت سے لعینوں کی سپاہ
گو ہزاروں ہیں مگر ہوش ہیں اک اک کے تباہ
بے کس و بے بس و واماندہ و لاچار ہیں سب
جسد سنگ ہیں سب نقش بدیوار ہیں سب

اور ادھر شہ کی حضوری میں ہے فرخندہ مقام
پیشوائی کو بڑھے چند قدم آپ امام
عرض کی حر نے خطا وار ہوں یا شاہ انام
آپ چاہیں تو ہو آزادِ جہنم سے غلام
اس خطا کار پہ بس اتنا کرم کر دیجئے
اپنے ہاتھوں سے مرے ہاتھ قلم کر دیجئے
لطف و اکرام کا ہر چند سزاوار نہیں
قابل عفو نہیں لائق ایثار نہیں
پھر بھی مایوس مگر میں مرے سرکار نہیں
جس سے خالی پھریں سائل یہ وہ دربار نہیں
کیجئے بہر خدا عقدہ کشائی آقا
ہو عطا کرب ندامت سے رہائی آقا
میرے آقا مرے سرور ہو عطا اذن وغا
فرض جو جان پہ رکھتا ہوں وہ ہو جائے ادا
سب سے پہلے میں رہ حق میں کروں جان فدا
آبدیدہ ہوئے یہ سن کے شہ کرب و بلا
غم یہ تھا حر کی مدارات نہیں کر سکتے
پوری اس گھر کی روایات نہیں کر سکتے
بند ہے آل نبی کے لیے کیسا پانی
تین دن ہو گئے خیموں میں نہ آیا پانی
ذکر کیا اوروں کا بچوں نے نہ دیکھا پانی
غش میں بھی مانگتی رہتی ہے سکینہ پانی

قحط یہ ساتویں تاریخ سے ہے پانی کا
حق ادا ایسے میں کس طرح ہو مہمانی کا
حر کو لپٹا کے گلے بولے شہ عرش سریر
اپنے مہماں کی ضیافت سے ہے قاصر شبیر
ہمیں لے آئی ہے منزل پہ ہماری تقدیر
نہ تری اس میں خطا ہے اور نہ کوئی تقصیر
مرضی رب تھی یہی اور یہی ہونا تھا
حر یہی خاک ہے وہ جس میں ہمیں سونا تھا
حر نے کی عرض کہ اے بادشہ جن و بشر
یہ تمنا ہے کہ قدموں پہ نچھاور کروں سر
آرزو ہے کہ شہیدوں میں ہو نام احقر
اس خطا کار پہ ہو جائے عنایت کی نظر
جس کے در سے نہ پھرا کوئی بھی خالی آقا
اس کی سرکار میں ہے حر بھی سوالی آقا
کہہ کے یہ قدموں میں شبیر کے سر حر نے رکھا
ٹھان رکھی تھی کہ اٹھوں گا نہ بے اذن وغا
اور کچھ سرور دیں کے لیے چارہ نہ رہا
کوئی تدبیر نہ تھی رن کی اجازت کے سوا
ہو کے مجبور بہت جنگ کی رخصت دے دی
شہ نے بادیدہ تر حر کو اجازت دے دی
رخصت جنگ جو پائی تو ہوا حر شاداں
مٹ گیا دل سے ہر اک وسوسہ سود و زیاں

خوش تھا اس پر کہ ہوئی حشر کی مشکل آساں
اک گنہگار کہاں بخت کا یہ اوج کہاں

اے خوشا حر کہ جو قرباں پئے شبیر ہوا
صاحب بخت ہوا صاحب تقدیر ہوا

حوالہ جات

۱۔ اثر جلیلی، عکس کربلا، کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی ۱۹۸۸ء
۲۔ تقوی، ڈاکٹر نعیم، اثر جلیلی عکس کربلا کے آئینے میں، مجلس افکار اسلامی کراچی، ۱۹۹۰ء
۳۔ نعیم میرٹھی، سرور جاوید، مجلہ تقریب تعارف، کل پاکستان حلقہ ادب، کراچی

ماہر افغانی

ولادت ۸، مارچ ۱۹۲۳ء وفات ۳، ستمبر ۱۹۸۳ء

وادی کوئٹہ اپنے جن عظیم فرزندوں پر مدت مدید تک نازاں رہے گی ان میں ماہر افغانی کا نام نامی بھی شامل ہے۔ بلوچستان میں اردو شاعری کی تاریخ میں آپ اپنی شاعرانہ خصوصیات کی وجہ سے یکتا و یگانہ ہیں، آپ نے فارسی شاعری کی کلاسیکی روایت میں رندی و سرمستی کا اظہار جس نشاطیہ اور شوخ لہجے میں کیا، بلوچستان کی اردو شاعری میں وہ اس کی پہلی اور آخری مثال ہے۔

ماہر افغانی کی شاعری میں ساغر و مینا اور حسن و رخسار کے پردے ایک ایسے شخص کا واضح تصور ابھرتا ہے جو زمانے کے مکر و فریب اور ریاکاریوں کا پردہ ایک جرات رندانہ کے ساتھ چاک کرتا ہے کہ دل خود بخود نیکیوں اور صدق و صفا کی طرف جھکتا چلا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس طرح ماہر کسی منافق اور دوغلے شخص کو پسند نہیں کرتے تھے اسی طرح ماہر افغانی کسی منافق اور ریاکار کو پسند نہیں آ سکتے۔ ماہر افغانی کی شاعری زندگی بخش اور جان فزا ہے اسے پڑھ کر آپ ملول و مکدر نہیں بلکہ زندہ اور زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔

آغا سید ماہر علی شاہ المتخلص بہ ماہر افغانی ۸، مارچ ۱۹۲۳ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار آغا سید محبوب علی شاہ اس زمانے میں سول جج تھے، آغا محبوب علی شاہ کا تعلق افغانستان کے معروف خانوادہ سادات سے تھا۔ انکے والد آغا سید شاہ حسن (حاکم ہغمان) اور دیگر اہل خاندان ۱۸۸۱ء میں کابل سے لاہور نقل مکانی کر آئے تھے۔ آغا سید شاہ حسن کے بھائی جنرل پرویز شاہ خان، امیر شیر علی خان کے سپہ سالار تھے۔ انگریزوں نے اس خاندان کو احترام سے لاہور میں ٹھہرنے کا موقع دیا اور آغا سید حسن شاہ کو بعد ازاں حکومت میں ملازمت دی گئی۔ آپ ۱۹۰۱ء میں نائب تحصیلدار کی حیثیت سے کوئٹہ آ

گئے، اور یہیں آغا ماہر علی شاہ ۸، مارچ ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ آغا سید محبوب علی شاہ ۱۹۳۳ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

آغا محبوب علی شاہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی پر مکمل عبور رکھتے تھے اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ کوئٹہ میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں آپ کا حصہ تاریخ میں رقم ہے، آپ کوئٹہ کی "بزم ادب" کے نائب صدر رہے اور ۱۹۳۵ء کے زلزلے سے پیشتر مشاعروں کے انعقاد میں مالی تعاون کے ساتھ ساتھ بھرپور حصہ بھی لیا کرتے تھے۔ ۱۹۳۵ء سے پہلے جب حفیظ جالندھری پہلی مرتبہ کوئٹہ آئے تو ان کی میزبانی کا فریضہ آغا محبوب علی شاہ نے انجام دیا اور اسلامیہ ہائی اسکول میں ایک محفل شعر منعقد کی گئی جس میں حفیظ صاحب سے ان کا کلام سنا گیا۔

ماہر افغانی کی بنیادی تربیت و تعلیم خود آغا محبوب علی شاہ نے کی، آپ نے قرآن مجید، حدیث، علم الکلام، عربی فارسی اردو اور انگریزی زبانوں کی بنیادی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ آپ سکول میں داخل ہونے سے پیشتر قرآن مجید پڑھ چکے تھے اور فارسی کے علاوہ اردو اور انگریزی بول سکتے تھے۔ آغا ماہر کو جہاں دنیا جہاں کی سہولتیں میسر تھیں وہاں تعلیم کے معاملے میں ایک سخت گیر والد کا سامنا بھی تھا۔ اس وجہ سے ماہر آغا کی بنیادی تعلیم انتہائی اچھے انداز میں ہوئی۔

۱۹۳۸ء میں آغا محبوب علی شاہ کی وفات کے بعد ماہر افغانی چند سالوں کے لیے دہلی چلے گئے اور کچھ عرصے کے لیے الور اور اجمیر بھی رہے، ادبی اور شعری ذوق تو انہیں ورثے میں ملا تھا، دہلی میں شاعرانہ ماحول بھی میسر آیا، شعری ذوق، زبان و بیاں پر قدرت اور اس پر مستزاد جوانی۔ دہلی کے مشاعروں کی جان بن گئے اور بقول پروفیسر شیم احمد ۱۹۴۲ء میں ماہر افغانی ان کے پسندیدہ شعرا میں سے ایک تھے۔ آل انڈیا ریڈیو سے ان کی غزلیں سننے کے لیے ہندوستان بھر کے اہل ذوق منتظر رہتے۔ ۱۹۴۷ء میں ماہر آغا دوبارہ بلوچستان آ گئے۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک کراچی رہے جس کے بعد وہ تادم آخر کوئٹہ میں ہی رہے۔

ماہر افغانی ایک آزاد منش، درویش صفت، مرد بے خوف و بیباک تھے، وہ اردو،

فارسی اور انگریزی زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ان تینوں زبانوں میں ان کا ایک ایک مجموعہ موجود ہے۔ بلوچستان میں اردو شاعری کی تاریخ میں ماہر افغانی اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

پروفیسر مجتبیٰ حسین نے ماہر آغا کے بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ "میں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو دیکھا ہے مگر ماہر ایسا آدمی مجھے کم ملا۔ "بے ریا" ایک لفظ ہے جو مشکل ہی سے شرمندہ تعبیر ہوتا ہے، ماہر اس کی تعبیر تھے"

پروفیسر شیم احمد نے ماہر آغا کے بارے میں لکھا ہے کہ " فارسی لب و لہجہ ان کی شاعری کے انگ انگ میں بسا ہوا ہے۔ فارسی آہنگ نے اردو کو جو کچھ بخشا ہے اس کا بدل کسی بڑے سے بڑے سرمایہ سے نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لہجہ نہ صرف اردو کے باقی تمام لہجوں سے زیادہ نشاطیہ اور شوخ ہے بلکہ اتنا واضح اور تیز ہے جو شخصیت کی ذاتی انا اور انفرادی احساس و خیال کو ایک آفاقی تجربہ میں ڈھال دیتا ہے جس کے مقابلے پر اردو کے باقی رنگ مدھم اور بقول فراق صاحب "گنوارو" معلوم ہونے لگتے ہیں۔ یہ لب و لہجہ اس وقت اور بھی نمایاں اور شوخ ہو جاتا ہے جب کسی شخصیت کی تعمیر میں فارسی ادب و شعر کی روایت اور ایرانی تہذیب نے حصہ لیا ہو یا شاعر کے مزاج میں پہلے ہی سے شوخی طباعی اور نشاطیہ آہنگ موجود ہو۔ اس اعتبار سے اردو شاعری پر نظر ڈالیے تو آپ کو فارسی کی مذکورہ روایت کے شعرا بالکل الگ نظر آتے ہیں خواہ اس میں سودا اور فغاں ہوں یا آتش و ناسخ، غالب اور انیس ہوں یا اقبال ہوں۔ جدید تحریکوں کے دور میں بھی مجاز کی شاعری کا لہجہ اور انداز اسی روایت کا حامل تھا اور یہ روایت اس وقت اور نمایاں ہو جاتی ہے جب اس میں فارسی شاعری کے مخصوص موضوعات بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے موجودہ شاعری میں سراج الدین ظفر اور ماہر افغانی اپنی اسی خصوصیت اور مزاج کی بنا پر الگ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری تمام و کمال عجمی مزاج اور فارسی کے انداز، لب و لہجہ سے تعمیر ہوئی ہے۔ .... ماہر افغانی کا کلام پڑھ کر یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ رندی کی فارسی روایت سے اردو میں جو کچھ آیا تھا غالباً" اس کی آخری آواز ماہر صاحب کی صورت

میں ہمارے سامنے موجود ہے۔"

ڈاکٹر سلطانہ بخش "کن فیکون" کے تعارف میں ماہر افغانی کے بارے میں لکھتی ہیں کہ " ماہر کی غزلیں ایک خاص رکھ رکھاؤ اور ضبط و وقار کی حامل ہیں، لہجے کی متانت اور سنجیدگی ان کے کلام کا خاصہ ہے، مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی، انکی شاعری میں غم کے علاوہ جام و مینا، زلف و رخسار اور حسن و عشق کے لازوال جذبوں کی خوبصورت عکاسی ملتی ہے .... ان کی شاعری میں جس گہری بے نفسی کی جھلک ملتی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہو گا کہ "درویشی و شاعری بدوش راہ می رود" لیکن ان کی درویشی مردانہ حوصلے کی غماز ہے اور یہی ان کی شخصیت کا روشن رخ ہے،... وہ بظاہر رند بلا نوش تھے، ان کی رندی اور آزاد روی کے باوجود ان کی شاعری پر گہری دینداری کی چھاپ ہے، ہمیشہ ذات باری کی بندہ نوازی اور کریمی کے طلب گار رہے، غزلیات کے علاوہ ماہر نے چھوٹی اور طویل بحروں میں "خواب" "نالہ و نوا" عرض حال، رقص، حسن، مکالمہ، مکتوب، حقیقت تلخ، سایہ، گفتگو، گردش جام، پڑاؤ، برف باری، گلبانگ، ترنگ جیسی خوبصورت نظمیں کہی ہیں"

ماہر افغانی کے کلام کے مطالعے سے اردو زبان پر ان کے عبور اور مکمل دسترس کا واضح احساس ہوتا ہے، وہ لفظوں کو جس سلیقے اور خوبصورتی سے برتتے ہیں اور اردو اور فارسی کی دلکش ترکیبوں سے بہت ہی مترنم بحروں میں لکھتے ہیں اس سے علم عروض پر بھی انکے عبور کا اندازہ ہوتا ہے۔ ماہر افغانی کی شاعری میں فارسی الفاظ و تراکیب اور تلمیحات کی فراوانی ہے لیکن یہ سب فارسی شاعری کی روایت میں ہے۔

بلوچستان میں اردو شاعری کے حوالے سے ماہر افغانی کا کلام کئی حوالوں سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے، ان کے اشعار میں کوئٹہ اور بلوچستان کے جغرافیائی ماحول کے ساتھ ساتھ یہاں کا وہ مخصوص لہجہ بھی سامنے آتا ہے جو صدیوں فارسی کے زیر اثر رہا ہے۔ اپنے احساسات اور جذبات کو ایک رندانہ انداز میں پیش کرنے کے لیے ماہر افغانی جن الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتے ہیں وہ بلوچستان میں بولی جانے والی اردو کا عکس ہے۔

اردو زبان و ادب کے مرکزی دھارے سے دوری کی وجہ سے ماہر افغانی کے کلام

پر نقادوں اور ادب شناسوں نے کم لکھا ہے لیکن یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس "کان جواہر" کی جب بھی دریافت ہوئی، وہ لمحہ اردو شاعری کا اہم لمحہ ہو گا۔

انتخاب کلام

یہی نہیں ہے کہ پیر مغاں سے ملتی ہے
جو ذوق مئے ہو تو مئے آسماں سے ملتی ہے
نہیں چمن کے جو پردے میں کوئی میخانہ
تو پھر شراب گلوں کو کہاں سے ملتی ہے
میں جب خیال کی جولانیاں دکھاتا ہوں
تو پھر رسید مری آسماں سے ملتی ہے
حجاب روح میں محمل نشین ہے لیلی
صدائے دل جرس کارواں سے ملتی ہے
بڑی دلیل ہے دیرینہ آشنائی کی
لپٹ کے برق جو یوں آشیاں سے ملتی ہے
کوئی مذاق نہیں راز دار دل ہونا
یہ اک سند ہے بڑے امتحاں سے ملتی ہے
شراب ناب کی مستی تو عام ہے ماہر
نگاہ یار کی مستی کہاں سے ملتی ہے

زلف کی افشاں زرافشاں ہے، تو پھر میں کیا کروں
چاند کی کرنوں کا داماں ہے تو پھر میں کیا کروں
دل کی غرقابی کو اک چاہ ذقن کے ساتھ ساتھ

چاہ رنگین زنخداں ہے تو پھر میں کیا کروں
جلوہ شام بہاراں اے فریب حسن ظن
سایہ گیسوئے جاناں ہے تو پھر میں کیا کروں
ناصحا معلوم ہے مجھ کو مآل زندگی
ایک دن شہر خموشاں ہے تو پھر میں کیا کروں
پھول مرجھاتا ہے کوئی غنچہ کھلتا ہے کوئی
یہ ہی آئین گلستاں ہے تو پھر میں کیا کروں
یا ہواؤں میں گلوں کی اڑ رہی ہیں دھجیاں
یا مرا چاک گریباں ہے تو پھر میں کیا کروں
اے دل کم بخت کب تک تیرے غم کا ساتھ دوں
کشتۂ چشم حسیناں ہے تو پھر میں کیا کروں
اس جہان رنگ و بو میں تیرے جلووں کی نمود
اب سپرد کور چشماں ہے تو پھر میں کیا کروں
اک تفاوت اک تکلف اک بڑی حائل خلیج
درمیان کفر و ایماں ہے تو پھر میں کیا کروں
اپنی اپنی قبر میں جاتے ہیں مر کر آدمی
کوئی کافر ہے مسلماں ہے تو پھر میں کیا کروں
روشنی شمع صہبا میرے ساغر میں نہیں
تیری دنیا میں چراغاں ہے تو پھر میں کیا کروں
آسماں کے کان میں ماہر ہلال عید کی
نقرئی بالی درخشاں ہے تو پھر میں کیا کروں

"نغمہ"

اے شمیم نفس و جان نسیم سحر و مشک بجاں، قند دہاں، باد صبا، جان بہار
اے دم روح و دماغ و نظر حسن بہار چمن و قلب و جگر ساغر جانان بہار
محفل نازک افکار حسیں، بزم اشارات و کنایات فسوں ساز جوانی ہے تری
اے خمار نکہہ و کیف و سرور نظر مست کن شاعر رنگیں، گلستان بہار
تیرے ہونٹوں سے وہ پھوٹا ہوا اک نغمہ شیریں و دل آویز و خوش آواز ہوں میں
جسے گاتی ہے کف گل پہ دم صبح دمکتی ہوئی شبنم صفت جوئے خوش الحان بہار
آ مری روح میں آ اور اٹھا پھر وہی اک نغمہ جاں ساز و دل افروز خرام ہستی
جو کہ گایا تھا کبھی پہلے سر انجمن غنچہ و گل میں نے دم آمد خاصان بہار
دیکھ کس رنگ سے، کس ڈھنگ سے مخمور ہوئے نغمہ زن و نغمہ نوا نغمہ سرا نغمہ طراز
ماہر مست ہے سردار شباب و خم و پیمانہ و شہزادہ میخانہ و سلطان بہار

تھام کر یاس کا دامن جو نظر بیٹھ گئی
زندگی ہو کے مری خاک بسر بیٹھ گئی
منزل شوق حقیقت کا ملا جب نہ سراغ
تھک کے آخر کو تمنائے نظر بیٹھ گئی
اک سسکتی ہوئی ہمت کا سہارا لے کر
مری امید اٹھی اٹھ کے مگر بیٹھ گئی
جستجو میں تری وہ خاک اڑائی میں نے
میرے چہرے پہ مری گرد سفر بیٹھ گئی
اس سے دیکھا نہ گیا حسن کا جلوہ ماہر
موج کی طرح اٹھی، اٹھ کے نظر بیٹھ گئی

مستانہ خود کو جانب میخانہ کھینچیے
دیگر امور پر خط پیمانہ کھینچیے

اس جان روز گار کی تصویر دیکھ کر
اک آہ سرد بھی پئے نذرانہ کھینچیے

مانند برگ گل بہ لباس ہلال عید
تصویر نازک لب جانانہ کھینچیے

تقدیر جو رقم کرے اپنے خیال میں
ایک ایک لفظ پر خط پیمانہ کھینچیے

اس کی کمر میں ڈال کے دست دراز کو
آغوش میں زنازش رندانہ کھینچیے

اس طرح تیرتا ہوا آیا ترا خیال
جیسے کہ گیسوؤں میں کوئی شانہ کھینچیے

ماہر کو ایک آہ کی مہلت نہ مل سکے
ایسی کمان ابروئے جانانہ کھینچیے

پہنچ کی بات نہیں دسترس کی بات نہیں
گرفت عشق سے بچنا کسی کی بات نہیں

خدا کی شان کریمی مری نظر میں ہے
گناہگار اگر ہوں تو کوئی بات نہیں

یہ مولوی مجھے اے دوست کیا ڈراتا ہے
خدا کی ذات کوئی مولوی کی ذات نہیں

چمن حقیقت جاوید ہے چمن والو
خزاں کے ظلم و ستم کو مگر ثبات نہیں

تم اپنی دی ہوئی الفت ہی چھین لو ہم سے
غم فراق ہمارے تو بس کی بات نہیں

اک ایسی انجمن زندگی کا رکن ہوں میں
جہاں ریاضت حبس نفس کی بات نہیں

صفائے قلب اگر آدمی کو حاصل ہے
قبول حق میں کوئی پیش و پس کی بات نہیں

اگرچہ دامن گلچیں سے محترز ہیں گل
مگر فرار کسی کے بھی بس کی بات نہیں

علاج درد جگر سوچتے ہو اے ماہر
یہ بات تو ملک الموت کے بھی ہات نہیں

یہ دور بڑا سخت ہے اور تیز ہے رفتار — ہر سمت ہے پیکار
کس وہم میں غلطاں ہو خبردار، خبردار — بیدار ہو بیدار

آرام سے لیٹے ہو اٹھو کام کرو کچھ — اور نام کرو کچھ
اس دور میں آرام کے طالب ہیں نگوں سار — بیدار ہو بیدار

جینے کی تمنا ہے تو ہمت کرو پیدا — جرات کرو پیدا
غیرت کی رمق بھی ہے تو ہو چونک کے ہشیار — بیدار ہو بیدار

خاموشی ساحل سے صدا آتی ہے مجھ کو — ندا آتی ہے مجھ کو
بے کیف ہوں میں بھی نہیں موجوں کی جو یلغار — بیدار ہو بیدار

ایسے ہی اگر زعم میں آلودہ رہو گے — فرسودہ رہو گے

اڑ جائے گا دھجی کی طرح دامن پندار   بیدار ہو بیدار
ماہر یہ عمل گاہ جہاں کا ہے تقاضا   پرچم کرو اونچا
پرچم نہیں اونچا تو ہے کیا طرہ دستار   بیدار ہو بیدار

تو میسر ہو تو دنیا سے کنارا کر لوں
جو مصیبت بھی پڑے ہنس کے گوارا کر لوں
سازش عقل کی تخلیق ہے احساس ستم
کیا میں دیوانہ ہوں جو تم سے کنارا کر لوں
اس قدر بھی نہ ہو اے خواہش گریہ بے تاب
کہ میں شاید کسی آنسو کو ستارا کر لوں
تلخی بادہ نہیں تلخی ایام نہیں
اے غم ہجر تجھے کیسے گوارا کر لوں
صحبت گل تو ہے مرغوب خلائق ماہر
لطف تو یہ ہے کہ کانٹوں سے گزارا کر لوں

حوالہ جات

۱۔ ماہر افغانی، "کن فیکون" ورڈ ویژن پبلشرز، بلیو ایریا اسلام آباد ۱۹۹۳ء
۲۔ شمیم احمد، "سوال یہ ہے" نادر ٹریڈرز، مستونگ ۱۹۸۹ء
۳۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۶ء

نور محمد ہمدم

ولادت ۲۰، فروری ۱۹۲۶ء

فروغ تعلیم کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کرنے کے ساتھ ساتھ بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں جن ہستیوں نے خلوص نیت سے خدمات انجام دی ہیں ان میں پروفیسر نور محمد ہمدم کا نام نامی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آپ کی مادری زبان سرائیکی ہے لیکن آپ کا ارردو اور فارسی کلام بلوچستان میں اردو شاعری کا گرانقدر اثاثہ ہے۔ آپ اپنے استاد آغا صادق حسین کے نقش قدم پر ثابت قدمی سے چلتے ہوئے ادب برائے زندگی کے قائل ہیں اور عاشقان اقبال و مولانا روم میں سرکشیدہ کھڑے ہیں۔

پروفیسر نور محمد ہمدم ۲۰، فروری ۱۹۲۶ء کو ضلع ڈیرہ غازی خان کی تحصیل تونسہ شریف میں سوکڑ کے مقام پر پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار کا نام شیر عالم ملغانی تھا جو اپنے مرشد حضرت خواجہ اللہ بخش صاحب تونسوی کے حکم پر ۱۸۸۴ء میں سوکڑ سے لورالائی آئے اور وہیں کے ہو رہے۔ آپ کا تعلق بلوچوں کے معروف قبیلے رند کی شاخ نکانی اور پھر اس کی شاخ ملغانی سے ہے۔ ابتدائی تعلیم لورالائی میں حاصل کرنے کے بعد آپ پچیس (۲۵) سال تک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے اور پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا، اسی دوران پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں لیکچرر مقرر ہوئے اور گورنمنٹ کالج سبی کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے، جس کے بعد تعمیر نو پبلک کالج کوئٹہ میں شعبہ اردو کے سربراہ کی حیثیت سے علم و ادب کا نور پھیلا رہے ہیں۔ بلوچستان میں آپ کے ہزاروں شاگرد ہیں جن میں بندہ ناچیز بھی شامل ہے۔

پروفیسر نور محمد ہمدم نے اپنی شاعری کا آغاز دور طالبعلمی سے کیا۔ اکتوبر ۱۹۴۵ء میں آپ نے پہلی غزل کہی۔ دوران طالبعلمی آپ آغا صادق حسین سے باقاعدہ اصلاح لیتے

رہے۔ آپ کا مجموعہ کلام "آداب سفر" ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا جس میں غزلوں کے علاوہ نظمیں، نعتیں، حمد، منقبت، مثنوی اور رباعیات شامل ہیں۔

ہمدم صاحب کی شاعری کے موضوعات متنوع ہیں لیکن ان کے کلام کے مطالعے سے واضح طور پر یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ اپنے استاد آغا صادق حسین کی طرح ہمدم صاحب پر علامہ اقبال کی قومی شاعری اور تصوف کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ آپ نے علامہ اقبال کی نظموں پر تضامین بھی لکھی ہیں جو انتہائی اعلی ہیں۔ نوجوانوں کے ساتھ ساتھ آپ نے بچوں کے لیے بھی نظمیں کہی ہیں جن میں "دعا" "سچا بچہ" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

افکار میں دم ہے نہ کوئی زور قلم ہے
قائم جو بھرم ہے تو یہ مولا کا کرم ہے

اے تشنہ لبو آؤ کہ میخانہ ساقی
اقلیم محبت ہے عرب ہے نہ عجم ہے

کثرت ہے خداؤں کی پر آقا مرے نزدیک
جو تیرے حوالے سے نہیں ہے وہ صنم ہے

فیضان نظر اور ہے یوں کوئی کسی کا
فطرت کے ترازو میں زیادہ ہے نہ کم ہے

توبہ کو جو پڑھنا ہو تو پڑھتا ہوں میں طیبہ
طیبہ مری آنکھوں میں کچھ اس طرح رقم ہے

ہستی میں تمنائے محمد ہے وگرنہ
جو بات ہے منجملہ ء روداد عدم ہے

ہر شخص غلامی کی سند ڈھونڈ رہا ہے
قیصر ہے کہ دارا ہے سکندر ہے کہ جم ہے

معراج یہی طرز عبادت ہے کہ ہمدم
دل محو مدینہ ہے جبیں سوئے حرم ہے

میخانہ ساقی کوثر میں پیمانہ بکف ہوں شام و سحر
آسودہ بہ شوق سایہ ء دیوار نجف ہوں شام و سحر
مدحت کے لیے بھی لازم ہے آنکھوں میں نمی ہونٹوں پہ تری
اے ابر کرم بس ایک نظر میں تشنہ صدف ہوں شام و سحر
تم باب شرف، تم بام شرف، تم صبح شرف، تم شام شرف
نازاں ہوں کہ زیر سایہ دامان شرف ہوں شام و سحر
کچھ طعنے کالی راتوں کے کچھ پتھر ضبط کے ہاتھوں کے
ان کا بھی ہدف ہوں شام و سحر ان کا بھی ہدف ہوں شام و سحر
بخشا ہے جو فاتح خیبر نے انداز جہاد پیہم کا
ترکیب میں تنہا لشکر ہوں ترتیب میں صف ہوں شام و سحر
کچھ فرق نہیں پڑتا ہمدم ہوں کعبے یا بت خانے میں
مقصد تو یہی ہے دیدہ و دل حیدر کی طرف ہوں شام و سحر

آنکھوں میں آب و تاب الم ہے قدیم سے
نسبت ہے خاص ہم کو الف لام میم سے
وہ سبزہ ہے ستاروں کی قسمت پہ خندہ زن
وابستہ ہے جو دامن باد نسیم سے
شاداب اس طرح ہو مسافر سے راہ شوق
سیراب جیسے وادی سینا کلیم سے

دنیائے آرزو میں نہیں کوئی شے حقیر
ہر ذرہ آفتاب ہے ذوق سلیم سے
اتنا قریب رحمت پروردگار ہوں
رضوان جیسے باغ بہشت نعیم سے
کرتا ہے جو خودی پہ ہمہ وقت اعتراض
لیتا ہے وہ بھی لقمہ قران حکیم سے
اس کوچے کی ہواؤں سے وہ بات بھی سنی
جو بات رہ گئی تھی چمن کی شمیم سے

کانٹوں کے بھی احساس پہ شاید یہ گراں ہے
پھولوں کے تصرف میں زباں ہے نہ بیاں ہے
انساں ہے تو مقصود شرف ڈھونڈ کہ دریا
محروم گہر ہے تو فقط آب رواں ہے
ہم اپنا ثمر آپ بہ توفیق عمل ہیں
فرمان مشیت نہ سبک ہے نہ گراں ہے
تقویم تگ و دو میں ہے پیری نہ ضعیفی
ہے صاحب کردار تو ہر لحظہ جواں ہے
ہر آہ میں ہے ظرف کے مقدور کی تاثیر
صحرا میں بگولہ ہے تو محفل میں دھواں ہے
نغمے کی صباحت میں جھلکتا ہے مغنی
جو اپنی ہی آواز کے پردوں میں نہاں ہے
ہے بات جو ہمدم ترے انداز طلب میں

ساقی کی مدارات میں وہ بات کہاں ہے۔

تعبیر گری کا موسم ہے یہ خواب سحر کا وقت نہیں
توفیق طلب کی نوبت ہے تقصیر نظر کا وقت نہیں
دوران سفر میں پیڑ گھنے آرام کی دعوت دیتے ہیں
آرام تو کیا اک پل بھی قیام زیر شجر کا وقت نہیں
منزل کا پتہ دیتے ہیں تمہیں بس اتنی فراست کافی ہے
اے راہ رو تاویل نشان راہ گذر کا وقت نہیں
آئی ہے یاد کسی کی بھی آئے ہیں جناب ناصح بھی
اب کیسے انہیں سمجھائے کوئی یہ وقت اثر کا وقت نہیں
کیوں گوہر خاک افتادہ ہیں کیوں جوہر مرگ آمادہ ہیں
کیا وقت سے پوچھیں اہل ہنر یہ اہل ہنر کا وقت نہیں
فانوس جگر کے جلنے دو آنکھوں میں ستارے ڈھلنے دو
کچھ رات ابھی تک باقی ہے آثار سحر کا وقت نہیں
ہمدم کو خطا کی نسبت سے مت دیکھ کہ ایسی صورت میں
توہین نظر ہے دیدہ وری توہین نظر کا وقت نہیں

نہیں کاوش علم و فن آدمی
تو ہے کشتہ ء پیرہن آدمی
ارادوں میں جس کے ہیں موسم اسیر
وہ تنہا بھی ہے انجمن آدمی
مٹاتا ہے جب مرحب ذات کو

تو ہوتا ہے خیبر شکن آدمی
وہ سورج، کہ ہے جو محیط دوام
اسی کی ہے پہلی کرن آدمی
اگر تیری رہ کا مسافر نہ ہو
تو گھر میں بھی ہے بے وطن آدمی
نہ ہو غیر کی آبجو پر نظر
تو دریا ہے تشنہ دہن آدمی
اٹھا جب بھی ہمدم ترا اعتبار
نہ تن آدمی پھر نہ من آدمی

شعار باطل کی ظلمتوں کا رہے گا ہم پر عذاب کب تک
دلیل روشن تری حدوں سے اٹھیں گے آخر حجاب کب تک
یہ کاروان حیات کب تک کفیل رخت سفر نہ ہو گا
خیال کب تک اسیر ساغر نشہ رہین شراب کب تک
ترے جہانوں کے خشک و تر کی خبر سے مطلق ہوں بے خبر میں
مرے سوال نظر کا ساقی ملے گا مجھ کو جواب کب تک
کبھی تو چوب فسوں فگن پر سجے گا پرچم صداقتوں کا
ہنر پہ گرد ملال کب تک فریب موسم گلاب کب تک
رہ گماں پر جو گامزن ہیں مرے یقیں پر بھی خندہ زن ہیں
تسلط ان کا سمندروں پر مرا مقدر حباب کب تک
وطن کی کھیتی کا ہے تقاضا یہی کہ عزم جواں کو لے کر
اٹھو کہ دریا کو کھینچ لائیں نظر بہ سوئے سحاب کب تک

یہ طاعت رسم خود نمائی کسی کو ہمدم نہ راس آئی
جو ناز تجھ کو شباب پر ہے تو پھر یہ تیرا شباب کب تک

آگہی کو ہے سدا اہل نظر کی جستجو
جوہری کو جس طرح سے ہو گہر کی جستجو
صورت خاشاک رہتے ہیں سدا بے خانماں
گھر میں رہ کر بھی جنہیں رہتی ہے گھر کی جستجو
کارواں در کارواں گستاخ لہجوں کے سبب
باد صحرا کو ہوئی دیوار و در کی جستجو
منحصر ہو جن کے زخموں پر جمال رنگ و بو
ایسے بیماروں کو ہو کیوں چارہ گر کی جستجو
ذات میں ڈوبے ہوئے گوشوں سے امید وفا
ہے بریدہ شاخ پر گویا ثمر کی جستجو
اپنے پروانوں کے رشتے ٹوٹنے سے رات بھر
شمع کو بے چین رکھتی ہے سحر کی جستجو
پوچھے ہمدم کسی کامل سے منزل کا پتہ
مجھ کو تو اب تک ہے اپنی رہ گذر کی جستجو

ابر آوارہ کو تاج سر صحرا نہ کہو
دھوپ کو دھوپ کہو دھوپ کو سایہ نہ کہو
گوش احساس پہ احسان شکیبائی ہے
خامشی زخم کی اعجاز مسیحا نہ کہو

ساغر شوق میں جو بات ہے وہ مئے میں کہاں
لغزش رشک صبا منت صہبا نہ کہو
اپنی ہی ذات میں اسباب جفا ہیں کیا کیا
موج دریا کو بھی آسودہ دریا نہ کہو
ذہن احساس کی شدت نے اجاڑے کتنے
ہر جنوں دہر میں پروردہ لیلی نہ کہو
وقت کے ساتھ جو مرہم کو بدل لیتے ہیں
ایسے زخموں کو امیدوں کا اجالا نہ کہو
چند کلیوں کے تبسم پہ نہ جاؤ ہمدم
چند پھولوں کو گلستان تمنا نہ کہو

حوالہ جات

۱۔ ہمدم، پروفیسر نور محمد "آداب سفر" بک سپاٹ، آرچر روڈ کوئٹہ ۱۹۸۸ء

۲۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۸۶ء

رفیق راز

ولادت ۱۹۳۶ء　　وفات ۶، جولائی ۱۹۹۴ء

رفیق راز بلوچستان کے ان ممتاز شعراء میں سے تھے جن کی پوری زندگی شعر و ادب کے فروغ میں گزری اور وہ شعر و ادب کے ذریعے ترقی پسندانہ خیالات کو عام کرتے رہے۔ اپنے استاد آغا صادق حسین کے تتبع میں فن برائے زندگی کے نظریے پر یقین رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ زندگی بھر جدوجہد میں مصروف رہے۔

رفیق راز ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے اور قیام پاکستان سے پہلے ہی کوئٹہ کے مشاعروں میں حصہ لینے لگے۔ ان کی رسمی تعلیم واجبی سی تھی لیکن وہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ فن عروض سے پوری طرح آشنا اور صاحب اسلوب شاعر تھے۔ آپ کا انتقال ۶، جولائی ۱۹۹۴ء کو ہوا۔

مشاعروں کے ساتھ ساتھ کوئٹہ کی علمی اور ادبی مجلسوں میں رفیق راز نہ صرف بھرپور شرکت کرتے بلکہ انجمن سازی اور ادبی تنظیموں کو چلانے میں بھی دم آخر تک مصروف رہے۔ ان کی غزلوں میں حسن و عشق سے لے کر انقلابات زمانہ تک تمام مضامین اس خوبی اور ہنرمندی سے ہیں کہ بیساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ رفیق راز سادہ، آسان اور سہل انداز میں غزلوں کے ذریعے گفتگو کرتے ہیں، وہ خوش ہوں یا خفا، اداس ہوں یا غصے میں، رجائیت اور امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، اور یہی ان کا وصف ہے۔

ان نرگسی آنکھوں میں نمی ہے تو مجھے کیا
اک گھر میں مسرت کی کمی ہے تو مجھے کیا
میں سارے گلستاں کے لیے سوچ رہا ہوں
اک پھول پہ گر دھول جمی ہے تو مجھے کیا

اے دوست کبھی تو بھی مرے غم پہ ہنسا تھا
اب تیری شب غم سے ٹھنی ہے تو مجھے کیا
ہر شے جو چمکتی ہے وہ سونا نہیں ہوتی
یہ بات بری تجھ کو لگی ہے تو مجھے کیا
اب میکدہ بردوش ہے موسم تو بلا سے
ہل چل سی اگر دل میں مچی ہے تو مجھے کیا
اب تک ترے دہکے ہوئے عارض ہیں نظر میں
گلشن میں خزاں آ کے بسی ہے تو مجھے کیا
گلشن کو قفس تو نے ہی اے راز کہا تھا
اب لب پہ ترے مہر لگی ہے تو مجھے کیا

جام مئے رنگیں چھلکائے ایک زمانہ بیت گیا
صحن چمن میں جشن منائے ایک زمانہ بیت گیا
اب تو ہمارا دم گھٹتا ہے کاش ہمیں موت آ جائے
سینے میں اک راز چھپائے ایک زمانہ بیت گیا
جانے کہاں ہے برق تپاں آواز تو دو گلشن والو
تنکوں کے انبار لگائے ایک زمانہ بیت گیا
شاید دریا سوکھ گیا ہے شاید بادل روٹھ گئے
پلکوں پر اک بوند سجائے ایک زمانہ بیت گیا
تیرا تبسم جن میں بسا تھا تیری عنایت تھی جن پر
لوٹ کے وہ دن پھر نہیں آئے ایک زمانہ بیت گیا
لمحہ لمحہ پل پل جن کا قرب میسر تھا ہم کو

وہ بھی ہو گئے راز پرائے ایک زمانہ بیت گیا

اب کے غنچوں کے چٹکنے کی صدا کم آئی
صحن گلشن کی طرف موج صبا کم آئی
حبس کا دور تھا اور مے پہ لگے تھے پہرے
پھر بھی یاروں کو بہکنے کی ادا کم آئی
ہم نے ہر دور میں شعروں کو سمویا لوگو
پھر بھی کیا کیجے یاروں کو حیا کم آئی
میرے دروازے پہ غم دیتے رہے ہیں دستک
میرے حصے میں بزرگوں کی دعا کم آئی
میں نے اک پیڑ لگایا تھا وہ ایسا پھیلا
میرے آنگن میں ستاروں کی ضیا کم آئی
چاندنی پتوں سے چھن چھن کے گری بستر پر
صحن میں دوستو خوشبو کی ادا کم آئی
لوٹ کے آیا نہیں روٹھ کے جانے والا
راز اس سال مدینے سے ہوا کم آئی

ہوں آج برق کی زد پر اٹھا رہا ہوں ستم
پہ اپنے دور کی تاریخ کر رہا ہوں رقم
گزر رہا ہے عجب مرحلوں سے میرا جنوں
نہ زندگی کی تمنا نہ موت کا ہے الم
مرا وجود تو آئینہ ہے صداقت کا

مرے شعور سے قائم ہے آدمی کا بھرم
ستم کی رات میں اپنا لہو جلائیں گے
کسی سحر سے نہ مانگیں گے ہم نگاہ کرم
ہر ایک سمت ہے ابن زیاد ، اور کوفہ
میں تشنہ لب ہوں مجھے شاہ کربلا کی قسم
عوامی دور ہے سب کچھ ملے گا غم نہ کرو
ابھی تو اور بھی صدمے اٹھائیں گے پیہم
کسی کے پیار سے بھی مطمئن نہیں ہوتا
ہمیشہ آگ اگلتا ہے راز میرا قلم

پیارے تیرا شہر عجب ہے سب کچھ دھوکہ لگتا ہے
بہتا ہوا وہ پیار سے بھی' ہوا کا جھونکا لگتا ہے
برف کے پھول گرے ہیں ڈھانپا آنگن اجلی چادر نے
تیرے بنا تو یہ موسم بھی سونا سونا لگتا ہے
لمحہ لمحہ ایک نیا پن انجانی سی ایک خوشی
روٹھنے والا لوٹ آئے گا اب تو ایسا لگتا ہے
یاد ہے تیری یاد کی خوشبو یا تو خود لوٹ آیا ہے
کئی دنوں سے سارا کمرہ مہکا مہکا لگتا ہے
ہونٹ بھی میری محبوبہ سے آنکھیں بھی اس جیسی ہیں
کبھی کبھی تو وہ لڑکا بھی مجھ کو اچھا لگتا ہے
شعر بھی اکثر کہہ لیتا ہے مزدوری معمول بھی ہے
راز کو بیماری ہی کیا ہے اچھا خاصا لگتا ہے

اب کے جو اہل حق کا کہیں نام آئے گا
اس دور کے یزید پہ الزام آئے گا
اپناؤ گے جو راہ صداقت کو دوستو
سقراط تم کو یاد بھر گام آئے گا
مصلوب ہم جو ہوں گے تو یارو رئیس شہر
نظارہ دیکھنے کو لب بام آئے گا
دانشوران قوم ہیں لب بستہ جاں بلب
اب کس کے سر پہ فصل کا الزام آئے گا
اب آئی بھی تو کرب زدہ شام آئے گی
یہ بھول جا کہ کوئی سر شام آئے گا
ترک تعلقات کا لمحہ ہے زندگی
دل میں بسا لیا تو بڑے کام آئے گا
درباری سارے نغمہ و فن کے ہیں مستحق
اور راز بزم شعر سے ناکام آئے گا

اپنا سایا بھی نظر آتا نہیں کیا کر دیا
جانے والے تو نے مجھ کو کتنا تنہا کر دیا
میری خاموشی کے چرچے ان دنوں ہر گھر میں ہیں
تو نے تو مجھ کو محلے بھر میں رسوا کر دیا
اک غم جاناں ہی کافی تھا فقیروں کے لئے
کیوں غم جاناں غم دوراں کو یکجا کر دیا

بجھ گئی ساری امیدیں خاک امنگیں ہوگئیں
شہر دل میں جانے والے نے اندھیرا کر دیا
راز اک جان تمنا کو یہ کیا سوجھی کہ آج
خود تماشائی بنا مجھ کو تماشا کر دیا

خندہ زن لوگ رفیقو مرے کردار پہ ہیں
کتنے الزام محبت کے سزاوار یہ ہیں
سرخ رو ہو کے گیا ہے ابھی مقتل سے کوئی
کس قدر خون کے چھینٹے در و دیوار پہ ہیں
شرپسندوں میں کبھی ہوں کبھی غداروں میں
نت نئی تہمتیں ہر روز میرے پیار پہ ہیں
جتنے چاہو کرو اب شوق سے زنداں تعمیر
آج تو لوگ بھی مائل رسن و دار پہ ہیں
آپ آزادی کے تقریر کے دلدادہ سہی
آپ کی بزم میں پہرے مرے افکار پہ ہیں
راز سازش میں ملوث ہیں فلک بوس محل
کتنے ملکوں کی نگاہیں میرے گلزار پہ ہیں

حوالہ جات

پندرہ روزہ "وادی" کوئٹہ جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۲۲-۲۴

عین سلام

ولادت ۲۸، فروری ۱۹۲۸ء

بلوچستان میں اردو شاعری کے حوالے سے عین سلام ایک ایسا معتبر نام ہے کہ آج نہ تو کوئی ان کی ہمسری کا دعویدار ہے اور نہ کوئی ان کی شاعرانہ عظمت اور بلندی سے انکار کی جرات کر سکتا ہے۔ ان کی شعری زندگی نصف صدی پر محیط ہے لیکن ان کا کلام بلوچستان میں اردو شاعری کی دو سو سالہ تاریخ میں زبان و بیان، فنی محاسن اور موضوعات کے تنوع کی وجہ سے سرفہرست ہے۔ ان کی زندگی اور شاعری ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں جنہیں نہ تو جدا کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی علیحدہ کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ پچاس سال سے جس سنجیدگی، متانت، بردباری، تسلسل اور خاموشی سے بلوچستان میں اردو شاعری کی ترویج و ترقی میں مصروف ہیں اپنی مثال آپ ہیں۔

خود نمائی اور شہرت کی خواہش میں سرگرداں کوتاہ قامتوں کے برعکس، بھیڑ بھاڑ، ادبی گروہ بندی، نمائشی محفلوں حتیٰ کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مشاعروں میں شرکت سے بھی ایک حد تک گریزاں، گرجنے اور چمکنے کی بجائے برسنے پر یقین رکھتے ہیں، تبھی تو وہ شہر کے سب سے کم آمیز شخص ہوتے ہوئے بھی سب کے لیے قابل احترام ہیں۔ ان کی دوستی اور محبت صرف اور صرف اپنی شاعری سے ہے، بے لوث، پرخلوص اور مستقل محبت۔

عین سلام ۲۸، فروری ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار سید عبدالرزاق شاہ بخاری کا تعلق بخاری سادات سے تھا، جو ایک عرصہ ہندوستان میں رہنے کے بعد قیام پاکستان سے پہلے کوئٹہ آئے اور اسلامیہ سکول میں مدرس کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے، عین سلام نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۵ء میں میٹرک کا امتحان اسلامیہ ہائی اسکول سے دیا جس کے بعد وہیں پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا آپ نے الہ آباد بورڈ سے منشی فاضل فارسی اور پنجاب بورڈ سے فاضل اردو کے امتحانات بھی پاس کیے، لیکن بعد میں

آپ نے لیاقت بازار میں "جدید کتاب گھر" کے نام سے خالصتاً" ادبی کتابوں کی دکان کھول لی' ادیب اور شاعر ان کے دوست تھے اور وہ صرف ادبی کتابیں بیچتے تھے' جبکہ سکول کے بچوں کی کتابیں یا اسٹیشنری کا سامان خریدنے والوں کو وہ ساتھ والی دکان میں بھیجتے تھے۔ جب تجارت اور کاروبار شوق کے زیر اثر ہوں تو نقصان یقینی ہوتا ہے اور یہی عین سلام کیساتھ ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں قائم کی ہوئی دکان ۱۹۶۳ء میں بند ہو گئی۔

بلوچستان کو صوبے کا درجہ ملا تو بلوچستان آرٹس کونسل کی بنیاد پڑی' عین سلام کو آرٹس کونسل لایا گیا جہاں وہ آج تک پروگرام افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

عین سلام کا پہلا شعری مجموعہ "چکیدہ" کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا جس میں ان کی آزاد نظموں نے بطور خاص لوگوں کو متوجہ کیا' ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی کتاب میں عین سلام کے پہلے مجموعے کے بارے میں لکھا ہے کہ "عین سلام کی نظمیں (بے ہنر نیکی کا کرب' ایک لڑکی' انتظار' رات کی سازش وغیرہ) ان کا تخلیقی شاہکار سمجھی جا سکتی ہیں' یہ جدید شاعری کے اس گروہ کی غمازی کرتی ہیں جو ندیم' ظہیر' فیض' ابن انشا اور احمد راہی وغیرہ سے عبارت ہے۔ ان میں وہی باتیں ہیں جدید شاعری کا خاصہ ہیں۔ جدید شاعری سماجی ماحول کا بڑھتا ہوا شعور اور عام طور پر بدلتے ہوئے انسانی اقدار کا ادراک ہے۔ عین سلام شعریت کے ملکہ سے بخوبی واقف ہیں' متنوع موضوعات پر قلم اٹھانا جانتے ہیں' ماحول کی ترجمانی ان کا شیوہ ہے' وہ نباض ہی نہیں مرض کی علامات بھی بیان کرتے ہیں' وہ پختہ ذہن کے مالک ہیں اگرچہ وہ جدید نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کا طرز فکر مغربی نہیں مشرقی ہے' ان کی قدریں مشرقی اور ماحول اپنا ہے' پرایا نہیں۔ وہ ایلیٹ وغیرہ کے نقال نہیں' اپنے احساسات اور تاثرات کے شاعر ہیں۔ یہی حال ان کی غزل کا ہے' وہ غزل کی بوقلمونیوں اور عطر بیزیوں سے قاری کے مشام جان کو معطر بناتے اور فرحت بخشتے ہیں۔ ان کا غم ایک شخص کا ذاتی غم ہے۔ ان کی غزلوں سے ان کے ناتمام عشق کی بو خو آتی ہے' وہ روایت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے' علاج غم کے لیے ساقی کی ہی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بعض

اوقات وہ غیر مانوس الفاظ بھی غزل میں سلیقے سے نباہ جاتے ہیں' غزل کے شعروں میں ردیف قافیے کی بندش کا یہ حال ہے کہ سنگلاخ زمینوں میں بھی قافیے نکالنے کی دھن سر پر سوار ہے۔ مثلاً" مذاق کے وزن میں طاق' واق' راق اور حاق کے قافیے نکالے گئے ہیں جو ان کے ماحول میں بولی جانے والی دوسری زبانوں کا پرتو لیے ہوئے ہیں"۔

(کوثر' ۱۹۸۶ء' ۴۵۸)

مرحوم ریاض قمر نے اپنے ایک تاثراتی مضمون میں عین سلام کے بارے میں کیا خوب لکھا تھا کہ " آج سے بیس برس پہلے عین سلام بلوچستان کے کہساروں سے اپنی کتاب (چکیدہ) لے کر پاکستان کے علمی ادبی حلقوں میں ایک ایسے شاعر کی حیثیت سے متعارف ہوا جس کی شاعری میں اپنے عہد کے مسائل کا سماجی شعور ماحول کا ادراک اپنی ذات کا عرفان فن کی پختگی شاعری کا حسن اپنے تمام رنگوں میں نظر آتا ہے۔

"چکیدہ" آج بھی اپنے انفرادی لہجہ' فکری نفاست' غم زمانہ اور غم جاناں کو نئے اسلوب اظہار کے ساتھ' عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آتی ہے چکیدہ کو شائع ہوئے بیس سال گزر گئے ہیں ان بیس برسوں میں دنیا میں کتنے سماجی سیاسی انقلاب آئے ادب و شاعری میں بھی فکری' علمی' شعوری تحریکوں تبدیلیوں نے اظہار کے نئے اسلوب تراشے' یہ حقیقت ہے کہ عین سلام اپنے عہد کے ہر آن بدلتے ہوئے ان تقاضوں ضرورتوں سے باخبر رہا اور اپنی شاعری میں ان کا اظہار کرتا رہا عین سلام کا لہجہ آج کا لہجہ ہے اس کی آواز آج کی آواز ہے اس شاعری میں شعور کائنات کے ساتھ ساتھ غم ذات بھی گہرا نظر آتا ہے۔

لیکن ذات کے کرب کے اظہار میں بھی ایک سنجیدگی' ایک سلیقہ ملتا ہے ایک محبت ملتی ہے۔ تنہائی عین سلام کی ذات کا مسئلہ ہے عین سلام جب اس مسئلے کا اظہار کرتا ہے تو اس کے لئے وہ ایسا اسلوب اختیار کرتا ہے اور اتنے پیار سے بیاں کرتا ہے جس میں اس کی اپنی تہذیبی زندگی' غم کی شائستگی' محبت کا احترام' احساس کی نازکی' دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے یہ دھڑکن عین سلام کی شاعری ہے' طلب ہے' اظہار ہے۔"

غزلوں اور نظموں کے علاوہ عین سلام کی نعتیں ان کی شاعری کا گراں بہا سرمایہ

ہیں۔ ان کی نعتوں میں حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی محبت اور ان کی عظمت کا بیان اتنے شائستہ اسلوب میں ہے کہ دل بے اختیار جھوم اٹھتا ہے۔ نعتوں کے ساتھ ساتھ آپ کی حمدیہ شاعری بھی قابل تقلید ہے۔

زندگی جو تھی کبھی سہل، کڑی لگتی ہے
ہر گھڑی ایک قیامت کی گھڑی لگتی ہے
منزل شوق کبھی صاف نظر آتی تھی
اب تو ہر راہ میں دیوار کھڑی لگتی ہے
کتنا چھوٹا ہوں میں اس دہر کے بت خانے میں
میری تصویر یہاں مجھ سے بڑی لگتی ہے
دل کے صحرا میں بگولوں کے شجر جھومتے ہیں
جب مرے سامنے برکھا کی جھڑی لگتی ہے
اتنی سنجیدہ رخی خوب نہیں اے گل ماہ!
مسکراہٹ تو ستاروں کی لڑی لگتی ہے
وقت کے ساتھ ہوئے اب یہ وفا کے معنی
دوستی تم جسے کہتے ہو، تڑی لگتی ہے
دل جلانے میں اسے لطف بہت آتا ہے
مجھ کو یہ باد صبا سخت سڑی لگتی ہے
کتنی صدیوں کی حکایات سناتی ہے سلام
مجھ کو یہ خاک، جو رستے میں پڑی لگتی ہے

ظرف ہستی بھر کے بھی بھرتا نہیں
آج مر جاتا ہے کل مرتا نہیں

جو نفس بھی ہے فراق آثار ہے
ہم نے کب ہر لمحہ یوں برتا نہیں
منزل آسانی کی صورت دیکھنا
کوئی اب دو گام طے کرتا نہیں
بستیوں میں ہے خداؤں کا نفوذ
کیا خدا سے اب کوئی ڈرتا نہیں
بن گیا کیوں سوگ سینے میں گرہ
جو یہاں جیتا ہے کیا مرتا نہیں
شور دستک ہے در و دیوار پر
کوئی، کان آواز پر دھرتا نہیں
اور بھی رخ ہیں کہیں کئی اس کے، مگر
تم نے دیکھا ہے اسے برتا نہیں
دل اگر شامل نہیں مانند اشک
کچھ اثر حرف دعا کرتا نہیں
اک محبت ہی وہ بازی ہے، سلام
ہار کر جس میں کوئی ہرتا نہیں

شہر کے بام بام پر غلغلہ بہار ہے
سوچ رہا ہوں کیا کروں دست جنوں فگار ہے
وعدہ یار خوش خصال آج بھی برقرار ہے
آج بھی دل ہے بے قرار آج بھی انتظار ہے
اہل خرد سے پوچھنے کیوں ہیں ملول ان دنوں

عشق کا پوچھنا ہی کیا یہ تو ازل سے خوار ہے
درد کے قافلے گئے رونق دل سمیٹ کر
وادی جاں میں دور تک پھیلا ہوا غبار ہے
جانے بہار آتے ہی اہل وفا کو کیا ہوا
اب نہ وہ قصہ جنوں اب نہ وہ ذکر یار ہے
صاحب ننگ و نام ہیں آج بھی بوالہوس تمام
عشق کے ہاتھوں شہر میں آج بھی میر خوار ہے
بیت رہی ہے زندگی کاوش انبساط میں
دامن آرزو مگر خون سے لالہ زار ہے
ناز جمال زندگی پھر بھی سلام اٹھائے جا
مانا وفا کے حلق پر خنجر اعتبار ہے

روغن سنگ و برگ آب ہوا
نفس رنگ و روح تاب ہوا
میں کہ صحرائے تشنگی پانی
تو کہ آئینہ سراب ہوا
سرسراہٹ یہ خون کی پانی
آگ دھڑکن شرر حباب ہوا
نکہت برق نغمگی پانی
شہر چپ میلی چاندنی پانی
ہوس آلودگی خراب ہوا
کہیں تاروں کی روشنی پانی

کہیں ساحل کی بے حساب ہوا
ہستی اضداد دوستی پانی
اشک، غم، عشرت سحاب ہوا
بر، شجر، پھول، آدمی، پانی
رات، دن، لفظ، اور کتاب ہوا
عمر، برف آگ کا وہ کھیل، سلام
جس میں ہوتی ہے کامیاب ہوا

زندگی بھٹکی ہوئی ہے یوں دلوں کے ارد گرد
جیسے ہم سب ہیں سفر میں منزلوں کے ارد گرد
ان کو بھی دیوار رستے کی بنا لیتا ہوں میں
یہ جو ہیں آسانیاں سی مشکلوں کے اردگرد
سامنے کی بے کرانی کم ہو تو شاید کھلے
اور کیا کچھ موج زن ہے ساحلوں کے ارد گرد
شور بڑھتا جا رہا ہے شہر میں چاروں طرف
پھیلتے جاتے ہیں سناٹے دلوں کے اردگرد
خیر و شر سے ماورا شاید فضا کوئی نہیں
زندگی گزری انہیں دو منزلوں کے اردگرد
خواب کے بہتے سرابوں کے کنارے آج بھی
اک ہجوم تشنگاں ہے محملوں کے ارد گرد
صورتیں ہی صورتیں عمروں کے آئینے لئے
سلسلہ در سلسلہ ہیں سلسلوں کے اردگرد

وہ بہت نزدیک میرے آ گیا جانے کے بعد
قربتیں لو دے رہی ہیں فاصلوں کے اردگرد
طوف کعبہ کر لیا، اچھا کیا تم نے سلام
اب ذرا اک رقص مستانہ دلوں کے ارد گرد

نئی زمین نیا آسمان بنایا جائے
اب اس جہاں کو نیا اک جہاں بنایا جائے
عجیب سا یہ ہنر جانتی ہے صرف ہوا
اٹھے جو ابر اسے ابر رواں بنایا جائے
سب اپنی اپنی مسافت میں منہمک ہیں یہاں
اب اس سفر میں کہاں کارواں بنایا جائے
یہ زندگی ہے کبھی لوٹ کر نہیں آتی
تو کیوں نہ اس کو پھر اک داستاں بنایا جائے
نئی جہات کھلیں گی گماں کے امکاں کی
اگر یہ ہو کہ یقیں کو گماں بنایا جائے
مرے لہو میں ہے پوشیدہ اشک غم کی طرح
وہ ایک قطرہ جسے بے کراں بنایا جائے
کہیں درخت نہیں زندگی کے جنگل میں
تو شاخ برق پہ کیا آشیاں بنایا جائے
بہر نفس نئے اسرار کھل بھی سکتے ہیں
اسے ہوا میں نہ یوں رائیگاں بنایا جائے
اداس دشت کی اس تشنگی کے منظر میں

برنگ آب سراب رواں بنایا جائے
شکوک میں یہ فضا مبتلا نہ ہو کیسے
ہر اعتبار کو جب امتحاں بنایا جائے
ضرور جشن بھی ہو گا یہاں مگر پہلے
اس اپنی خاک کو رشک جناں بنایا جائے
یہ منفعت کی سیاست کا جبر ہے شاید
ہر آدمی کو اسیر زیاں بنایا جائے
وہ ایک خواب محل جو مرے خیال میں ہے
اسے میں کیسے بتاؤں کہاں بنایا جائے
بدل رہی ہے یہاں صورتیں محبت بھی
سلام کس کو غم جاوداں بنایا جائے

تسلی

یوں پریشان نہ ہو
موج شکستہ کی طرح
رنگ پریدہ کی طرح
ہاتھ ہے آج اگر تنگ
تو کچھ فکر نہیں
ایک سی رہتی نہیں صورت حال
ایک سے حال میں کب ہیں مہ و سال
ایک اک لمحہ ہے تغیر مثال
دیکھ! اس گلشن ہستی میں

تو رکھ خاطر جمع.........

ایک غنچے کی طرح

اور یقیں جان،

ترا ہاتھ بھی کل غنچہ صفت وا ہو گا

تو زمانے کے لئے خیر سراپا ہو گا

وہ ایک عورت

کہ جس کے چہرے پہ

صبح صادق کی روشنی ہے

سیاہ بالوں میں جس کے

سورج کی چند کرنیں ہیں، بھٹکی بھٹکی

وہ جس کے سانسوں میں

پچھلی راتوں کی تازگی سی

بدن میں خوشبو ہے دل کشی سی

شگفتہ ہونٹوں پہ

پو پھٹے کی سی کیفیت

اور نفیس آنکھوں میں

حسن دانائی کی اداسی ہے

گفتگو میں عجیب سی خوش گوار اپنائیت

رویے تمام، سرما کی دھوپ ایسے

میں سوچتا ہوں

میں اس کی صحبت کی آنچ میں

کاش خود کو کچھ دیر تاپ سکتا

یہ ٹھٹھرا ٹھٹھرا سا نغمہ

جو ذہن میں ہے

الاپ سکتا

حباب لمحہ طراز

وقت کے بے کراں سمندر میں

ہر تموج، حیات کا غماز

ہر سکون ایک مضطرب تغیر

ہر سکوت ایک بولتا انداز

رقص بے جنبش زمان و مکاں

رنگ و آہنگ و بو و شعلہ و ساز

سحر و شام، وقفہ، عمر، نفس

ایک مبہم تحیر اعجاز

اور اس اڑتے ہوئے سمندر میں

ایک انسان کا وجود جواز

اک طلسم گماں، فریب قیاس

اک دھڑکتا، حباب لمحہ طراز

حوالہ جات

ا۔ عین سلام "پکیدہ" قلات پبلشرز مستونگ ١٩٦٦ء

۲۔ عین سلام "ریت رواں" ناشاد پبلشرز کوئٹہ ۱۹۹۶ء

۳۔ کوثر، ڈاکٹر انعام الحق "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۹۶ء

۴۔ ریاض قمر "پندرہ روزہ وادی" کوئٹہ شمارہ نمبر... جون ۱۹۸۵ء

۵۔ عین سلام سہ ماہی فنون لاہور شمارہ نمبر ۱۰۷-۱۰۸، جنوری تا جون ۱۹۹۸ء

۶۔ عین سلام ماہنامہ سیپ کراچی (خاص نمبر) شمارہ نمبر ۶۷

۷۔ آغا محمد ناصر، "عین سلام" روزنامہ کوہستان کوئٹہ دسمبر ۱۹۹۸ء

اختر واحد قاضی

پیدائش ۳۱، مئی ۱۹۳۱ء وفات ۱۸، جولائی ۱۹۹۴ء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب اور بالخصوص اردو شاعری کے حوالے سے مرحوم آغا صادق حسین نقوی کی خدمات کو جس قدر سراہا جائے، کم ہے۔ وہ اپنی ذات میں ہی ایک انجمن نہ تھے بلکہ ان کے حلقہ ء عاطفت میں جو قدم رکھتا وہ بھی انجمن بن جایا کرتا تھا۔ مرحوم اختر واحد قاضی بھی آغا صاحب کے ایسے ہی شاگردوں میں سے تھے۔ اختر واحد قاضی نہ صرف ایک بلند پایہ اور قادر الکلام شاعر تھے بلکہ دیگر اصناف میں بھی ان کی خدمات اور کارنامے قابل رشک ہیں۔ یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ "جدید مسائل حیات" "ویران جوانیاں" "ازدواجی مسرتیں" "بیچاری لڑکی" "الزبتھ ٹیلر" "ناکردہ گناہ" "موت کے ہمسفر" "احمق مجرم" "بند کمرہ" "لیلائے شب" "اخلاق اور گناہ" "گناہ اور ثواب" اور پامسٹری سے متعلق کتاب "ہاتھ بولتے ہیں" جیسی مقبول عام کتابوں کے مترجم اور مولف اختر واحد قاضی کوئٹہ کے رہنے والے تھے۔ اور انہوں نے مذکورہ کتابوں کے علاوہ سینکڑوں انگریزی کہانیوں کو اردو کا جامہ پہنایا جو گزشتہ ربع صدی کے دوران ملک کے معروف ادبی اور نیم ادبی ڈائجسٹوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کا شمار پاکستان کے اہم مترجمیں اور افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔

اختر واحد قاضی کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز روزنامہ "زمانہ" سے ہوا جس کے بعد میں وہ ایڈیٹر بھی رہے۔ اس دوران وہ صحافتی فرائض کے علاوہ شعر و شاعری کی طرف بھی مائل ہوئے اور آغا صادق حسین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ آپ کا پورا نام قاضی محمد اختر حسین ولد قاضی محمد حسین تھا جبکہ واحد تخلص تھا اور صحافتی تحریروں کے لیے اپنے لیے "ابوالبیان صحافی" کا قلمی نام استعمال کرتے تھے۔ آپ نے جامعہ پنجاب سے بی اے آنرز کرنے کے بعد کچھ عرصہ کے لیے M.E.S میں ملازمت کی لیکن چونکہ طبیعت روز اول

سے ہی علم و ادب کی طرف مائل تھی لہٰذا ملازمت ترک کر کے صحافت اور تصنیف و تالیف کی طرف آ گئے۔

اختر واحد قاضی کا مجموعہ کلام تاحال غیر مطبوعہ ہے جو ان کے بیٹوں نعیم اختر قاضی اور وسیم اختر قاضی کے پاس موجود ہے لیکن ان کی جستہ جستہ غزلیں ملک کے معروف ادبی رسائل کی زینت بنتی رہی ہیں۔ ان کا کلام پختہ، دلکش اور زبان و بیان کی حلاوتیں اور فکر و فن کی رفعتیں لیے ہوئے ہے۔

مستقل گردشوں کے سائے تلے
آرزؤں کے آفتاب جلے
ہم نے درسِ حیات ان سے لیا
اب شکستوں پہ ہاتھ کون ملے
سوئے مقتل بھی ہم تو جائیں گے
ساتھ اگر میر کارواں بھی چلے
پرورش پا رہا ہے نورِ سحر
چاند تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے
گردشِ وقت کیا ہے ان کے لیے
غمِ دوراں کی گود میں جو پلے
ولولے زندگی کے اے واحد
دب گئے ہیں غموں کے بوجھ تلے

ہزار کی گئی تدبیر موسمِ گل کی
خزاں میں ڈھل گئی تقدیر موسمِ گل کی
روش روش پہ جو چھینٹے ہیں خون کے یارو
یہی ہے شوخیٔ تحریر موسمِ گل کی
ہزار ڈھنگ تھے جس طرح جس کا جی چاہا
مگر خزاں رہی تفسیر موسمِ گل کی
ہمارے خون سے سینچی گئی ہے شاخِ چمن
نہ اس طرح کرو تحقیر موسمِ گل کی
یہ موجِ لالہ و گل تھی کہ موجِ خوں واحد
نکھر گئی ہے جو تصویر موسمِ گل کی

ایسی بدلی ہے صورتِ حالات
رہ گئی ہے لبوں پہ آ کر بات
شرح مشکل تھی زندگی کی مگر
ایک ہچکی پہ ختم ہو گئی بات
حادثے یوں بھی پیش آئے ہیں
تیرے ہوتے ہوئے بھی کھائی مات
تیرا ملنا بھی کیا قیامت ہے
اور بھی تلخ ہو گئے اوقات
زیست کا درد جاگ اٹھتا ہے
چند لمحے ملے جو غم سے نجات
ایسے کٹتی ہے زندگی واحد
سارے گلشن میں جیسے تنہا پات

کیا بات ہے کہ اہلِ نظر مطمئن نہیں

ہونٹوں کو سی لیا ہے مگر مطمئن نہیں
حسن سلوک دیکھ کے خاموش ہو گیے
سچ تو یہ ہے کہ اہل نظر مطمئن نہیں
ترمیم کر رہا ہوں میں نظم حیات میں
فرمائیں کچھ تو آپ اگر مطمئن نہیں
کوئی عظیم حادثہ در پیش آئے گا
ان گردشوں سے شام و سحر مطمئن نہیں
آئے گا عنقریب کوئی کارواں نیا
ان رہبروں سے راہ گذر مطمئن نہیں
واحد وہ آ رہے ہیں بہاروں کے ساتھ ساتھ
لیکن چمن کی راہ گذر مطمئن نہیں

محب وطن

براؤننگ سے معذرت کے ساتھ

آج سے ایک برس پہلے بھی میں گزرا تھا
انہی پر پیچ ضیا پاش گذر گاہوں سے
اور لوگوں نے عقیدت کا کیا تھا اظہار
میرے رتبہ کو بڑھایا تھا شہنشاہوں سے
چار اطراف نظر آتا تھا لوگوں کا ہجوم
مسکراتی ہوئی گلیاں تھیں کہ ہنستے در و بام
میری ہر بات تھی ہم پلہء قرآن و حدیث
میرے ہاتھوں میں تھی بیمار زمانے کی زمام

سر کٹاتا تھا میرے ایک اشارے پہ جہاں
میری گفتار کا انداز حکیمانہ تھا
باعث فخر تھا ملت کے لیئے میرا وجود
اتنا اونچا مرے معیار کا پیمانہ تھا
لیکن افسوس کہ اک سال ابھی گزرا ہے
پابجولاں مجھے لائے ہیں انہی راہوں پر
آج کوئی نہیں جو ہار گلے میں ڈالے
آج امیدیں امنگیں ہیں مری خاک بسر
میں نے چاہاتھا جبینوں کی سیاہی دھلتی
مرے افکار نے انساں کا ہیولی ڈھالا
لیکن افسوس کسی کام نہ آیا یہ خلوص
کاہے کو روحوں پہ ایمان کا پرتو ڈالا
کل تلک میرے اشاروں پہ تھے یہ رقص کناں
آج مجھ کو لیے جاتے ہیں جو سوئے مقتل
مطمئن ہوں کہ مجھے میرا صلہ دے گا خدا
نہ مری روح ہے زخمی نہ مرا دل گھائل

نوید صبح

یوم پاکستان کے موقع پر

بپا ہوئیں قیامتیں کہ لٹ گئے سہاگ بھی
دلوں میں گھٹ کے رہ گئے تھے شوخ و شنگ راگ بھی
جگر خراش ظلمتوں میں آس ٹوٹتی رہی

خزاں کا ذکر چھوڑیے، بہار لوٹتی رہی
کچھ اس طرح حیات کے اجل سے جوڑ توڑ تھے
بڑی کٹھن تھیں منزلیں قدم قدم پہ موڑ تھے
نگاہ عزم و شوق نے خزاں کے داغ دھو لیے
حسینہ بہار نے بھی خشک لب بھگو لیے
قریب تر ہیں منزلیں سمٹ گئے ہیں فاصلے
کہ مشکبو ہیں اس طرح بہار کے یہ قافلے
نکل چکے ہیں دور ہم حدود تیرہ فام سے
کہ زندگی بھی نام لے رہی ہے احترام سے
بھٹک بھٹک کے قافلے بھی منزلوں پہ آ گئے
تغیرات زندگی کی وسعتوں پہ چھا گئے
ہمیں حسینہ ء سحر حیات سے عزیز ہے
قدم قدم پہ زندگی بھی عزم کی کنیز ہے
نظر میں کھب کے رہ گئی ہے قمقموں کی روشنی
کہ ساز دل پہ گیت گا رہی ہے کائنات بھی
لئے ہوئے بشر کی عظمتوں کا دور آ گیا
تمام کائنات کی تجلیوں پہ چھا گیا

حوالہ جات

ہفت روزہ "تعمیر بلوچستان" مستونگ، جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۱۳ (۲۷، فروری ۱۹۵۷ء)

"چراغ راہ" لاہور، جون ۱۹۵۶ء

صلاح الدین ناسک

ولادت ۹، اکتوبر ۱۹۳۱ء

صلاح الدین ناسک کا تعلق کوئٹہ کے بزرگ شعراء میں سے ہے وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں گزشتہ پندرہ برسوں سے یہاں مقیم ہیں۔ بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں ناسک صاحب نے نہ صرف اخبارات کے ذریعے بلکہ اپنی انتہائی وقیع علمی اور تحقیقی کتابوں کے ذریعے قابل ذکر خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کا شمار انتہائی خوش گو شعراء میں ہوتا ہے، شاعری کے ساتھ ساتھ آپ کے مضامین اور صحافتی تحریریں بھی انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

صلاح الدین ناسک کا اصل نام سید مخدوم شاہ ہے آپ نو اکتوبر ۱۹۳۱ء کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اینگلو عربک اسکول اجمیری گیٹ دہلی، گورنمنٹ ہائی اسکول لدھیانہ اور میو اسکول شملہ سے حاصل کرنے کے بعد آپ نے زمیندار کالج گجرات سے بی اے اور پنجاب یونیورسٹی سے سیاسیات، صحافت اور تاریخ میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں، اس کے علاوہ آپ نے اورینٹل کالج لاہور سے ہندی میں ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ صحافت سے وابستہ ہو گئے اور پاکستان کے مختلف اخبارات میں رپورٹر، سب ایڈیٹر، اسسٹنٹ ایڈیٹر، فیچر رائٹر، بیورو چیف اور نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، آج کل آپ روزنامہ جنگ کوئٹہ میں میگزین ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ کی نظمیں اور غزلیں پاکستان اور ہندوستان کے تمام ادبی رسائل و جرائد میں ۱۹۵۱ء سے شائع ہوتی رہتی ہیں اس کے علاوہ آپ کی کئی کتابیں پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں مجوزہ کتب میں شامل ہیں جن میں درج ذیل قابل ذکر ہیں۔

۱۔ افکار سیاسی (مشرق و مغرب کے اہم سیاسی مفکرین) ۶۰۰ صفحات

۲۔ تحریک آزادی (نظریہ، جدوجہد ۱۸۵۷ء-۱۹۴۷ء) ۳۸۰ صفحات

۳۔ جدید عالم اسلام (شرق اوسط اور کچھ دیگر اسلامی ممالک کی تاریخ) ۵۰۰ صفحات

۴۔ دور مغلیہ، ۷۰۰ صفحات

۵۔ عہد سلاطین دہلی ۲۸۰ صفحات

ان کتابوں کے علاوہ آپ نے ۱۹۷۳ء کے آئین، سر آغا خان (دوم) کی خود نوشت، لبیا کی سبز کتاب اور متعدد ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کے دساتیر کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ آپ نے دستاویزی فلمیں بھی بنائی ہیں جن میں سرہ خولہ ڈیم، ایوبیہ، وغیرہ قابل ذکر ہیں جبکہ ریڈیو کے لیے اسی (۸۰) سے زائد ڈرامے بھی لکھے ہیں۔

ناسک صاحب نظم و غزل کے ساتھ ساتھ نعت، سلام، منقبت، منظوم ترجمے اور افسانے بھی لکھتے ہیں اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔

درد کی آنچ پہ احساس جلے گا کب تک
سوچتا ہوں وہ مرے ساتھ چلے گا کب تک
کوئی آہٹ کوئی سایہ کوئی خوشبو جاگے
حسن امید سراپے میں ڈھلے گا کب تک
اپنے آنگن میں ثمر دار شجر ہے لیکن
خطرہ سنگ مرے سر سے ٹلے گا کب تک
پر نکالے گا تو آرام سے اڑ جائے گا
اک پرندہ مری بانہوں میں پلے گا کب تک
چاندنی رات میں خود گھرے سمندر ڈھونڈھے
اب یہ غم کھائے کہ طوفان ٹلے گا کب تک
جانے والا تو ستاروں سے بھی آگے ہو گا
سونے والے کف افسوس ملے گا کب تک

بیج بویا ہے مگر ریت کے نیچے ناسک
اورر امید یہ باندھی ہے پھلے گا کب تک

میں دل شکستہ ہوں غم آشنا ضروری ہے
صنم کدے کے لیے اک خدا ضروری ہے
یہ میرا جرم کہ قربت کی آرزو مجھ کو
میں جانتا ہوں کہ اس کی سزا ضروری ہے
حصار ذات سے باہر نکل، قریب تو آ
کہ زندگی کے لیے بھی ہوا ضروری ہے
سکون قلب کی خاطر کہاں بھٹکتا ہے
دعا سے پہلے مرض کی دوا ضروری ہے
یہ اور بات کہ تیرا جواب کیا آئے
سوال کام ہے میرا، صدا ضروری ہے
وہ اک کتاب کہ ازبر ورق ورق جس کا
مری سمجھ بھی آئے یہ کیا ضروری ہے

بند سارے شہر میں اک میرا دروازہ نہیں
آنے والے کو مگر غربت کا اندازہ نہیں
رہ گیا تنہا گرفتار جنوں، یہ کیا ہوا
سنگ ہے بوسہ نہیں، خلقت ہے آوازہ نہیں
غور سے کیا دیکھتے ہو میرے چہرے کی طرف
یہ دکھوں کا نور ہے سرخی نہیں غازہ نہیں

دھڑکنوں میں بات سمجھانے کا ہوتا تھا رواج
اب زمانہ ہے کسی کو اپنا اندازہ نہیں

نبض ہے بے ربط سی اور سانس میں ٹھہراؤ سا
رنگ و بوئے گل خدا حافظ' ہوا تازہ نہیں

شہر کی رونق بڑھی تو اجنبیت آ گئی
جیسے اڑتی خاک کے ذروں کا شیرازہ نہیں

عشق ہے اپنی جگہ لیکن انا اپنی جگہ
مختصر سے فاصلے کا اس کو اندازہ نہیں

ظفر مرزا

پیدائش ۱۶' اپریل ۱۹۳۵ء

ظفر مرزا کی شہرت براہوئی کے ایک اعلیٰ پائے کے ادیب' شاعر' افسانہ نگار' ڈرامہ نویس' محقق اور نقاد کی ہے۔ اتنی صفات بیک وقت جب کسی شخص میں جمع ہو جائیں تو بلاشبہ اپنے عہد کا ترجمان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے' اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال صرف براہوئی تک محدود نہیں رکھا اردو اور پشتو ادبیات کو بھی اپنی فکری اور فنی صلاحیتوں سے یکساں طور پر مستفید کیا۔ اردو کے ایک خوش گو شاعر' افسانہ نگار اور مترجم کی حیثیت سے بھی وہ بلوچستان کے ادب میں ایک قابل قدر مقام رکھتے ہیں۔

ظفر علی مرزا ۱۶' اپریل ۱۹۳۵ء کو محمد یوسف کے یہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول فورٹ سنڈیمن (ژوب) سے حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ جس کے بعد آپ کچھ عرصہ "ویلج ایڈ" میں کام کرتے رہے اور پھر ۱۹۶۲ء میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے منسلک ہو گئے جہاں سے اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے ۱۹۹۵ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔

ظفر علی مرزا زمانہ طالب علمی سے ہی علمی و ادبی میں سرگرمیوں ذوق و شوق کے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں۔ کالج کے زمانہ میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے سالانہ میگزین "بولان" کے حصہ اردو کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن ہونے کے علاوہ انہوں نے ریڈیو کے لیے اردو اور براہوئی میں متعدد ڈرامے بھی تحریر کیے جو بہت مقبول ہوئے۔ براہوئی زبان کی پہلی باقاعدہ گرامر مرتب کرنے کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔

اردو میں ظفر مرزا غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں' ان کی غزلوں میں ترنم' نغمگی اور نشاطیہ رنگ پایا جاتا ہے جبکہ نظموں میں روایت اور جدت کے

امتزاج کے ساتھ بہت خوبصورت مقامی فارسی تراکیب انہیں بہت پرلطف بنا دیتی ہیں۔ ان کی شاعری کے موضوعات میں بھی زمین کی محبت اور مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔

شبنمی ہواؤں میں خوشبوؤں کا دھارا ہو
موسموں کے رنگوں میں ایک ہی اشارہ ہو
سرمگیں شاموں میں، رات کی سیاہی میں
شمع کوئی روشن ہو، کوئی تو سہارا ہو
جنگلوں میں سپنوں کے، یاد کے دریچوں میں
یاس کے دیے لے کر منتظر ہمارا ہو
پیاس کے سمندر میں اجنبی جزیروں کا
کوئی ناخدا تو ہو، کوئی تو سہارا ہو
باد تند نے اس کے نقش سب مٹا ڈالے
کون تپتے صحرا میں راہبر ہمارا ہو
اجنبی ظفر ٹھہرا، اپنے شہر میں یارو
وہ جو اک شناسا تھا شہر اس کا سارا ہو

جرس ناقۂ لیلیٰ، خم ابروئے نگاراں، بولان
آب گم، آب رواں، کوہ و بیاباں، بولان
داغ پیمان وفا، نالہ صد عہد جفا
اشک آشفتہ دلاں، رشک نگاراں، بولان
گریۂ سنگ ہے چشموں کی روانی تیری
نالۂ زخم دل سینہ فگاراں، بولان
برف کی شاخ پہ امید کی لو رقص کناں

زخم کے پھولوں سے ہر سمت بہاراں، بولان
رگ جاں کا ہے رگ سنگ سے پیمان وفا
ہر نفس شعلہ بجاں، مست و غزل خواں، بولان
قول چاکر کا ہو یا مست کا ہو ذوق جنوں
ہیں شرارے ترے سب شعلہ بداماں، بولاں
میرے ماضی کے امیں، صبح مسرت کے نقیب
اے محبت کی فضاؤں کے نگہباں، بولان

دل میں یوں آج تری یاد نے لی انگڑائی
پھول زخموں کے کھلے، فصل بہاراں آئی
نوک پہ خار مغیلاں کے جنوں رقص کناں
جگر لالہ میں امید کی لو مسکائی
ابر برسا تو عجب رنگ میں برسا شب غم
جھڑی آنکھوں میں لگی، اور گھٹا سی چھائی
شب فرقت میں پکارا دل بیتاب نے جب
در و دیوار سے اپنی ہی صدا لوٹ آئی
دے کے اغیار کو سرمایہ ہستی اپنا
اجنبی شہر میں اپنے ہی پھرے سودائی
کون کہتا ہے کہ ہم چپ ہیں تو خوش بھی ہوں گے
لب ہیں بستہ کہ کہیں ہو نہ تری رسوائی
شجر سنگ کی شاخوں پہ کھلے برف کے پھول
دل کے ویرانے میں یوں موسم گل لوٹ آئی
آبلہ پا ہے ظفر، وشت جنوں میں تنہا

پھول زخموں کے چنے جس نے سزا یہ پائی

براہوئی نظم کا منظوم ترجمہ

دیں و ایماں ساتھ ہیں تیرے ارادے ہیں اٹل
لرزہ بر اندام نعروں سے ترے دشت و جبل
ہیچ ہیں یہ کر و فر یہ کفر کے سب جل و بل
حیدری قوت تری ساتھی ہے چل آگے تو چل
روندتا جا جو رکاوٹ راہ میں آئے ترے
کر تو بسمہ اللہ خود مولا کمک پر ہے ترے
نور ایماں ساتھ ہے منزل بہت آسان ہے
سایہ ء رحمت ہے سر پر ہاتھ میں قرآن ہے
تو مجاہد ہے امانت قوم کی یہ جان ہے
قوم سے قائم ہے تو اور قوم تیری شان ہے
ہے کوئی طاقت بھلا جو ہمسری تجھ سے کرے
کر تو بسم اللہ خود مولا کمک پر ہے ترے

اجنبی اپنے شہر میں

اے شہر، شہر آشتی، جانے چلی کیسی ہوا
تجھ کو لگی کس کی نظر، یہ ہو گیا کیا ماجرا
تم اجنبی ہم سے ہوئے، ہم اجنبی تم سے ہوئے
ناآشنا لگنے لگے، جو کل تلک تھے آشنا
ہر سو غبار آرزو، ہر سو فضا بے رنگ و بو
وہ سرمئی شامیں کہاں، وہ خوشبوؤں سے پر فضا

وہ خوشنوا، وہ خوش ادا، وہ مہ جبیں وہ مہ لقا
جانے گئے سارے کہاں، لگتا ہے سب اک خواب سا
وہ محفلیں، وہ قہقہے، وہ دوستوں کی ٹولیاں
اک جان دو قالب تھے جو، دکھ درد جن کا ایک تھا
شامیں تری ویراں نہ تھیں، یوں کس بے کس و تنہا نہ
تھیں
اس شہر ناپرساں میں کوئی نہیں پرساں ترا
ناآشناؤں کا ہجوم، ہر سو رواں ہر سو دواں
اک سیل بے باراں نے تجھ کو کیا ہم سے جدا
کچھ زخم ہیں، کچھ درد ہیں، بیتے دنوں کی یاد میں
تنہائی کے ساتھی مرے، سرمایہ ء ہستی مرا

ہم سفر ساتھیو، رات تاریک ہے
کچھ کہو کچھ سنو، رات تاریک ہے
دھندلے دھندلے منزلوں کے نشاں
چل سکو تو چلو، رات تاریک ہے
دل کی بستی کبھی اتنی ویراں نہ تھی
جانے کب صبح ہو، رات تاریک ہے
کل کی کس کو خبر، موت ہے ہمسفر
کل بھی ہو کہ نہ ہو، رات تاریک ہے
آپ ہی اپنے سے کھو گیا ہے ظفر
اس کو آواز دو، رات تاریک ہے

بس کہ قسمت نے دکھائے پتھر
ڈر ہے ہو جائیں نہ سائے پتھر

دوست جانا جسے دشمن نکلا
آستینوں میں چھپائے پتھر

بے بسی کا ہے یہ عالم یارو
بعد مرنے کے بھی پائے پتھر

کون سے زخم دکھاؤ گے بھلا
کون تھا جس سے نہ آئے پتھر

گھر میں رشتوں کی سلیں ہر سو
نکلا گلیوں میں تو کھائے پتھر

کوئے جاناں میں پریشاں ہے ظفر
جانے کیوں آج نہ آئے پتھر

حوالہ جات

"ماہ نو" کراچی، دسمبر ۱۹۶۶ء

ماہنامہ "نوکین دور" کوئٹہ

امداد نظامی

ولادت ۱۴، اگست ۱۹۳۵ء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی خدمت میں ایک ایسی ہستی کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے جو تنہا کئی اداروں پر بھاری ہے۔ اخبارات و رسائل ہوں یا ریڈیو کے پروگرام، ٹیلی ویژن کی رپورٹیں ہوں یا کمپیرنگ، ادبی اور تنقیدی نشستیں ہوں یا مشاعرے، مختلف موضوعات پر ہونے والے سیمنار، مذاکرے اور مباحث ہوں یا تقریریں، امداد نظامی ہر موقع پر چاق و چوبند اور مکمل تیاری کے ساتھ نہایت صاف و شستہ اردو میں نظم و نثر بحث و تقریر کے لیے ہمہ وقت تیار نظر آئیں گے۔ آپ انہیں بروقت دعوت دیں یا اچانک کسی موضوع پر لکھنے یا کچھ کہنے کے لیے کہیں، وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔

بلوچستان میں جدید صحافت کی تاریخ میں جہاں انہوں نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں وہاں شعر و ادب کے فروغ میں بھی ان کا حصہ ہے۔ قطعہ نگاری ہو یا نعت گوئی، سلام ہو یا منقبت، نظم ہو یا غزل، تحقیق و تنقید ہو یا تحریر و تقریر، نظامی صاحب اپنے علم و فن کے جلوے ہر جگہ روشن رکھے ہوئے ہیں۔

امداد علی نظامی ۱۴، اگست ۱۹۳۵ء کو ڈیرہ غازی خان میں پیدا ہوئے، آپ کے والد کا نام محمد شفیع تھا، ابتدائی تعلیم ڈیرہ غازی خان سے حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۳ء میں میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی نمبروں میں پاس کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اور بقول نظامی صاحب مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے وسیلہ نہ تھا اس لیے ریڈیو اور صحافت سے تعلق پیدا کیا، اسی آمدنی سے تعلیم مکمل کی۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور (یونیورسٹی آف پنجاب) سے ایم اے اور بعد میں جامعہ کراچی سے اطلاقی نفسیات میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ مختلف روزناموں میں بحیثیت صحافی خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں آپ کوئٹہ آئے اور روزنامہ جنگ کوئٹہ سے منسلک

ہو گئے، جس کے بعد آپ روزنامہ زمانہ میں کام کر رہے ہیں۔

آپ نے "نمک دان" اور "وجدان" کے نام سے دو رسالوں کا اجراء بھی کیا جو بوجوہ جاری نہ رکھ سکے۔

آپ کی علمی، ادبی، نشریاتی اور صحافتی خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۸ء میں صدر پاکستان نے تمغہ امتیاز سے نوازا اور کراچی یونیورسٹی نے نشان سپاس پیش کیا۔ مختلف اور متنوع موضوعات پر آپ کے سینکڑوں مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ آپ نے کئی ادبی رسالے بھی نکالے اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔

بلوچستان میں اردو شاعری کے فروغ میں امداد نظامی نے بھرپور حصہ لیا آپ کی ادبی، سماجی اور ثقافتی تنظیموں کے روح رواں ہونے کے ساتھ ساتھ مشاعروں اور ادبی و سماجی تقریبات کے انعقاد میں بھی بھرپور حصہ لیتے رہے ہیں۔

نظامی صاحب اردو کے علاوہ فارسی اور سرائیکی میں بھی شعر کہتے ہیں۔ وہ غزل کے علاوہ نظم اور قطعہ نگاری بھی کرتے ہیں، ان کے قطعات برسوں سے مقامی اخبارات میں چھپتے رہے ہیں۔

وجہ تسکیں تو نہ تھی انجمن آرائی بھی
روح کے درد جگانے لگی تنہائی بھی
آپ کہتے ہیں تو کہہ لیں مجھے سودائی بھی
اس میں پنہاں ہے مگر آپ کی رسوائی بھی
تیری محفل میں جو آئے تو یہ احساس ہوا
زندگی رنگ بھی ہے نور بھی رعنائی بھی
رات کے ساتھ ہی کھلتے گئے یادوں کے کنول
جگمگاتی ہوئی گزری شب تنہائی بھی
پھول کھلتے ہیں تو زخموں کی مہک آتی ہے
کتنا بدلا ہے مذاق چمن آرائی بھی

یہ ہوس رنگ پہ آئی کہ کرم عام ہوا
ہم نے دیکھے ہیں سر دار تماشائی بھی
کچھ نہ بخشا تھا زمانے نے تو چھینا بھی نہ تھا
تم نے تو چھین لی مجھ سے مری تنہائی بھی

اے بیاباں کی ہوا آشفتہ سر میں بھی تو ہوں
مجھ سے کترا کر نہ چل گرم سفر میں بھی تو ہوں
اے نگار فصل گل میری طرف بھی اک نظر
اس گلستاں میں خزاں دیدہ شجر میں بھی تو ہوں
کیوں مجھے دل سے بھلاتے ہو رفیقان سفر
لمحہ پیما رہگزار وقت پر میں بھی تو ہوں
کیوں کسی کی کم نگاہی کی شکایت ہو مجھے
اپنے زخموں کی کسک سے بے خبر میں بھی تو ہوں
اپنے غم دل میں چھپا کر مسکرانا کم نہیں
تو کہ یکتائے زمانہ ہے مگر میں بھی تو ہوں

چڑھا ہوا ہے جو دریا اتر بھی سکتا تھا
یہ سیل خوں مرے سر سے گزر بھی سکتا تھا
عذاب سہنے کی عادت نے سربلند رکھا
میں لڑکھڑاتا تو گر کر بکھر بھی سکتا تھا
ترے خیال نے جینے کا حوصلہ بخشا
وہ بوجھ دل پہ رہا ہے کہ مر بھی سکتا تھا

میں زخم کھا کے بھی ہنستا رہا مری عادت
وہ چاہتا تو مرے زخم بھر بھی سکتا تھا
خزاں ہی روکتی رستہ اگر بہار نہ تھی
تھکا ہوا تھا مسافر ٹھہر بھی سکتا تھا
کسی کو میرے گہر کی پرکھ نہ تھی ورنہ
میں قلزموں کی تہوں میں اتر بھی سکتا تھا
میں جس قدر بھی اڑا اس نے ڈھیل دی مجھ کو
وہ بے نیاز مرے پر کتر بھی سکتا تھا

صرف دو لفظوں کی ہے ساری حکایت میری
کٹ گئی عمر نہ کٹ پائی مسافت میری
میری آواز الگ' سوچ الگ' سوز الگ
کوئی کرتا بھی تو کس طرح حمایت میری
مجھ کو ماحول کی ظلمت نے ابھرنے نہ دیا
طلعت نوع بشر گرچہ تھی طلعت میری
کھوٹے سکے کی طرح لوگوں نے ٹھکرایا ہے
میں سمجھتا تھا کہ دولت ہے محبت میری
مجھ کو اعزاز ملا بھی تو کب اعزاز بنا
لٹ گئی کوچہ و بازار میں حرمت میری
حاصل حسن طلب صرف یہی ہے اے دل
شاعری سمجھی گئی تھی جو محبت میری
نقد فن پر تھا عبث ناز نظامی مجھ کو

میرے کچھ کام نہ آئی یہ ریاضت میری

رفیقان سفر کیا فائدہ آپس کی رنجش سے
سبھی ہیں زخم خوردہ رہنماؤں کی نوازش سے
ہم اپنے روز و شب کا حال خود سے بھی چھپاتے ہیں
شکایت ہے مگر تقدیر کی پنہاں نگارش کی
زمیں اور اس کی زرخیزی سے کچھ رشتہ نہیں اپنا
مگر رکھتے ہیں امیدیں ہمیشہ ابر و بارش کی
جو پودا جڑ پکڑ لے پھوٹتی ہیں اس سے سو شاخیں
مری محرومیاں منسوب ہیں بس ایک خواہش سے
سکوں کیا زخم دل کچھ اور بھی لو دینے لگتے ہیں
بھڑک اٹھتے ہیں یہ شعلے کسی کے حرف پرسش سے
ہجوم انجمن سے کوئی ہم آواز تو ابھرے
بدل سکتا نہیں ماحول تنہا میری کاوش کی
نظامی اب جہان فن میں سرداری انہیں کی ہے
جو عاری ہیں ہنر سے اور خالی فکر و دانش سے

شعلہ

مجھ میں پنہاں ہے یہ جو اک شعلہ
جس میں سوزش بھی ہے لطافت بھی
روشنی بھی ہے اور حرارت بھی

اک چبھن بھی ہے ایک لذت بھی

شعلہ جو آگہی ہے عرفاں ہے
جو مری زندگی کا ساماں ہے
جو تشخص کا میرے عنواں ہے
جس پہ میرا وجود نازاں ہے

سوچتا ہوں مگر کہ یہ شعلہ!
جذب و عرفان و آگہی کا دیا
کس خرابے میں ہے جلایا گیا
دور تک ظلمتوں کا ہے سایہ
کوئی سننے نہ دیکھنے والا
اس فضا میں یہ ضو فگن شعلہ
اپنی تابانیاں کسے دے گا

مجھ میں پنہاں ہے یہ جو اک شعلہ
جانے کس جرم کا ہے خمیازہ
جانے کب تک مجھے جلائے گا

پروفیسر ربنواز مائل

ولادت ۱۰ دسمبر ۱۹۳۵ء

ایک ایسی جگہ جہاں تقریباً" سو فیصد لوگوں کی مادری زبان پشتو ہو اور عام بول چال کی زبان بھی اردو نہ ہو وہاں اردو میں تسلسل کے ساتھ چالیس سال تک شعر کہنا واقعی کارے دارد ہے۔ بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں لورالائی کے جس خاندان نے قابل قدر حصہ لیا ہے اس میں پروفیسر ربنواز مائل اور ان کے بھائی سعید گوہر بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ربنواز مائل نے نہ صرف اپنے سینکڑوں شاگردوں کے ذریعے بلوچستان میں اردو زبان و ادب کو پھیلانے اور افضل شوق، علی کمیل قزلباش جیسے بیسیوں ہونہار شاعروں کی ابتدائی تربیت کا فریضہ انجام دیا بلکہ اپنے بھائیوں کے شعری ذوق کو بھی پروان چڑھانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔

پروفیسر ربنواز مائل ۱۰، دسمبر ۱۹۳۵ء کو لورالائی میں پیدا ہوئے، آپ کے والد حکیم بہادر نواز علی شیرزئی کا تعلق اورکزئی قبیلے سے تھا جو ایک صدی قبل نقل مکانی کرکے لورالائی میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ ایک نہایت علم دوست، روشن دماغ شخص تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دی انہیں زیور علم سے آراستہ کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق بھی دیا۔ ابتدائی تعلیم لورالائی اور کوئٹہ میں حاصل کرنے کے بعد مائل صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کا امتحان ۱۹۷۰ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا جس کے بعد وہ ۳، مئی ۱۹۷۱ء میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ انہوں نے زندگی بھر بلوچستان کے مختلف علاقوں میں اردو کی تدریس کے علاوہ نوجوان طالبعلموں میں ادبی ذوق کی نشو و نما کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں اور ۹، دسمبر ۱۹۹۵ء میں دکی کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل کوئٹہ میں مقیم ہیں اور اسی جذبہ سے تخلیق و تنقید میں مصروف ہیں۔

مائل صاحب ایک درویش صفت، سیدھے سادے اور نیک انسان ہیں وہ تصوف

کے سلسلہ نقشبندیہ، مجددیہ، بنوریہ سے منسلک ہیں اور اپنی خوش خلقی، سادگی اور اخلاص کی وجہ سے بلوچستان کے تمام ادبی حلقوں میں محبت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ مائل نظم و نثر پر یکساں عبور رکھتے ہیں ان کی نظمیں بطور خاص پسند کی جاتی ہیں۔

دائم کیا ہے

خدا کی ہستی عجیب تر ہے
ڈرائے مجھ کو فنا کے ہاتھوں
لہو میں لتھڑے ہوئے ورق ہیں
کتاب حسن حیات کے سب
کتاب حسن حیات دے کر
کہا تھا اس نے، زمیں حسیں ہے
ہوا کی جیبوں میں باغ و گل ہیں
ستارے، شمس و قمر تمہارے
غلام حکم طلب رہیں گے
زمانہ گزرا سنے ہوئے اس وفا کتھا کو
چراغ فکر و نظر کو کیا دیں
لہو پراتا کہ خون تازہ

رشتہ ہوا سے دائم ہے

مرا رشتہ ہوا سے دائم ہے
اس ہوا نے عجیب ذوق دیے
پرفتن سے ہزار شوق دیے

مرا رشتہ ہوا سے دائم ہے
اس نے گلشن کھلائے ہیں کیسے
خواب گھر گھر سجائے ہیں کیسے
مرا رشتہ ہوا سے دائم ہے
اس سے زندہ ہوں سانس لیتا ہوں
زیست جیسے جہاں کو دیتا ہوں
میرا رشتہ ہوا سے دائم ہے
تازہ تر اس سے فکر ہے میری
زندگی محو ذکر ہے میری
میرا رشتہ ہوا سے دائم ہے
یہ نہ ہو تو جہاں دکھے گا کیا
خواب کتنے بنیں ملے گا کیا

حاصل صد عمر

لفظ مری تصویر ہوئے کب
ہر دن سوچوں
جملے ایسے ہی سب لکھوں
جیسے اس بارے میں ہوں شب
کیا دکھلاؤں
شعر یہ لفظوں میں کچھ اپنے
ہلکی سی تصویر لب ہیں
عمروں عمروں، جیسے اتنا

زندگی بہ استعارہ سفر

زندگی جس طرح کے سفر کا نام ہے
پہلے نوع نوع کی صعوبتوں کا سا
پھر منزل پر پہنچنے کی خوشیوں کا سا
اس میں بیابان ہی
رستوں میں زیادہ آتے ہیں
کہ جیسے اس کی ہر اک طلب سے
حقیقت منزل دور تک
یہی روپ، بدرجہ اتم دھارے ہوئے ہو

استاد رشید انجم

ولادت ۲۱ اپریل ۱۹۴۳ء

بلوچستان میں اردو شاعری کی ترویج و ترقی میں آغاصادق حسین، علامہ عیش فیروزپوری اور ارشد امروہوی کے بعد استاد رشید انجم کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ آپ نے بلوچستان کے بااستعداد نوجوانوں کو فن شاعری کی تربیت دینے اور شعرگوئی کے ذوق کو عام کرنے کے لیے نہ صرف باقاعدہ "انجمن دلستان بولان" کی بنیاد ڈالی بلکہ کوئٹہ میں قومی اور بین الاقوامی مشاعروں کا انعقاد بھی کیا۔ آج بلوچستان کے جن نوجوان شعراء کے مجموعے طباعت سے آراستہ ہو کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں ان میں بیشتر کا تعلق استاد رشید انجم کے شاگردوں سے ہے۔ وہ کرنل فضل اکبر کمال ہوں یا زاہد آفاق، ناگی عبدالرزاق خاور ہوں یا فاروق فیصل، رفیق کمبوہ ہوں یا صدف چنگیزی اور مبارک صابر، ان تمام نوجوان شعراء نے شعر و سخن کی بنیادی تربیت استاد رشید انجم سے حاصل کی ہے۔

استاد رشید انجم ۲۱ اپریل ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد بزرگوار کا نام عبدالرحیم خاں اثر لکھنوی تھا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے شاعری کا آغاز بارہ سال کی عمر میں کیا اور شاعری میں آپ کے استاد امیر مینائی تھے۔ استاد رشید انجم ۱۹۷۸ء سے کوئٹہ میں مقیم ہیں۔ اور چند سال مختلف کام کرنے کے بعد آج کل آپ تعمیر نو پبلک اسکول میں پڑھانے میں مصروف ہیں۔

آپ غزل اور نظم کے علاوہ مرثیے بھی لکھتے ہیں اور بلوچستان میں مرثیہ نگاری کی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کے اشعار میں زبان و بیان کی صفائی، جذبوں کی سچائی، الفاظ کا تقدس و احترام بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔

دیکھا جو مڑ کے میں نے ادھر اتفاق سے
ٹکرا گئی نظر سے نظر اتفاق سے

نکلا تھا اپنے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے
میں آ گیا ہوں لوٹ کے گھر اتفاق سے

کھولے ہیں جب ہوا نے دریچے مکان کے
اک حادثہ ہوا ہے مگر اتفاق سے

پتھر جدھر سے آئے تھے میرے مکان پر
اک صورت آشنا تھا ادھر اتفاق سے

جب راستے کی دھوپ ہو اپنے عروج پر
ملتا ہے سایہ دار شجر اتفاق سے

اتنا لہو جلاؤ کہ پھر تیرگی نہ ہو
یہ وقت آ بھی جائے اگر اتفاق سے

انجم جہان فن میں نمایاں ہے اختلاف
رہتے نہیں یہ اہل ہنر اتفاق سے

مسکرایا ہنسا سلام کیا
کس ادا سے اسیر دام کیا

فیصلہ پھر کبھی نہیں ہو گا
فاصلوں کو اگر تمام کیا

وقت رسوا نہ کر سکا مجھ کو
میں نے خود اپنا احترام کیا

دشمنوں کو بڑی ندامت ہے
بد دعا نے دعا کا کام کیا

وہ کسی کا نہ ہو سکا انجم

دل لگا کر جو میں نے کام کیا

کتنا روشن ہے تصور تری انگڑائی کا
راستہ روک دیا ہے مری بینائی کا

میں سمندر ہوں کہیں ڈوب نہ جانا مجھ میں
تم کو اندازہ نہیں ہے مری گہرائی کا

اپنے زخموں کا مداوا تو میں کر لوں گا مگر
وہ کہاں ہیں جنہیں دعویٰ تھا مسیحائی کا

اب تماشا جو بنا ہوں تو یہ احساس ہوا
ایک مدت سے گنہگار ہوں تنہائی کا

میں تجھے شہرہ آفاق بنا سکتا ہوں
کوئی احسان اٹھا لے مری رسوائی کا

مکتب فکر میں آ اپنے قبیلے سے نکل
بات کر مجھ سے اگر زعم ہے دانائی کا

زندگی بیت گئی شہر بتاں میں انجم
اب فرشتوں سے ارادہ ہے شناسائی کا

مری سرشت میں ہے دشت بے اماں سے گریز
میں آدمی ہوں مجھے چاہیے یہاں سے گریز

بڑے سکون سے اب دھوپ کے حصار میں ہوں
سکھا دیا مجھے سورج نے سائباں سے گریز

میں درمیان سے شاید کچھ اور لکھ دیتا

اگر میں جانتا عنوان داستاں سے گریز
میں اپنے درد کا عادی ہوں ہوش رکھتا ہوں

مجھے قبول ہے بے وقت کی اذاں سے گریز
خزاں شکار تو ہم خود ہی ہو گئے ورنہ

پروں میں جان تھی ممکن تھا آشیاں سے گریز
کھلی فضاؤں میں پرواز اس لیے کی تھی

مری اڑان کا مقصد تھا باغباں سے گریز
جدھر بھی جاؤ گے پہچان لیں گے لوگ تمھیں

مجھے مٹا کے کرو گے کہاں کہاں سے گریز
وہیں پہ گھیر لیا یاد رفتگاں نے مجھے

مری نگاہ نے انجم کیا جہاں سے گریز

یہاں خلش نہیں دل میں لبوں پہ آہ نہیں
یہ جلوہ گاہ مری انتظار گاہ نہیں

مجھے نہ دیکھ توازن میں جب نگاہ نہیں
میں آئینہ ہوں ترے واہموں کی راہ نہیں

شباب، حسن، ادائیں، نظر، فریب نگاہ
یہ سب گناہ کی ترکیب ہیں گناہ نہیں

سپردگی کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں
مرے ضمیر کا وہ شخص سربراہ نہیں

یہ فیصلہ بھی سر بزم آج ہی ہو گا
ترا حجاب نہیں یا مری نگاہ نہیں

یہ صرف ہم ہیں جو تم کو قبول کرتے ہیں
ہمارے بعد تمھارے لیے پناہ نہیں

قدم بڑھاؤ یہ موقع بہت غنیمت ہے
کوئی چٹان ابھی درمیان راہ نہیں

مجھے تو حفظ مراتب کا پاس ہے انجم
میں ایک مرد قلندر ہوں بادشاہ نہیں

جانب دشت رواں ہے مرے گھر کا سورج
ڈوب جائے نہ ادھر جا کے ادھر کا سورج

میں نے دیکھا ہے اسے چاند کے پس منظر میں
شام تک ساتھ رہا تھا جو سفر کا سورج

آنسوؤں کا وہ دھندلکا تھا مری آنکھوں میں
صاف دیکھا نہ گیا مجھ سے سحر کا سورج

فکر کو روشنی دیتا ہے بیاباں کا سکوت
اس خرابے سے نکلتا ہے سحر کا سورج

اب یہ عالم ہے اسے دیکھ کے جل جاتا ہوں
جس کا چہرہ تھا کبھی میری نظر کا سورج

تشنگی، دھوپ، مسافت، کوئی سایہ نہ شجر
شام سے پہلے مرے سر سے نہ سرکا سورج

دھوپ بڑھتی ہے تو گھٹ جاتے ہیں سائے انجم
رخ بدلتا ہے سر راہ جدھر کا سورج

پرندہ کیوں کسی احساس سرگراں میں رہے
ہوا میں اڑنے سے بہتر ہے آشیاں میں رہے

فضا خراب ہے امید نو بہار نہ رکھ
مزا تو جب ہے یہی آسرا خزاں میں رہے

غضب خدا کا وہی لوگ سنگ راہ بنے
تمام عمر جو شیشے کے سائباں میں رہے

وہ اپنے لب پہ تکلم کا بوجھ رکھ نہ سکا
مری زبان کے کانٹے مری زباں میں رہے

وہاں سے گرد کدورت کا پھر گزر نہ ہوا
مرے خلوص کے آئینے جس مکاں میں رہے

اگر سکون سے جینا ہے اس ادا سے جیئو
زمین خواب ہو تعبیر آسماں میں رہے

ہمارے سر سے گزرتے ہیں پاؤں کے پتھر
خطا یہ ہو گئی شیشے کے سائباں میں رہے

اڑے ہواؤں میں انجم تو یہ مقام ملا
خط غبار کی مانند کہکشاں میں رہے

حوالہ جات

بوئے مادران، کوئٹہ۔ خصوصی اشاعت جولائی ۱۹۹۸ء

صاحبزادہ حمید اللہ

ولادت ۷ ۱۹۴۳ء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کو فکری اور نظری حوالوں کے ساتھ پوری دیانتداری، سنجیدگی اور شعوری کوشش کے ساتھ فروغ دینے میں صاحبزادہ حمید اللہ کی خدمات نہ صرف قابل قدر ہیں بلکہ قابل تقلید بھی ہیں۔ آپ اسلامی روایات کے سچے پاسدار اور اردو کو ملت اسلامیہ کی ایک عظیم زبان کے طور پر پاکستان میں رابطے کا ذریعہ بنانے کے لیے روز اول سے کوشاں ہیں۔ آپ نعرہ بازی اور وقتی و سطحی شہرت کی بجائے ادبی و علمی تخلیق و تنقید میں اپنی مثال آپ ہیں۔ بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں آپ نے جہاں علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات و مضامین کے حوالے سے اردو میں اپنے تخلیقی جوہر سے گلہائے رنگا رنگ کا اضافہ کیا ہے وہیں چھتیس برسوں سے طالبعلموں کو ادب کی طرف مائل کرنے لے لیے پوری سنجیدگی اور دلسوزی کے ساتھ مشغول ہیں۔ بحیثیت کالم نگار آپ کے تحریریں بلوچستان کے مختلف اخبارات میں چھپتی رہتی ہیں اور اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے خاص و عام میں مقبول ہیں۔

میانہ قد، شرعی سفید و سیاہ داڑھی، سفید قمیص شلوار اور مشہدی لنگی میں پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ پہلی نظر میں بلوچستان کے روایتی علماء کی طرح کسی جامع مسجد کے خطیب نظر آتے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو کہ آپ کا خاندان پانچ پشتوں سے پشین کے معروف علمائے دین کا خاندان ہے۔ آپ کے دادا مولانا محمد عظیم کو ان کی علمیت، دینداری، تقویٰ اور پرہیز گاری کیوجہ سے ''صاحبزادہ'' کے لقب سے پکارا جانے لگا' آپ کے والد صاحبزادہ عبدالرحمن آغا' اپنے علم و فضل کی وجہ سے نہ صرف پورے علاقے میں معروف تھے بلکہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے' صاحبزادہ عبدالرحمن نے اپنے بچوں کو علوم اسلامی کی تعلیم دینے کے بعد جدید اسکولوں اور کالجوں میں حصول علم کی غرض سے بھجوایا اور یہ ان کی بہترین

تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے کہ آج صورت و سیرت، گفتار و کردار، علم و ادب، تحقیق و تنقید اور تحقیقی صلاحیتوں کی وجہ سے ان کا خاندان بلوچستان کا سرمایہ افتخار ہے۔

پروفیسر صاحبزادہ حمید اللہ المتخلص بہ حیف ۱۹۳۷ء میں پشین کے نواحی گاؤں فیض آباد میں پیدا ہوئے، آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار صاحبزادہ عبدالرحمن آغا سے گھر پر ہی حاصل کی، اور عربی صرف ونحو، پنج گنج فارسی، گلستان و بوستان، نور ظلم، قدوری، قصہ، اور قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ مڈل اسکول پشین میں داخلہ لیا۔ پرائمری اور مڈل کے امتحانات میں وظائف حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۶ء میں میٹرک کا امتحان سائنس کے مضامین کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اسی سال گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ میں داخلہ لیا۔ گورنمنٹ کالج کوئٹہ اس زمانے میں بلوچستان کے سب سے اہم اور بہترین تعلیمی ادارہ کی حیثیت رکھتا تھا، صاحبزادہ حمید اللہ نے کالج کے اساتذہ اور طلبا سے بہت کچھ حاصل کیا اور آپ کے ذاتی جوہر کالج کی فضا میں مزید نکھر کر سامنے آگئے۔ ۶۰-۱۹۵۹ء میں آپ کالج میگزین کے ایڈیٹر بنے، اس زمانے میں آپ نے جو مضامین لکھے ان میں "اردو شاعری میں حالی کا مقام" "اردو کو بچائیے" "اکبر الہ آبادی کی شاعری" اور سیرت رسول اللہ کا مختصر خاکہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ انہی دنوں آپ کی ایک غزل بھی کالج میں خوب مشہور ہوئی۔

مری ہستی سراپا درد و غم ہے
مگر تو، سر بسر لطف و کرم ہے

۱۹۶۰ء میں بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا، جہاں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم اور غلام حسین ذوالفقار جیسے نامور استاد پڑھاتے تھے لیکن وظیفہ نہ ملنے کی وجہ سے صاحبزادہ کو دو ماہ بعد اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر بادل نخواستہ بصد حزن و یاس واپس پشین آنا پڑا۔

۱۹، نومبر ۱۹۶۰ء میں سینئر انگلش ٹیچر کی حیثیت سے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے لیکن اردو میں ایم اے کرنے کی شدید خواہش کی وجہ سے پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے

میں بھی روز و شب مصروف رہے اور بالآخر ۱۹۶۳ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا، ...اور اسی سال گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے۔

پڑھنے لکھنے سے جنوں کی حد تک ان کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ لیکچرر بننے کے بعد بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور ۱۹۶۴ء میں ایم اے (عربی)، ۱۹۶۵ء میں ایم اے (فارسی)، ۱۹۶۸ء میں ایم اے (اسلامیات) اور ایم اے سیاسیات اور ایم اے تاریخ کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے۔

صاحبزادہ حمید اللہ اردو اور پشتو میں کئی کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں "فن اور تکنیک" بطور خاص قابل ذکر ہے۔

حسن، یہ افتخار کیا کم ہے
ترے در پر ہر اک کا سر خم ہے
چاندنی دم بخود، ہوا چپ ہے
شہر میں ایک ہو کا عالم ہے
اے ہوا، چل ذرا پرے ہٹ جا
دوستوں کا مزاج برہم ہے
کوئی ملتا نہیں انیس و جلیس
راہ کا سنگ ہے جو محرم ہے
ہر طرف ہے جمال کا منظر
حیف دنیا کی زندگی کم ہے

نہیں وہ آنکھ، جس میں نم نہیں ہے
نہیں وہ زلف جس میں خم نہیں ہے
ہمیں کے دم سے تھی دنیا کی رونق

نہیں ہیں ہم تو دو عالم نہیں ہے
وفا کیا جانیں خسرو اور جہانگیر
کہ دلداری شعار جم نہیں ہے
لگا کر آگ گھر میں کوئی بھاگے
کوئی اس سے تو بڑھ کر غم نہیں ہے
بنا ماتم کدہ دل کھو کے' اب دل
ہے یہ کیا' حیف جو ماتم نہیں ہے

سید عابد شاہ عابد

ولادت ۱۴' اگست ۱۹۳۷ء

قیام پاکستان کے بعد بلوچستان کے مقامی اردو شعراء میں سید عابد شاہ عابد کا نام بطور خاص قابل ذکر ہے' آپ نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں نہ صرف نظم و نثر کی صورت میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں بلکہ بلوچستان میں ٹیلی ڈرامہ نگاروں میں آپ کا نام سرفہرست ہے۔ اس کے علاوہ پشتو سے اردو منظوم تراجم کے حوالہ سے بھی آپ نے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔

سید عابد شاہ عابد ۱۴' اگست ۱۹۳۷ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محترم سید یار محمد شاہ پولیس میں ملازم تھے' جو ڈی ایس پی کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آپ بخاری سادات کی شاخ سائٹزئی سے تعلق رکھتے ہیں۔ عابد شاہ عابد نے ابتدائی تعلیم کوئٹہ کے اسلامیہ ہائی اسکول سے حاصل کرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا جس کے بعد محکمہ تعلیم سے ٹیچر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۷۴ء میں جامعہ بلوچستان میں لیکچرر کی حیثیت سے پاکستان اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ میں آ گئے جہاں سے ۱۹۹۷ء میں پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ شاعری کی ابتدا آپ نے ۱۹۵۵ء میں کی اور آغا صادق حسین سے اصلاح لیتے رہے' بعد میں عین سلام سے بھی اصلاح لی۔ بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی ترقی و ترویج میں آپ نے بھرپور حصہ لیا' بزم ادب' قلم قبیلہ اور پشتو اکیڈمی کے علاوہ آپ نیشنل فلم ایوارڈ جیوری کے رکن اور پاکستان لوک ورثہ کے بورڈ آف گورنرز کے رکن بھی ہیں۔ آپ کئی سال تک پشتو اکیڈمی کوئٹہ کے صدر بھی رہے۔ اردو کے علاوہ آپ پشتو میں بھی بہت اچھے شعر کہتے ہیں۔ "سیلاب" پشتو ٹپوں کا اردو ترجمہ' "اولسی نکلونہ" اور پیر محمد کاکڑ پر آپ کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں آپ کو علامہ اقبال ایوارڈ کے علاوہ ۱۹۹۸ء

کے پی ٹی وی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

مرحوم ریاض قمر نے عابد شاہ کے بارے میں لکھا تھا کہ "عابد کی شاعری کا نمایاں رنگ سادگی ہے، سادگی حسن کی ایک صفت ہے، اگر شاعری میں سادگی کو سلیقے اور توازن سے برتا جائے تو غزل میں حسن اور دلکشی پیدا کرتی ہے۔ عابد شاہ اپنی شاعری میں نہ تو فلسفہ کی گہرائی میں جاتا ہے اور نہ علامت کی نقاب استعمال کرتا ہے بلکہ جو کچھ دیکھتا ہے، سوچتا ہے، مشاہدہ کرتا ہے، اسے غزل میں قدیم روایات کے حسن کے ساتھ بڑی سادگی سے بیان کر دیتا ہے۔ عابد کی شاعری میں سادگی کے ساتھ ساتھ ایک پاکیزہ رنگ بھی نظر آتا ہے اور وہ خلوص کا رنگ ہے۔ خلوص نہ صرف اس کی شاعری بلکہ زندگی میں بھی ہے۔ خلوص اور سادگی مل کر اس کی شاعری کو ایک حسن، ایک دلکشی، ایک نغمگی عطا کرتے ہیں۔ عابد کی غزل جب سنتے ہیں تو وہ غزل ہمیں روایت کا حسن، زبان و بیان کی سادگی، خلوص کا اظہار، محبت کی روشنی اور زندگی کے تمام حسین جذبوں کا دھنک رنگ پیکر نظر آتی ہے۔"

کر کے تیرے خیال سے باتیں
ہم نے کاٹیں پہاڑ سی راتیں
لمحے لمحے سے تیرے جلووں کی
ہمیں حاصل ہزار سوغاتیں
آسماں مہربان ہے یعنی
ہو رہی ہیں لہو کی برساتیں
ہم نے دل بھی جلا کے دیکھ لیا
کتنی سنگین ہیں سیہ راتیں
ہم بھی عابد کبھی تھے نغمہ طراز
آج لیکن ہیں غم کی برساتیں

تمہارے جور و ستم پر اگر نظر کرتے

ہم اپنی عمر بھلا کس طرح بسر کرتے
تمہارے نام پہ جینے کا جو ہنر کرتے
یہ مختصر سی حیات اور مختصر کرتے
کبھی گراں نہ گزرتا تعلق خاطر
ہنر وفا کا جو یاران معتبر کرتے
سجائے رکھتے ہم اے کاش خواب آنکھوں میں
حیات وادی گل رنگ میں بسر کرتے
سحر ہوئی ہے تو اب سوچتے ہیں کیا ہو گا
کہ شب تو ہم نے گزاری سحر سحر کرتے
متاع زیست یہ عابد ہمارے اشک رواں
گہر سے کم بھی نہ ہوتے اگر اثر کرتے

بر سبیل تذکرہ وہ نام آنا چاہیے
ان سے دیرینہ تعلق کام آنا چاہیے
زندگی بھر کی یہ وحشت اور یہ آوارگی
دشت حسرت اب کوئی الزام آنا چاہیے
جھانکتی ہے روزن در سے نوید روشنی
اب تو آمد کا تری پیغام آنا چاہیے
اے محبت آشنا لوگو، شعار زندگی
صورت الزام صبح و شام آنا چاہیے
وہ جسے کہتے ہیں بختاور تمام اہل چمن
اس پرندے کو بھی زیر دام آنا چاہیے

دل کا افسانہ رقم ہو چاہے جس عنواں سے ہو
ہاں مگر بین السطور اک نام آنا چاہیے
پھر وہی کوئے وفا عابد وہی دیوانگی
پھر کوئی پتھر کوئی دشنام آنا چاہیے

وہی اندیشہ فردا ہے وہی ماتم جاں
بدگماں سا ہے مری ذات سے پھر ایک جہاں
مر گئے کتنے ہی لب تشنہ سر ساحل غم
کروٹیں لیتا رہا زور بہت ہی طوفاں
میری آنکھوں میں سمٹ آئے خوشی کے آنسو
بعد مدت کے جو ایجاد ہوئی طرز فغاں
تو ہے ادراک حقیقت سے گریزاں عابد
روح میں زیست کی تو آج تک اترا ہے کہاں

کیا کہیں کیوں اشک افشانی ہوئی
بیٹھے بیٹھے ہم سے نادانی ہوئی
آپ جس بہروپ میں چاہیں اب آئیں
آپ کی صورت ہے پہچانی ہوئی
آسماں چپ ہے زمیں خاموش ہے
ماہ پیما سعی انسانی ہوئی
عابد جاں سوختہ برباد ہے
ایسی بربادی کہ پہچانی ہوئی

تمہارے پیار میں رسوا ہیں خوار ہیں ہم لوگ
کہ سنگہائے سر رہگذارر ہیں ہم لوگ
وہ چاہے دامن گیتی ہو یا ہو چشم فلک
ہر ایک کے لئے گرد و غبار ہیں ہم لوگ
چمن میں رہ کے چمن سے ہوئے ہیں بیگانے
فریب خوردہ عہد بہار ہیں ہم لوگ
ہزار ظلم و تشدد کے باوجود اے دوست
ادا ادا کی تری جاں نثار ہیں ہم لوگ
کبھی مچل نہ سکا کوئی نغمہ دل دوز
شکستہ ساز کے بے جوڑ تار ہیں ہم لوگ
خراب دشت جنوں ہو گئے مگر عابد
نگاہ اہل زمانہ میں خار ہیں ہم لوگ

آدمی کو آدمی کا رازداں کہتے رہو
یوں بعنوان دگر اک داستاں کہتے رہو
ہر نظر سے پیار کی اک داستاں کہتے رہو
روز و شب زلفوں کے سائے میں گزارو دوستو
لمحہ لمحہ داستان گل رخاں کہتے رہو
دار پر کھنچتے رہو سہتے رہو جور بتاں
زندگی کی داستان جاوداں کہتے رہو
گر تمہیں خوشنودی صیاد کا احساس ہے

تو گرفتارِ قفس کو آشیاں کہتے رہو

عابد اب سارا گلستاں گوش برآواز ہے
سر برہنہ زندگی کی داستاں کہتے رہو

حوالہ جات

۱۔ پندرہ روزہ "وادی" کوئٹہ جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۱۶-۱۹ ۱۹۸۵ء

۲۔ "دھنک" مرکز ادب کوئٹہ' قلات پبلشرز مستونگ' ۱۹۶۲ء

سید عابد شاہ عابد

سید عابد رضوی

ولادت ۱۹۳۸ء

پاکستان بننے کے بعد بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ریڈیو پاکستان نے نہ صرف اردو ڈراموں' گیتوں' غزلوں' مشاعروں' اور دیگر ادبی و علمی پروگراموں کے ذریعے بلوچستان کے گوشے گوشے میں زبان و بیاں کے مختلف اسالیب کو نہایت خوش سلیقگی سے پہنچایا بلکہ مقامی ادیبوں' شاعروں' ڈرامہ نگاروں' فیچر لکھنے والوں کے ساتھ ساتھ طلبا و طالبات' خواتین اور بچوں کی ادبی اور علمی تربیت کا اہتمام بھی کیا۔ ریڈیو پاکستان کے ان کارناموں میں سید عابد رضوی کا نام ایک براڈکاسٹر اور شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آپ نے نہ صرف ریڈیو کے ذریعے بلکہ مشاعروں اور ادبی تنظیموں میں اپنے فعال کردار سے بلوچستان میں اردو کے فروغ میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کوئٹہ میں سلام اور مرثیے کی روایت کو برقرار رکھنے میں بھی آپ کا بھرپور حصہ رہا ہے۔

سید عابد رضوی اپریل ۱۹۳۸ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد محترم سید غلام شاہ بلوچستان میں پوسٹ ماسٹر کی حیثیت سے ژوب' لورالائی اور کوئٹہ میں خدمات انجام دیتے رہے' آپ نے ابتدائی تعلیم لورالائی میں حاصل کی جس کے بعد کوئٹہ سے میٹرک کا امتحان ۱۹۵۴ء میں پاس کیا اور بی اے کی ڈگری ۱۹۶۴ء میں جامعہ پنجاب سے حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۶۵ء میں ریڈیو پاکستان سے پروگرام پروڈیوسر کی حیثیت سے منسلک ہو گئے اور ۱۹۷۶ء میں ریڈیو کورسز کرنے کے لیے آپ بی بی سی لندن گئے۔ جامعہ بلوچستان کے قیام کے بعد آپ نے ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آپ ریڈیو سے اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے ۱۹۹۸ء میں ریٹائر ہوئے۔ آپ کوئٹہ کے علاوہ تربت میں بھی اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ آجکل آپ ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں پروگرام ایڈوائزر

کی حیثیت سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی تنظیم "قلم قبیلہ" کے جنرل سیکرٹری اور سہ ماہی قلم قبیلہ کے مدیر کے طور پر بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ریڈیو پروگراموں میں اعلیٰ کارکردگی پر آپ کو ۱۹۸۱ء میں اقوام متحدہ کا عالمی انعام بھی ملا اور دینی تعلیم کے حوالے سے آپ کے پروگرام پر یونیسف ایوارڈ ABU Award بھی ملا۔ آپ کا ماہانہ ادبی پروگرام "گلدستہ" ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے پندرہ سال تک نشر ہوتا رہا جس کے پہلے مدیر مرحوم پروفیسر مجتبیٰ حسین تھے، مقامی شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ اس پروگرام میں قومی سطح کے ادیبوں اور شاعروں سے مختلف ادبی موضوعات پر گفتگو اور ان کے تاثرات نشر کیے جاتے تھے۔ اس پروگرام میں اعلیٰ معیار کی تنقید ہوتی تھی۔

۱۹۵۰ء میں آپ نے اثر جلیلی کے ساتھ "بزم ارتقائے ادب" کے نام سے ایک تنظیم بنائی جس کے زیر اہتمام ہفتہ وار تنقیدی نشستیں منعقد کی جاتی تھیں، آپ نے ادبی کتابوں کو پھیلانے کی غرض سے اثر جلیلی کے ساتھ مل کر کتابوں کی ایک دکان بھی کھولی جس کے ساتھ دارالمطالعہ کے نام سے لائبریری بھی قائم کی۔

عابد رضوی غزل کے علاوہ، نظم، سانیٹ، سلام اور منقبت کے شاعر ہیں، شاعری کے علاوہ ریڈیو ڈرامے، فیچر، تمثیلچے، اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں آپ کی کتاب "ممتا ہی ممتا" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ جو قلم قبیلہ کی چیرپرسن بیگم ثاقبہ رحیم الدین کے بارے میں ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۷۲ء میں "بلوچستان کی علاقائی شاعری میں حب الوطنی" کے عنوان سے بھی آپ کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔

عابد رضوی کا کلام زبان و بیاں کی صفائی، جذبوں کی سچائی، فنی پختگی کے ساتھ خوبصورت استعاروں اور تشبیہات سے عبارت ہے۔ آپ کی شاعری میں اردو شاعری کی پوری روایت بہت واضح نظر آتی ہے، آپ تلمیحات کے ذریعے اس تہذیبی ورثے کے حامل ہیں جو سچائی، حق گوئی اور بیباکی کا امین ہے۔ آپ کے سانیٹ بلوچستان ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں اعلیٰ شاعری کے نمونے ہیں جبھی تو اردو کے ممتاز نقاد نیاز فتح پوری نے لکھا تھا کہ " ہرچند اردو میں سانیٹ کہنے والے بہت کم ہیں ان میں سید عابد رضوی خاص

طور سے قابل ذکر ہیں"

ذہن کی دھوپ چڑھے گی تو خریدار بہت
یوسف شعر کو مل جائیں گے بازار بہت
چاند کے عکس میں صورت تو وہی ہے رقصاں
چاندنی پھر بھی ملی ہے جگر افگار بہت
یہ طلسماتی گھروندے یہ انا کے قلعے
سوچنے والو تمہیں ایک ہی للکار بہت
اپنی ہی تلخی آواز سے ہیں مہر بہ لب
تھے تو ہم بھی کبھی شائستہ گفتار بہت
جیتنے والو بہت تلخ ہے غم کی بازی
جیت صدیوں کی سہی پل کی مگر ہار بہت
میں چھپاؤں بھی خزانہ ترے غم کا تو کہاں
شہر کا شہر ہے اب درپئے آزار بہت

اک دل تھا وہ بھی کوفہ جاں کے سفر میں ہے
اک جاں ہے سو وہ کعبہ دل کے اثر میں ہے
کیسے کہوں کہ شب کے اندھیروں میں لکھ گیا
اک شخص جس کی اب بھی جھلک ہر سحر میں ہے
جینا اور اس کے بعد بھی جینا خدا گواہ
کیسا ہنر کمال کا اس بے ہنر میں ہے
روزن حصار ذات کا روشن ہے آج بھی
منظر بدل گئے ہیں مگر تو نظر میں ہے

منزل پہ کس کو ڈھونڈھ رہے ہو مسافرو
وہ قافلۂ جاں تو ابھی رہگزر میں ہے
اس دل میں جھانک کر کبھی دیکھو تو دوستو
اک شہر سا بسا ہوا عابد نگر میں ہے

کوئی خوشبوئے بدن جب کبھی یاد آئی ہے
بیتے لمحوں کے خد و خال چرا لائی ہے
مژدہ اے درد کے کانٹو، سر صحرائے خیال
پھر کسی شوخ کی یاد آبلہ پا آئی ہے
اس کے ہی فیض سے راتیں مری تاریک ہوئیں
جس کے پرتو سے سدا چاندنی لہرائی ہے
دل کے اس شہر نگاراں کو بھی اجڑا جانو
ان گنت چہروں کے ہوتے ہوئے تنہائی ہے
غم کی لذت ہو کہ ہو وصل کے لمحوں کا طرب
ہر حقیقت میں نہاں تیری ہی رعنائی ہے
اپنی آواز کی تلخی سے گلہ ہے عابد
جب پکارا ہے اسے اپنی صدا آئی ہے

عہد شکن

تیرا میرا عہد وفا تھا
ساتھ جئیں گے، ساتھ مریں گے
تیرے میرے اس پیماں میں

چاند ستارے پھول اور کلیاں
روشن صبحیں، ملگجی شامیں، چاندنی راتیں
سب کے سب ٹھہرے تھے شاہد
لیکن پھر ہم دونوں میں سے
ایک نے وعدہ توڑ دیا تھا
آؤ! اس کا فیصلہ کر لیں
تم نے مر کر پیماں توڑا
یا میں جی کر عہد شکن ہوں

یادیں

(سانیٹ)

نہ سن ہم سے ہمارے درد محرومی کے افسانے
جبین وقت کو دیکھا ہے ہم نے پر شکن ساقی
فروغ سوز پروانہ، نہ شمع انجمن ساقی
جہان دل میں ہر سو پھیلتے جاتے ہیں ویرانے
کہیں حد نظر تک اب یگانے ہیں نہ بیگانے
کبھی ہم بھی رہے ہیں انجمن در انجمن ساقی
ہمیں بھی لے کے پھرتی تھی کبھی دل کی لگن ساقی
مگر اب یاد بن کر رہ گئے وہ آئینہ خانے
چراغ مہر تم نے ان اندھیروں میں جلایا ہے
فلک نور سحر برسائے گا، تم یاد آؤ گے
تمہارے دم سے اخلاص و طلب کا بول بالا تھا

جہاں ذکر وفا چھڑ جائے گا تم یاد آؤ گے
زمانہ بھولنا چاہے تو کیسے بھول سکتا ہے
کہ جب عہد کرم یاد آئے گا تم یاد آؤ گے

اس کی یادوں کا خزانہ وہ طلسمی صحرا
مڑ کے دیکھوں تو وہ پتھر کا بنا دے مجھ کو
اب تو لہجوں کی صداقت نے بھی دم توڑ دیا
اس کے لہجے میں کوئی پھر سے صدا دے مجھ کو
شب کی دہلیز پہ بیٹھا ہوں بھکاری بن کر
کوئی خیرات اجالوں کی دلا دے مجھ کو
اس کی یادوں کی لطافت میں بلندی اتنی
جتنا چاہے مری قامت سے بڑھا دے مجھ کو
اس کا اب لوٹ کے آنا تو نہیں ہے ممکن
اس سے ملنے کی کوئی پھر بھی دعا دے مجھ کو
جس طرح اتنے برس میں نے گزارے عابد
کوئی اک دن تو بسر کرکے دکھا دے مجھ کو

نسیم احمد نسیم

پیدائش ۱۹۳۸ء

کوئٹہ میں گذشتہ چالیس برسوں سے مشاعروں، تنقیدی اور ادبی جلسوں میں نسیم احمد نسیم کی شرکت ایک روایت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ آپ کا مخصوص ترنم آپ کے پرخلوص شخصیت کی طرح ادبی اور سماجی حلقوں میں اپنی مثال آپ ہے۔

نسیم احمد نسیم ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار محمد اختر اور دادا رفیع احمد عیشی معروف شاعر تھے۔ آپ کی رسمی تعلیم ایم اے ایل ایل بی ہے۔ پیشہ کے لحاظ سے آج کل صحافی ہیں جبکہ آپ پوری زندگی ریلوے میں ملازمت کرتے رہے۔ آپ ابتدا میں آغا صادق مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور بعد میں اخگر سہارنپوری سے بھی مشورہ لیتے رہے۔

عجب حالات میں رہنا پڑا ہے
کبھی مرنا کبھی جینا پڑا ہے
جفا کو بھی وفا کہنا پڑا ہے
ہمیں یہ زہر بھی پینا پڑا ہے
وہ آخر کون تھا الزام جس کا
ہمیں خود اپنے سر لینا پڑا ہے
چنے تھے چند دانے ہی تو صیاد
قفس میں کیوں سدا رہنا پڑا ہے
فقط روٹی کے اک ٹکڑے کی خاطر
بشر کو بھی خدا کہنا پڑا ہے
بھرم رکھا ہے جس نے بھی قلم کا

اسے معتوب ہی ہونا پڑا ہے
نسیم اس عہد میں اہل وفا کو
ہر اک جور و ستم سہنا پڑا ہے

ہم نے دیکھی نہ صفت یہ کسی فرزانے میں
بے نیازی کا جو انداز ہے دیوانے میں
باعث مرگ ہوئی جنبش دامان سحر
زندگی شمع میں باقی ہے نہ پروانے میں
دیکھنا ہی ہے اگر ظرف مرا اے ساقی
سارا میخانہ الٹ دے مرے پیمانے میں
کس طرح بادہ گلرنگ سے توبہ کر لوں
ان کی تصویر نظر آتی ہے پیمانے میں
یہ عقیدت کے تراشے ہوئے معبود ہیں سب
ورنہ پتھر کے سوا کچھ نہیں بت خانے میں
دم قدم سے ترے رعنائی عالم ہے نسیم
تو گلستاں میں رہے یا کسی ویرانے میں

ہر اک لب پر ہے میری داستاں کیوں
ہے میرا ذکر ہی صرف زباں کیوں
فقیہ شہر جب خوش فکر ہے تو
غریب شہر سے ہے بد گماں کیوں
تقاضا کیا یہی انصاف کا ہے

مرا دشمن ہی میرا ترجماں کیوں
نشیمن اور بھی تو ہیں چمن میں
ہدف پر صرف میرا آشیاں کیوں
اگر تو بے نیاز روز و شب ہے
تو پھر اندیشۂ سود و زیاں کیوں
سوال اٹھا نہ ہو تقدیس گل کا
ہے افسردہ نسیم خوش بیاں کیوں

قطرے کو موج، موج کو دریا بنایئے
حسن کمال فن کو یگانہ بنایئے
کعبہ بنایئے نہ کلیسا بنایئے
گر ہو سکے تو اک نئی دنیا بنایئے
شاید کہ حبس ٹوٹے، فضا خوشگوار ہو
دیوار دل میں کوئی جھروکا بنایئے
اونچی اڑان کے لیے تکیہ کسی پہ کیوں
خود اپنے بال و پر کو توانا بنایئے
حالات عہد نو کا تقاضا ہے اب یہی
پھر مثل کربلا کوئی صحرا بنایئے
جس میں کدورتوں کا گزر تک نہ ہو نسیم
آئینۂ خیال کو ایسا بنایئے

کاش ہم بھی انہیں پڑھ لیتے نصابوں کی طرح

جن کے چہرے نظر آتے ہیں کتابوں کی طرح

جانے کیوں وہ مرے اعصاب پہ اب تک ہے محیط
مجھ سے جو دور ہے بھولے ہوئے خوابوں کی طرح

وقت کی دھوپ نے ان کو بھی جلا ڈالا ہے
وہ جو چہرے نظر آتے تھے گلابوں کی طرح

منکشف تم پہ بھی ہو جائیں گے اسرار حیات
میرے چہرے کو جو پڑھ لو گے کتابوں کی طرح

پورے ماحول پہ رکھتے ہیں نگاہیں اپنی
وہ جو اڑتے ہیں فضاؤں میں عقابوں کی طرح

کتنے آلام و مسائل سے گذر جاتی ہے
زیست کہنے کو تو ہوتی ہے حبابوں کی طرح

ان کو بھی ہم گل و گلزار بنا دیں گے نسیم
یہ جو صحرا نظر آتے ہیں سرابوں کی طرح

عطا شاد

پیدائش ۱۹۳۹ء وفات ۱۹۹۷ء

بیسویں صدی کے ربع آخر میں بلوچستان میں جس شاعر نے اپنی خلاقی، قادرالکلامی، ندرت الفاظ، لہجے اور پاکستان بھر میں اپنی مقبولیت اور ہردلعزیزی کے حوالے سے ایک خاص مقام پیدا کیا وہ عطا شاد تھا۔

عطا شاد نے نہ صرف بلوچی لفظیات کو اردو کے سانچے میں ڈھالا بلکہ بلوچستان کی جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی ماحول کی تصویر کشی جس دلکش انداز میں کی وہ نہ صرف بلوچستان بلکہ اردو شاعری کا ایک گراں بہا سرمایہ ہے۔

عطا شاد کا اصل نام محمد اسحٰق تھا اور وہ نومبر، ۱۹۳۹ء کو کیچ مکران کے ایک چھوٹے سے گاؤں "سنگانی سر" میں لعل خان کے یہاں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم نواب بائی خان اسکول سے حاصل کرنے کے بعد پنجگور سے میٹرک کا امتحان دیا جس کے بعد گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں داخلہ لیا۔ عطا شاد کا یہ سفر اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تھا کہ اس کے بعد وہ کوئٹہ کا ہی ہو کر رہ گیا اور دوبارہ کیچ نہیں گیا۔ تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اس نے ریڈیو پاکستان کوئٹہ میں جزوقتی ملازمت بھی شروع کر دی۔ کالج کے ماحول نے جہاں اسے آغا صادق حسین نقوی، خلیل صدیقی اور پروفیسر کرار حسین جیسے بلند مرتبت اور شفیق اساتذہ کی سرپرستی اور شفقتوں سے نوازا وہاں عین سلام جیسے شائستہ اور مخلص دوست کا ساتھ بھی اسے کوئٹہ میں ملا اور اس پر مستزاد ریڈیو پاکستان کوئٹہ تھا جہاں ایک طرف زبان و بیان کا سلیقہ ملا وہاں اظہار کے مواقع بھی۔

گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے سالانہ میگزین "بولان" کے سال ۵۷-۱۹۵۸ء کے شمارے اس بات کے گواہ ہیں کہ عطا نے بلوچی کے ساتھ ساتھ اردو میں اظہار کا شاعرانہ ڈھنگ سیکھ لیا تھا اور اپنے ہم عمروں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر چکا تھا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد عطا شاد ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے بحیثیت پروڈیوسر منسلک ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن آفیسر کے طور پر ملازمت اختیار کر لی۔ جب بلوچستان کو صوبہ کا درجہ ملا تو صوبائی حکومت نے اسے بلوچستان کا پہلا ڈی پی آر (Director Public Relations) مقرر کیا۔ اس دوران عطا شاد نے بلوچستان کے پہلے سول گورنر میر غوث بخش بزنجو کے ساتھ ایران کا دورہ بھی کیا۔ صوبائی حکومت کی برطرفی کے بعد عطا شاد کو پاکستان آرٹس کونسل بلوچستان کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا اور بعد میں وہ سیکرٹری انفارمیشن، سیکرٹری جنگلات کے طور پر بھی خدمات انجام دیتا رہا۔

اردو کے دو شعری مجموعوں "سنگاب" "برفاگ" اور "روچ گر" اور "شپ، سحار، اندیم" کے ناموں سے دو بلوچی مجموعوں کے علاوہ عطاشاد نے "بلوچی نامہ" "اردو بلوچی لغت" "ہفت زبانی لغت (حصہ بلوچی)" اور درین کے نام سے کئی کتابیں لکھیں اور اس کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت پاکستان نے ۱۹۸۳ء میں اسے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی اور ۱۹۹۲ء میں ستارہ امتیاز سے نوازا۔

عطاشاد نے بلوچستان میں اردو شاعری کو بلوچستان کی سیاسی گھٹن کے کتھارسس کے لیے جس سلیقے سے استعمال کیا اس نے اسے نہ صرف بلوچستان بلکہ پاکستان کا ایک مقبول شاعر بنا دیا۔ میر یوسف عزیز مگسی کے بعد عطاشاد وہ پہلا بلوچ اردو شاعر ہے جس نے اردو کے ذریعے بلوچستان کو قومی دھارے میں شامل کیا اور پروفیسر مجتبیٰ حسین نے عطا شاد کے پہلے شعری مجموعہ کے دیباچہ میں بجا فرمایا ہے کہ "عطا شاد میں "مقامیت" نہیں ہے وہ اردو کے نہیں ہیں، اردو ان کی ہے۔ .... عطا میں ایک اور حیرت انگیز بات پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری لکھنؤ اور دلی دونوں جگہوں کی روایتوں کا رس رکھتی ہے۔ .... عطا شاد کی زبان، صوتی انفرادیت کے لحاظ سے ان کے معاصرین سے انہیں ممیز کرتی ہے.... اتنی ترکیبیں ان کے ہم عصر کسی اور شاعر کے یہاں اتنی "خوش وضعی" کے ساتھ شاید ہی ملیں"۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے عطا شاد کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے کیا اچھا لکھا ہے کہ "وہ

کبھی تو بلوچی زبان میں نظم کی گئی عشقیہ داستانوں کے حوالے دیتا ہے اور کبھی بلوچستان کے ارضی آثار یعنی "چلتن" اور "بولان" کا ذکر کرتا ہے تاہم اس کی شاعری میں بلوچستان کی سرزمین سے اس کا دلی لگاؤ ایک ایسے صورت میں ابھرا ہے جو شہروں، دیہاتوں، باغوں اور حد نظر تک پھیلے سرسبز و شاداب کھیتوں کا منظر نہیں بلکہ ایک ایسی سنگلاخ سرزمین کا منظر ہے جو گرمیوں میں تپ جاتی ہے اور سردیوں میں یخ ہو جاتی ہے.... یہ ایک ایسا خطہ ہے جس میں سناٹا کورے کاغذ کی طرح بچھا ہے اور جہاں کے موسم شکن در شکن چادر کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، جہاں پتھر بوڑھے ہو چکے ہیں اور پہاڑ اپنی روئیدگی سے دست کش ہو کر اہراموں کی طرح نظر آنے لگے ہیں۔ مگر اس محیط و بیکراں سناٹے کے اندر خیمہ اور دیا، ناقہ اور چاند کی رمق کی طرح موجود ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ سب بھی محض دیکھنے کی حد تک جدا جدا ہیں، ورنہ یہ اصلا ایک ہی چہرے کے مختلف روپ اور زاویے ہیں..... چہرہ، جو خود بلوچستان کا چہرہ ہے، سرخ و سپید، خوشبو کا مسکن اور دیے کی طرح روشن! کبھی وہ چاند کا سکہ بن کر آسمان کی طرف اچھل جاتا ہے اور کبھی خیمہ بن کر زمین پر اتر آتا ہے اور کبھی شاعر کا روپ دھار کر لو دینے لگتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عطا شاد نے اول اول اس "چہرے" کو گلاب کی طرح کھلا ہوا پایا پھر دیے کی طرح ٹمٹماتے ہوئے دیکھا، پھر سکے کی طرح کھنکتے اور ہوا کی طرح سرگرداں ہوتے ہوئے محسوس کیا مگر آخر آخر میں اس پر اس بات کا انکشاف ہوا کہ یہ "چہرہ" اس کے اپنے چہرے میں تحلیل ہو گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں شاعر کو محسوس ہوا کہ اب وہ خود بلوچستان کا چہرہ ہے نیز اس کے ہونٹوں سے پھوٹنے والی آواز، خود بلوچستان کی آواز ہے اور اس لیے اگر وہ نہ بولا تو خود بلوچستان نطق سے محروم رہ جائے گا"۔ (سہ ماہی دستگیر کوئٹہ، جلد نمبر ۸، شمارہ ۱-۴)

عطا شاد کی یہ آواز اردو کلاسیکل شاعری کی آواز سے ہم آہنگ ہے اور بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہ "عطا شاد نے فراق و یگانہ کے لہجوں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم آہنگ و ہم آمیز کر کے ایک نئے لہجے کو جنم دیا ہے۔ یہ لہجہ ان کا اپنا ہے، اور اس لہجے کی تخلیق میں شاعر کی شخصیت، انداز فکر، بلوچستان کی سرزمین و آب و ہوا، سیاسی و سماجی

حالات اور صنعتی تہذیب کے لائے ہوئے تغیرات و انقلابات سب نے نمایاں کردار ادا کیا"۔

یہ دل بھی زخم ہے' وہ گل بھی گھاؤ رکھتا ہے
تمام شہر طلب کا الاؤ رکھتا ہے
شکستہ شاخ ہو تم بارشوں کو دو نہ صدا
نشیب اب کے غضب کا بہاؤ رکھتا ہے
یہ حادثہ ہے کہ موسم نے کر دیے یکجا
وگرنہ' خار سے گل کیا لگاؤ رکھتا ہے
دکھا کے خواب مجھے نیند سے جگاتا ہے
مجھے بگاڑ کے اپنا بناؤ رکھتا ہے
وہ معتبر بھی ہمیں کر گیا سپرد ہوا
یہ مہربان بھی موجوں کی ناؤ رکھتا ہے
قریب ہے تو قریب آئے دور ہے تو رہے
یہ کیا کہ پاس بھی ہے اور کھچاؤ رکھتا ہے
عطا سے بات کرو چاندنی سی' شبنم سی
خنک نظر ہے مگر دل الاؤ رکھتا ہے

پارساؤں نے بڑے ظرف کا اظہار کیا
ہم سے پی اور ہمیں رسوا سر بازار کیا
درد کی دھوپ میں صحرا کی طرح ساتھ رہے
شام آئی تو لپٹ کر ہمیں دیوار کیا

رات پھولوں کی نمائش میں وہ خوش جسم سے لوگ
آپ تو خواب ہوئے اور ہمیں بیدار کیا
کچھ وہ آنکھوں کو لگے' سنگ پہ سبزے کی طرح
کچھ سرابوں نے ہمیں تشنہ دیدار کیا
تم تو ریشم تھے چٹانوں کی نگہداری میں
کس ہوا نے تمہیں پا بستہ یلغار کیا
ہم برے کیا تھے کہ اک صدق کو سمجھے تھے سپر
وہ بھی اچھے تھے کہ بس یار کہا وار کیا
سنگساری میں تو وہ ہاتھ بھی اٹھا تھا عطا
جس نے معصوم کہا' جس نے گنہگار کیا

وشت میں سفر ٹھہرا پھر مرے سفینے کا
میں نے خواب دیکھا تھا برف کے پگھلنے کا
دھوپ کی تمازت تھی برف کے مکانوں پر
اور تم بھی لے آئے سائبان شیشے کا
میری نبض چھو آئے جن کے ہاتھ ہی تھے سن
اور پھر ہوا چرچا میرے زخم بھرنے کا
اب بھی بند آنکھوں میں جھانکتی ہیں کرنیں سی
اب بھی ٹمٹماتا ہے اک دیا دریچے کا
تم بھی گنگنا لینا' کوئی پھول صحرا میں
پتھروں پہ لکھا ہے میں نے نام سبزے کا
بہہ ہی ہے دریا میں جیسے فصل خیموں کی

نصب تھا شیشوں میں اختیار جینے کا
اب کی چپ عطا چٹکیں حرف میری سانسوں کے
اب کی چپ دہکتا ہے، جس رت بدلنے کا

شب گریز پا اچھا، صبح نارسا، اچھا
اک سراب سیارہ، گردش سما، اچھا
ہاں شفق کے شعلوں سے راکھ ہو گیا سورج
تیرگی کی بارش، میں چاند بجھ گیا، اچھا
شاخ شب پہ آویزاں، مہر تیرہ بختاں ہے
مژدہ گر سناتا ہے، حال مبتلا اچھا
وشت کا مسافر تھا، کھو گیا سرابوں میں
روشنی کے اندھے کو، آئینہ لگا اچھا
دل بقدر امکاں ہو اور نظر بہ حد جاں
اک جزا کا برزخ ہے، یہ طلب کدہ اچھا
درد کے خرابے میں، کوئی کب ہوا آباد
ابر بے ارادہ سے، وشت بے روا اچھا
وہ ضمیر زادے ہیں ان کا فیصلہ برحق
ہم فقیر کیا جانیں، کیا برا ہے کیا اچھا
عمر بھر کی فرقت کا کس نے خواب دیکھا ہے
وصل نامیسر سے، حرف دلکشا اچھا
شاد کوئی بھی رت ہو، روشنی تو دیتا ہے
دوپہر کے سورج سے، رات کا دیا اچھا

اور اک دن کیا دیکھا تھا اس نگر کا رستہ
اس کے بعد نظر نہیں آیا گھر کا رستہ
کیا گلیاں تھیں، کیسے موڑ تھے، شہر طلب کے
باہر کا ہر رستہ تھا، اندر کا رستہ
اس نے ایک اک کرن، عذاب شب دیکھا ہے
سورج کو کیا سمجھا رہے ہو، سحر کا رستہ
سوچیں زلف کے مرغولوں میں الجھ رہی ہیں
آنکھوں کی گہرائی میں ہے، بھنور کا رستہ
روشنی ایسی، کاہکشاں پھولوں کی بچھائے
خوش چہروں نے روک دیا ہے نظر کا رستہ
کس وادی میں ٹھہر گئی ہے وہ گل صورت
خوشبو بھول گئی ہے اپنے سفر کا رستہ
شاد اس جسم کا نشہ دل کو کھینچ رہا ہے
ہم نے ترک کیا کب کا ساغر کا رستہ

مکیں ادھر کے ہیں لیکن ادھر کی سوچتے ہیں
جب آگ گھر میں لگی ہو تو گھر کی سوچتے ہیں
کہ جب زمین ہی سیل بلا کی زد میں ہو
تو پھر ثمر کی نہیں، پھر شجر کی سوچتے ہیں
اڑے تو طے ہی نہ کی حد آشیاں بندی
اب اڑ چکے ہیں تو اب بال و پر کی سوچتے ہیں

تو میرا دل تو پرکھ میر انتخاب تو دیکھ
کہ اہل حسن تو حسن نظر کی سوچتے ہیں
یہ دشت ہے تو بگولوں سے کیا ہراسانی
سفر میں کیا کبھی گرد سفر کی سوچتے ہیں
کہ مہر اپنا اثاثہ ہے، قہر ان کی اساس
وہ اپنی شب کی، ہم اپنے سحر کی سوچتے ہیں
ہمیں تو فکر مکاں کی بھی ہے مکیں کی بھی
حضور ! آپ تو دیوار و در کی سوچتے ہیں
یہ ایک ہم کہ کریں بات ماہ و انجم کی
اور ایک وہ کہ جو تیغ و تبر کی سوچتے ہیں
فقیر دل کے تصرف کی بات سوچتے ہیں
نہ مال و زر کی نہ لعل و گہر کی سوچتے ہیں
انہیں دریچہ ء زنداں سے اک کرن کی سزا
جو تیرگی میں بھی روشن نگر کی سوچتے ہیں
جو بے خطا کا لہو تھا، وہ کیا لہو ہی نہ تھا
جب آ پڑے ہے تو آپ اپنے سر کی سوچتے ہیں
گلہ ہے غیر سے کیا ہم نیاز مندوں کو
وہ عیب سوچتے ہیں ہم ہنر کی سوچتے ہیں
عطا میں ان کو بھی دل سے دعائیں دیتا ہوں
جو اپنے نفع میں میرے ضرر کی سوچتے ہیں

دروازہ کھلا رکھا تھا برسات سے پہلے

ہم تم سے شناسا تھے ملاقات سے پہلے
یہ سوچ بھی اک سلسلہ خواب نما ہے
ہر بات پہنچ جاتی ہے ہر بات سے پہلے
یہ کیسا کرشمہ ہے کہ وہ سرو سخن بھی
اب ہاتھ بڑھاتا ہے مرے ہاتھ سے پہلے
یہ گل ہے وہ نغمہ یہ صدف ہے وہ ستارہ
مژدہ یہ ملا وصل کی سوغات سے پہلے
اب دشت کی دہشت ہے سرابوں کا سفر ہے
تم ہم سے ملے تلخی حالات سے پہلے
طوفان کی نیت کی خبر رکھتے ہیں سو ہم
لو دل کی بڑھا لیتے ہیں ظلمات سے پہلے
کوئی بھی نہ تھا مجھ سا خراباتی ء دوراں
یہ زہر تو موجود تھا سقراط سے پہلے
ہم ایسے فقیروں کو یوں حیرت سے نہ تکیو
ہم کرب سے گزرے ہیں کرامات سے پہلے
در بند ہوں کہ کنج خرابہ ہے مگر شاد
اک ذات ہے موجود مری ذات سے پہلے

کسی پہ باد صبا تھا کسی پہ صرصر تھا
مگر گیا تو بھرا شہر دیدہ ء تر تھا
ہوا ہوا تو وہی حرف شعلہ پیکر تھا
مری زبان سے نکلا مجھی کو نشتر تھا

گھنا سے گل تو ہوئی ماہتاب کی چاندی
فشار جاں کو مگر یہ بھی اوج شاغر تھا
وہ برگ خشک پہ شبنم بنی ہے اب کے دھوپ
ہوا کے طشت پہ کیا ریت کا مقدر تھا
قفس کریں گی یہ دو چار بوند کیا صحرا
سمٹ گیا وہ جو پندار کا سمندر تھا
برس گیا نہ شرارہ بنا وہ سایہ صفت
مثال ابر تپاں کوئی دشت بر دل تھا
اجڑ گیا تو گیا وہ بھی سیل کی صورت
کبھی یہ راہ کا تنہا کھنڈر مرا دل تھا
ملا تو رقص بنا فرش سوگ پر کوئی
بچھڑ گیا تو غموں میں خوشی کا منظر تھا
میں شاد یوں بھی گیا اپنی عمر سے آگے
کہ میرے ساتھ مری حسرتوں کا لشکر تھا

سرگنگ زار ہوس

دل کہ پندار عرض طلب کے عوض رہن آزار تھا' تم نے پوچھا
جب سرگنگ زار ہوس حرف جاں بار تھا' تم کہاں تھے
سنگ و آہن کے آشوب میں ہم سپر زادگاں' خود پنہ تھے
تو تڑپا نہ کوئی صدا آشنا
اپنے احساس کے کوہ قلعوں میں عمر آزما سرکشیدہ رہے

گونجتا کوئی لمحہ نہ آیا
تم نے سوچی کبھی ایسی شب خون ساعت کہ اک پیرہ زن
سینۂ ناتواں سے لگائے کوئی طفل بیمار جاں
(نزکہ آخری)
درد حق سے تبرگاہ تیرہ میں بھی سرفروزاں رہے
تم نے دیکھا کبھی ایسا روز سیہ
گرد چیخوں سے' وحشت کراہوں سے' لب سوز آہوں سے' دود عدم سے بھی تاریک تر
ہست و ناہست کی قہرباد مسافت امید گر' کیسے زندہ رہے' تم نے جانا؟
تم نے سوچا نہ دیکھا نہ جانا
کہ اعضائے یک دیگراں' خود سے بیگانہ تھے
ہم تھے آتش تغار اور تم تک نہ پہنچی کوئی لمس آنچ
مہر بردل تم ایسے تھے دہروز کا ہر زیاں قرض تھا
تم سے اگلواتا تھا اپنے حرف اپنے الفاظ' اپنا خیال' اپنی سوچ
اہل اظہار تم؟
قہر سوداگراں کے لیے پاس صدق ایک تخریب ہے
ہم خطاکار' کار خطا بے خبر
تم وفادار' غارت گران وفا' شکوہ سنج
دل کہ پندار عرض طلب کے عوض ہن آزار تھا' تم نے پوچھا؟
جب سرگنگ زار ہوس' حرف جاں بار تھا' تم کہاں تھے؟

کوہ کا کرب

یہ چشمے کے پانی میں کیسا غبار آگیا
گزرتے ہوئے کاروانوں کی یادیں
جلے پتھروں پر
نکھرتی شبوں کی، یہ کیا راکھ لکھ کر گئی ہے
شکستہ طنابوں پہ خیموں کی تحریر کیا تھی
پڑھی بھی نہ جائے، سنی بھی نہ جائے
وہ بوڑھی زبانوں کی مشفق کہانی تھی کیا
نقش جن کے ہواؤں نے کملا دیے ہیں
یہ جب میں نے سوچا
تو ایسے لگا
جیسے وادی کے سب سرد پتھر پگھلنے لگے ہیں

عطا شاد "سنگاب" سیلز اینڈ سروس کوئٹہ
عطا شاد "برفاگ" ناشاد پبلشرز کوئٹہ ۱۹۹۷ء
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق "بلوچستان میں اردو" مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد ۱۹۷۸ء
آغا محمد ناصر، "معاصر" لاہور ۱۹۹۹ء
سلطان، ارشد القادری، "دستگیر" کوئٹہ جلد ۸، شمارہ نمبر ا۔۴
حکیم بلوچ، "شبیہہ شاد" پاکستانی ادب پبلی کیشنز کراچی ۱۹۹۹ء

ریاض قمر

ولادت ۱۹۴۳ء وفات ۲۷، اپریل ۱۹۹۷ء

بلوچستان میں شعر و سخن کے حوالے سے ریاض قمر کا نام، ان کی شخصیت کی وجہ سے تادیر زندہ رہے گا۔ وہ کوئٹہ کے ادبی حلقوں میں اپنی بذلہ سنجی، بے تکلفی، اخلاص، بے غرضی اور محبت کی وجہ سے سب کے لیے نہ صرف قابل احترام تھے بلکہ ہردلعزیز بھی۔ ان کی شخصیت کی طرح یہی رعنائی ان کی شاعری میں بھی پائی جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں سلاست و سادگی لیے ہوئے ان کی شاعری ہمارا گرانقدر سرمایہ ہے۔ انہوں نے بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی خدمت نہ صرف اپنے اشعار کے ذریعے کی، بلکہ بلوچستان کے شعراء کے بارے میں مختصر تحریروں اور انٹرویوز کے ذریعے انہیں ملک کے دیگر ادبی حلقوں سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ قلم قبیلہ، پریس کلب کوئٹہ اور دیگر ادبی تنظیموں میں بھی ان کی مخلصانہ اور بھرپور خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

ریاض قمر کا تعلق اگرچہ پنجاب کے ضلع جھنگ سے تھا لیکن وہ کوئٹہ میں یوں رچ بس گئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ریاض قمر ۱۹۴۳ء میں پیدا ہوئے، آپ کے والد لیاقت حسین پیشے کے لحاظ سے زرگر تھے، آپ نے زرگری کا فن انہی سے سیکھا اور کوئٹہ کے بہترین زرگروں میں شمار ہوتے تھے، آپ کی ہنرمندی اور صناعی کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے صراف انہیں سونا اور بنوائی کی رقم دے کر مہینوں انتظار کرتے لیکن کنگن انہیں سے بنواتے۔ ریاض قمر زندگی بھر اپنے اور اپنے بچوں کی دال روٹی کے لیے زرگری کرتے رہے جس میں لوگ ایک قلیل مدت میں دولت مند بن جاتے ہیں لیکن ریاض قمر زر و جواہر کی بجائے لفظوں کی محبت میں گرفتار تھے، لیلائے سخن نے انہیں اپنا ایسا اسیر بنا رکھا تھا کہ چکی کی مشقت سے چھوٹتے ہی وہ کوچہ سخن کا طواف شروع کر دیتے، انہوں نے کبھی سنجیدگی سے اپنی کاروباری مصروفیات پر توجہ نہیں دی، بلکہ مشرق کوئٹہ کے ادبی صفحات، پندرہ روزہ

وادی میں تبصرے، روزنامہ کوہستان کے لیے ادیبوں شاعروں کے انٹرویوز ان کی زندگی کا بہترین اور مطمعن ترین حصہ تھے۔

ریاض قمر نے پوری زندگی صرف شاعری کی، اخباری کالموں میں، انٹرویوز میں، گفتگو میں، حتی کہ نثر میں بھی۔ بلوچستان کی تاریخ صحافت میں ان کا نام ان کے قطعات کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جو وہ کئی سال تک روزنامہ مشرق اور روزنامہ کوہستان کوئٹہ میں لکھتے رہے۔

اس کی صورت کو دھیان میں رکھنا
روشنی کو مکان میں رکھنا
کہنے بیٹھو جو دل کا افسانہ
اک تسلسل بیان میں رکھنا
جب بھی جاؤ بلندیوں کی طرف
اک توازن اڑان میں رکھنا
جانے وہ کب ہدف پہ آ جائے
تیر اپنا کمان میں رکھنا
جس کا گاہک کبھی کبھی آئے
ایسی شے بھی دکان میں رکھنا
زندگی پر بہار گزرے گی
کچھ یقیں بھی گمان میں رکھنا
عہد جب بھی کرو محبت کا
زندگی درمیان میں رکھنا
ہاتھ رکھنا زمیں کے ہاتھوں میں
اور نظر آسمان میں رکھنا
گفتگو اس کے ساتھ ہو تو قمر

حرف شیریں زباں میں رکھنا

ہر مسرت گریز پا سی ہے
شہر دل میں بڑی اداسی ہے
کاش تو ایک بار مل جائے
بس یہی آرزو ذرا سی ہے
ہم اسی بے وفا کے ہو بیٹھے
یہ ہماری ادا شناسی ہے
کیا گزرتی ہے دل کی دنیا پر
یہ شب غم بھی اک بلا سی ہے
اے قمر مہوشوں کی بستی میں
دل پریشاں، نگاہ پیاسی ہے

چاندنی رات قافلے دل کے
جگمگاتے ہیں راستے دل کے
میری بانہوں میں خود سمٹتے ہیں
موسم گل میں فاصلے دل کے
بات کرتے ہو جب محبت کی
صاف ہوتے ہیں آئینے دل کے
وہ نظر داستان کہتی ہے
پھر سے قائم ہیں رابطے دل کے
ہجر کے غم وصال کی باتیں
کتنے شیریں ہیں ذائقے دل کے

دشمن جاں کو دوست کہتے ہیں
ہم بھی ہیں کتنے باؤلے دل کے
وہ قمر اپنی دل کی محفل میں
بند کرتا ہے داخلے دل کے

سرمئی شام اچھے لگتے ہیں
رقص میں جام اچھے لگتے ہیں
ایک حصہ ہے عمر کا جس میں
سارے الزام اچھے لگتے ہیں
میرے گھر کون آنے والا ہے
کیوں در و بام اچھے لگتے ہیں
زلف، رخسار، پھول، پیمانے
سب سر شام اچھے لگتے ہیں
دوسروں کے یقین سے بڑھ کر
اپنے اوہام اچھے لگتے ہیں
بیچنا ہے تو پھر ضمیر ہی بیچ
آج کل دام اچھے لگتے ہیں
برف کے بعد وادیوں میں قمر
پھول بادام اچھے لگتے ہیں

یقیں دیا ہے تو تھوڑا سا واہمہ بھی دے
ادھر ادھر مجھے جانے کا راستہ بھی دے
بگڑتے بنتے خد و خال دیکھنے کے لیے

کوئی زمانے کے ہاتھوں میں آئینہ بھی دے
نہ کر اسیر مجھے اپنے ہی خیالوں میں
یہ کائنات سمجھنے کا حوصلہ بھی دے
بہت گراں ہے فضاؤں کی خامشی اب کے
سکوت ٹوٹ گرے ایسا حادثہ بھی دے
قدم ملا کے نہ چل اتنی احتیاط بھی کیا
کبھی کبھی مجھے تھوڑا سا فاصلہ بھی دے
قمر یہ کیسی محبت ہے دور دور ہے وہ
مجھے وہ اپنے تعلق کا رابطہ بھی دے

وہ ایک شخص مرے راستوں پہ ٹھہرا ہے
چراغ لے کے مگر فاصلوں پہ ٹھہرا ہے
ہوا چلے گی تو خوشبو ادھر بھی آئے گی
ابھی تو موسم گل بادلوں پہ ٹھہرا ہے
وہ میرے سامنے آئیں کہ چھپ کے وار کریں
یہ فیصلہ بھی مرے دشمنوں پہ ٹھہرا ہے
کوئی تو موج نظر ساحلوں پہ لے جائے
سفینہ ء غم دل پانیوں پہ ٹھہرا ہے
وہ ایک شخص جسے روشنی سمجھتا ہوں
غبار بن کے مرے آہٹوں پہ ٹھہرا ہے
کوئی تو ہے جو قمر ساتھ ساتھ چلتا ہے
مگر یہ حسن یقیں واہموں پہ ٹھہرا ہے

اقبال کی زمین میں ایک غزل

چلی ہے دل کے خرابے میں اب کے باد مراد
فضا میں پھول کھلے ہیں نظر نظر آباد

یہ بزم شعلہ رخاں ہے کہ روشنی کا جہاں
ہجوم شوق فروزاں ہے حوصلہ ہے زیاد

خوشی مناؤ کہ اس بے وفا زمانے میں
کسی کی زلف کا سایہ ہے زندگی ایجاد

عجیب شان سے اترا ہے تیری یاد کا چاند
میں دل کا نام رکھوں اب کے کہکشاں آباد

چلا ہے تیشہ بکف منزل تمنا کو
مرے وطن کا ہر اک فرد ہے نیا فرہاد

بہت قریب ہے وہ دن کہ جلتے صحرا میں
کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

قمر یہ کس کی نظر دے گئی ہے جرات شوق
زباں پہ ٹوٹ کے آیا ہے آج حرف مراد

حوالہ جات

پندرہ روزہ "وادی" کوئٹہ جلد نمبر شمارہ نمبر ۱۹۸ء

"چھوٹا علی گڑھ" اسلامیہ ہائی اسکول کوئٹہ، شمارہ ۴، اگست ۱۹۸۹ء

ڈاکٹر انعام الحق کوثر، علامہ اقبال بلوچستان میں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۹۸ء

خورشید افروز

پیدائش ۱۹۴۳ء

خورشید احمد افروز بلوچستان میں اردو زبان و ادب کی تدریس کے حوالے سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں لورالائی میں جن لوگوں نے آغا سید صادق حسین نقوی کے حلقہ تلمذ میں شمولیت اختیار کی ان میں ربنواز مائل اور سعید گوہر کے ساتھ خورشید احمد افروز کا نام بھی آتا ہے۔ افروز آغا صاحب کی لورالائی آمد سے پہلے محمد مہدی نظیر صدیقی سے اصلاح لیتے تھے

خورشید احمد افروز ۱۹۴۳ء میں کشمیری خواجہ خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام خادم حسین تھا۔ ۱۹۶۴ء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں بحیثیت استاد شمولیت اختیار کی اور بلوچستان کے مختلف اسکولوں میں خدمات انجام دیں بعد ازاں ۱۹۷۴ء میں بحیثیت لیکچرار اردو، کالج میں تدریس کا آغاز کیا اور تاحال اسی شعبے میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے منسلک ہیں۔ کچھ عرصے تک کالج میں پرنسپل بھی رہے۔

خورشید احمد افروز لورالائی کی علمی، ادبی، صحافتی، ثقافتی اور سماجی زندگی کا ایک اہم جزو ہیں۔ ملکی و صوبائی متعدد رسائل و اخبارات کے لئے بلوچستان اور لورالائی کی نمائندگی کے علاوہ ادبی رسائل و جرائد میں ان کا کلام ایک طویل عرصے سے شائع ہو رہا ہے۔ روایت کے ساتھ ساتھ جدت کے تقاضوں سے بھی آگاہ ہیں اور اکثر غزل کو ذریعہ اظہار بناتے ہیں تاہم قومی موضوعات پر اظہار خیال کے لئے نظم کے علاوہ قطعات بھی تحریر کرتے ہیں۔ خورشید احمد افروز نے آزاد نظمیں بھی لکھی ہیں۔

اندھیروں سے مجھے دیدے نجات اے مولا
سحر طلوع ہو ڈھل جائے رات اے مولا
یہ زیست مختصر و بے ثبات اے مولا

طویل سلسلہ خواہشات اے مولا
یہ چند آنسو یہ تنہائیاں یہ محرومی
فقط یہی مری کل کائنات اے مولا
ہو بت پرستوں سے پیدا ہی بت شکن کوئی
کہ بڑھتے جاتے ہیں اب سومنات اے مولا
اٹھا اٹھا کے مجھے مارا ہے تلاطم نے
کہ ریزہ ریزہ ہوئی میری ذات اے مولا
رسائی منزلوں تک ہو گی کس طرح ممکن
کہ راہ دیکھتے ہیں حادثات اے مولا

ہے جنس گراں اس کے طلبگار بہت ہیں
لگ جائے گی قیمت کہ خریدار بہت ہیں
بس ایک دکاں تک تو ضرورت نہیں موقوف
پیسہ ہو اگر جیب میں بازار بہت ہیں
ڈھل جائے گی خود ظلم کی یہ رات بھی اک دن
وہ دور تلک صبح کے آثار بہت ہیں
میں کیا کروں ہے میرا مقدر ہی کڑی دھوپ
رستے میں تو یوں سایہ اشجار بہت ہیں
اس ملک کی حالت پہ کرم ہو مرے مولا
تھوڑے ہیں یہاں یار تو غدار بہت ہیں

میں کہ اپنوں میں کچھ اس طرح سے محصور ہوا

خودکشی کرنے پہ جیسے کوئی مامور ہوا
جھوٹ وہ بول کے منظور نظر ٹھہرے ہیں
میں کہ سچ کہنے کی پاداش میں مقہور ہوا
اللہ اللہ وہ جوانی وہ سراپا وہ شباب
میں کہ تھا توبہ شکن بن پئے مخمور ہوا
مسکرا کے فقط اک بار مجھے دیکھا تھا
بات بس اتنی تھی کیا کیا نہیں مشہور ہوا
غم کے طوفان سے افروز پریشان نہ ہو
وہی ہو گا مرے اللہ کو جو منظور ہوا

ہاں نہو جس کا وجود ایسا کوئی پیکر تراش
آنکھ سے اوجھل رہے جو ایسا بھی منظر تراش
وقت کے پنچھی کی صورت خودبخود اڑ جاؤں گا
تو مجھے زنداں میں رکھ بیشک تو میرے پر تراش
جب تلک زندہ ہوں شب کو شب ہی لکھوں گا سدا
کاٹ چاہے ہاتھ میرے، چاہے میرا سر تراش
روپ دھارے ہو بہو ان کے لب و رخسار کا
جو امر ہو جائے ایسا بھی کوئی پتھر تراش
راز کہنے کا سلیقہ سیکھ گر فنکار ہے
بات جب گھونگٹ میں ہو الفاظ کا پیکر تراش

یہ زیست جسم کا خالی مکان لگتی ہے

یہ عمر کوزے میں غم کا جہان لگتی ہے
لچکتی شاخ سی تھی پر نہ آندھیوں میں جھکی
مجھے وہ موم سی لڑکی چٹان لگتی ہے
لرز رہی ہیں مرے گھر کی بوڑھی دیواریں
خموشیوں کے بھی منہ میں زبان لگتی ہے
اگرچہ پھاند چکی ہے شباب کی دہلیز
مگر جو دیکھ تو اب بھی جوان لگتی ہے
سحر سے رینگ رہے ہیں زمیں کی چھاتی پر
مجھے تو جسم میں سایوں کے جان لگتی ہے
مرا تو فن بھی ہے ان کی نظر میں عیب کا پیڑ
مری بلندی بھی ان کو ڈھلان لگتی ہے

دامن کے ہر اک چاک کو سینا سیکھو
انمول ہیں آنسو انہیں پینا سیکھو
ساحل کے سہارے تو سبھی جیتے ہیں
طوفاں سے الجھتے ہوئے جینا سیکھو

ہر گھڑی اور بڑھی جاتی ہے
رات آنکھوں میں کٹی جاتی ہے
بخدا آج تو آپ آ جائیں
چاندنی رات ڈھلی جاتی ہے

ناگی عبدالرزاق خاور

ولادت ۱۹۴۳ء — وفات ۲۴ فروری ۱۹۹۴ء

ناگی عبدالرزاق خاور کوئٹہ کے ان شعراء میں سے تھے جنہوں نے خاصی پختہ عمر میں میدان شاعری میں قدم رکھا' جلد ارتقاء کی منزلیں طے کیں اور ابھی جب کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور فکر و فن کا سورج نصف النہار پر تھا انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

عبدالرزاق ولد غلام حیدر ناگی ۱۹۴۳ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا گھرانہ کوئٹہ کے پرانے باسیوں کا گھرانہ ہے اور کئی معروف ڈاکٹر اور دیگر اہل علم کا تعلق ناگی خاندان سے ہے۔ عبدالرزاق نے ذریعہ معاش کے طور پر آٹو سپئیر پارٹس کی تجارت اختیار کی اور سپئیر پارٹس ڈیلرز کی انجمن میں فعال کردار ادا کرتے رہے۔ مطالعے کا شوق اور ادبی ذوق خداداد تھا۔ اسی کی دہائی میں باقاعدہ شعر گوئی کی طرف راغب ہوئے بعد ازاں استاد رشید انجم کی شاگردی اختیار کی اور انجمن دبستان بولان سے وابستہ ہوگئے' خاور تخلص رکھا۔ انجمن دبستان بولان کو ایک فعال اور معروف ادبی تنظیم بنانے میں خاور ناگی کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے مرحوم کافی عرصے تک اس انجمن کے صدر بھی رہے' اس کے علاوہ وہ کوئٹہ بلکہ تقریباً" پورے بلوچستان اور پاکستان بھر میں ادبی تقریبات اور سرگرمیوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔

ناگی عبدالرزاق خاور کی زندگی میں ہی ان کے تین شعری مجموعے "عرفان و آگہی" ۱۹۸۵ء "قندیل" ۱۹۸۸ء' اور "آبگینہ" ۱۹۹۳ء منظر عام پر آچکے تھے جب کہ ان کا خاصا غیر مطبوعہ کلام بھی موجود ہے۔

خاور ناگی کی شاعری فکر و فن کے حوالے سے خاصی بھرپور ہے۔ فکری لحاظ سے وہ علامہ اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں اور فن کے اعتبار سے پختہ اور روایت کے پابند ہیں۔

ناگی خاور کا انتقال ۱۹۹۴ء میں ہوا۔

چشم گریاں کی طرح، قلب پریشاں کی طرح
عمر گزری ہے اسیر غم دوراں کی طرح
ہم تری بزم سے نکلے تو قیامت ہو گی
لوگ دیکھیں گے ہمیں بے سروساماں کی طرح
میں نے ہنگامہ ہستی کا چلن چھوڑ دیا
میرا عالم ہے سکوت شب ہجراں کی طرح
حوصلہ ہو تو تحمل بھی مزا دیتا ہے
اشک غم پی گئے ہم تلخئ دوراں کی طرح
خود کو آزاد سمجھنا ہے یہاں جرم عظیم
ہم تو گلشن میں بھی اب رہتے ہیں زنداں کی طرح
التفات ان کا اگر ہو تو مقدر اپنا
جاگ اٹھے گا ابھی خاور تاباں کی طرح

جس جگہ چاہوں پہنچ سکتا ہوں میں اڑتا ہوا
اک پرندہ ہوں ہوا کے دوش پر بیٹھا ہوا
پتھروں کو بھی یہاں مجھ سے زبانیں مل گئیں
اس دیار خامشی میں جب سے میں گویا ہوا
وہ نہیں آتے نہ آئیں، مجھ کو اس کا غم نہیں
میں سمجھتا ہوں مرے حق میں بہت اچھا ہوا
کس قدر راہ خودی کا راستہ پر پیچ ہے
میں حصار ذات کی وادی میں ہوں بھٹکا ہوا

بجلیوں کی زد سے ہے محفوظ میرا آشیاں
اک پرندہ اس میں بیٹھا ہے مگر سہما ہوا
مجھ کو بجلی کی چمک نے راستہ دکھلا دیا
ایک مدت سے اندھیرے میں تھا میں بھٹکا ہوا
میں جلا، جل کر بجھا، پھر راکھ کا اک ڈھیر تھا
پھر مری اس خاک سے خاور نیا پیدا ہوا

جلا رہا ہوں زمانے میں آگہی کے چراغ
انہی چراغوں سے روشن کرو خودی کے چراغ
ہمارے بعد اندھیرا تھا تیری محفل میں
بجھے بجھے سے نظر آئے زندگی کے چراغ
اسی لیے تو وہاں وحشتیں برستی ہیں
بہت دنوں سے ہیں خاموش اس گلی کے چراغ
مجھے یقیں ہے نوازے گا مجھ کو بندہ نواز
مری جبیں پہ فروزاں ہیں بندگی کے چراغ
نہ امن ہے نہ سکوں، ہر طرف اندھیرا ہے
کہاں گئے تری محفل سے آشتی کے چراغ
قدم قدم پہ ہوا تیری آہٹوں کا گماں
روش روش پہ خوشی سے جلے خوشی کے چراغ
وہیں پہ دیکھنا خاور کہ روشنی ہو گی
جہاں بھی جائیں گے "عرفان و آگہی" کے چراغ

ہر ایک سنگ مری آگہی کا طالب ہے
مرے لیے تو یہی راستہ مناسب ہے
جو میرے ساتھ ہے یہ روشنی رہے نہ رہے
نئے چراغ جلانا بھی مجھ پہ واجب ہے
مری نظر کو تعجب ہے اس جسارت پر
وہ آئینہ ہے مگر سنگ سے مخاطب ہے
ہر ایک چہرہ تصرف میں رہ نہیں سکتا
اسی کو دیکھ جسے دیکھنا مناسب ہے
چمک رہا ہے اندھیروں میں یوں خیال اس کا
نظر کے سامنے جیسے شہاب ثاقب ہے
جو ظلمتوں کو کبھی راستہ نہیں دیتی
مرا ضمیر اسی روشنی کا طالب ہے
میں اپنی راہ سے خاور بھٹک نہیں سکتا
مرے گمان پہ جب تک یقین غالب ہے

فیصلہ یہ ہے ہوا کے رخ پہ لایا جائے گا
گھر سے جو باہر دیا ہو گا بجھایا جائے گا
امتیاز حسن اس محفل میں ہو سکتا نہیں
آئینے کو آئینہ جب تک دکھایا جائے گا
پتھروں کی کیا حقیقت ہے کہ ان کے سامنے
دل نہیں جھکتا تو کیسے سر جھکایا جائے گا
دور سے منزل نظر آتی ہے جنت کی طرح

خار کا بستر وہاں پر بھی بچھایا جائے گا
کٹ رہا ہے وادیوں میں کوہساروں کا جگر
پھر سمندر میں کوئی دریا گرایا جائے گا
کون جانے نفرتوں کی اس دہکتی آگ میں
کس کو پھینکا جائے گا کس کو گرایا جائے گا
یہ زمانہ دیکھ لے گا روشنی کیا چیز ہے
خاور مشرق کا پردہ جب اٹھایا جائے گا

شاخ گل پر تو بنا سکتا ہوں مسکن اپنا
کاش بن جاتا قفس میں بھی نشیمن اپنا
میں تو عجلت میں ہوں جانے دو مجھے ہمسفرو
راستہ دیکھ رہا ہے کوئی رہزن اپنا
پوچھنے والوں سے کچھ اور تو میں کہہ نہ سکا
میرے جذبات نے پھیلا دیا دامن اپنا
کبھی صیاد کا دھڑکا کبھی بجلی کا عتاب
اک تماشا سا بنا ہے سر گلشن اپنا
آج اے ابر کرم! کھل کے برس اتنا برس
پھر کوئی آگ نہ پکڑے یہ نشیمن اپنا
وقت کے ماتھے پہ اس وقت پسینہ آیا
ایک فنکار نے جب بیچ دیا فن اپنا
آج خاور کی طرح دیکھ لو مجھ کو لیکن
پھر کسی رنگ میں ہو جائے گا درشن اپنا

رہزنوں سے نفرت ہے رہبروں سے وحشت ہے
زندگی کی راہوں میں کس قدر اذیت ہے

کاروان ہستی میں پیش رو جو ہوتے ہیں
خود بھٹکنے لگتے ہیں کیا عجب قیادت ہے

اب کسی کی محفل میں لب کشائی کیا کیجئے
سوچنا مصیبت ہے بولنا قیامت ہے

دھوپ سے پرندوں کے پاؤں جلنے لگتے ہیں
جبر کی فصیلوں پر کس قدر تمازت ہے

زندگی کے ہنگامے کچھ دنوں کے ہوتے ہیں
اس کے بعد تنہائی عمر بھر کی راحت ہے

میں نہیں تو تم کیا ہو، تم نہیں تو میں کیا ہوں
وقت خود بتا دے گا کون کس کی طاقت ہے

مجھ کو اس صداقت پر اعتبار ہے خاور
عکس ایک افسانہ آئینہ حقیقت ہے

حوالہ جات

ناگی عبدالرزاق خاور، قندیل، قریشی پبلی کیشنز کوئٹہ ۱۹۸۸ء
ناگی عبدالرزاق خاور، آبگینہ، انجمن دبستان بولان (رجسٹرڈ) کوئٹہ ۱۹۹۳ء
ناگی عبدالرزاق خاور، عرفان و آگہی، کوئٹہ ۱۹۸۵ء

سرور سودائی

پیدائش ۲۵، دسمبر ۱۹۴۴ء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں پاکستان ٹیلی ویژن کوئٹہ سینٹر نے جہاں ایک ادارے کی حیثیت سے اہم کردار ادا کیا وہیں اس سے وابستہ متعدد افراد نے انفرادی طور پر بھی اس شعبے میں اپنی بے لوث اور موثر خدمات کے انمٹ نقوش ثبت کیے ہیں۔ سرور سودائی جیسی بے مثل شخصیت کا نام ان لوگوں میں سرفہرست ہے۔ انہوں نے نہ صرف کوئٹہ ٹیلی ویژن کے توسط سے بلوچستان کے ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرانے کے سلسلے میں مخلصانہ کوششیں کی ہیں بلکہ مختلف ادبی اداروں، رسائل و جرائد اور ابلاغ عامہ کے دیگر ذرائع سے اس سلسلے میں قابل ذکر کام کیا ہے۔ وہ اپنی مادری زبان پشتو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری میں بھی سادگی، جاذبیت اور اخلاص و وفاداری کے عناصر کچھ اس طرح یکجا نظر آتے ہیں کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است۔ سرور سودائی نہ صرف مزاجاً" شاعر ہیں بلکہ انتہائی سادہ و سہل الفاظ میں شعر کہنے کی وجہ سے انہیں بلوچستان کے شعراء میں ایک منفرد مقام حاصل ہے۔

سرور سودائی ۲۵، دسمبر ۱۹۴۴ء کو شمس الدین کے یہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لورالائی میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۶۲ء میں پنجاب بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور محکمہ جنگلات میں ملازمت اختیار کی، بعد ازاں آپ نے ۱۹۶۸ء میں بی اے کی ڈگری جامعہ پنجاب سے حاصل کی اور ۱۹۷۰ء میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۴ء میں آپ مرکزی وزارت اطلاعات و نشریات کے کوئٹہ آفس سے اسٹنٹ ریسرچ آفیسر کے طور پر وابستہ ہو گئے اور بلآخر ۱۹۷۷ء میں کوئٹہ ٹیلی ویژن سینٹر سے اسکرپٹس پروڈیوسر کی حیثیت سے منسلک ہو گئے جہاں آج کل آپ سینئر اسکرپٹس ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام

دے رہے ہیں۔ اس دوران آپ نے اپنی تعلیمی استعداد کو بڑھانے کی خاطر جامعہ بلوچستان سے اردو اور پشتو میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے علاوہ ۱۹۸۵ء میں قانون کی ڈگری بھی حاصل کی۔

سرور سودائی کی شاعری ایک حساس شخص کی وہ خودکلامی ہے جو ردعمل کی بجائے محبت، اخلاص اور مسلسل وفا کے ذریعے زمانے کی تلخیوں کو کم کرنے کا پیغام دیتی ہے۔ سیدھے سادے، آسان لفظوں میں اپنے احساسات اور خیالات کو بیان کرنا ان کا وصف ہے۔ وہ کم کہتے ہیں لیکن اچھا کہتے ہیں۔

ریاض قمر نے اپنے ایک مضمون میں سرور سودائی کے بارے میں کیا خوب لکھا تھا کہ ”سرور سودائی کے یہاں خوبصورت جذبوں کی فراوانی، محبت کی ٹھنڈی آگ میں بھڑک اٹھنے کی خواہش، تمنا کے اظہار کا ایک سلیقہ ملتا ہے۔ اس کی شاعری میں اپنے عہد کی زندگی کے سب رنگ، سب پہلو اور سارے زاویے نظر آتے ہیں۔ فرد کی تنہائی، معاشرے کی شکست و ریخت، دل و نظر کے فاصلے، حالات کے زیر اثر محبت اور نفرت، اور بدلتے رنگ“

بلوچستان کے ادباء اور شعراء کے نزدیک سرور سودائی کے بغیر پاکستان ٹیلی ویژن کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ پروفیسر شرافت عباس کے بقول ”سرور سودائی پی ٹی وی کی علامت ہیں“

مصر اس پر اگرچہ دل بہت ہے
کسی کو چاہنا مشکل بہت ہے
بظاہر لاتعلق ہے جو مجھ سے
مری باتوں میں وہ شامل بہت ہے
نہیں آوارگی کا شوق مجھ کو
مری منزل، مری منزل بہت ہے
محبت اور نفرت دوستوں کی

مجھے جتنی بھی حاصل ہے بہت ہے
میں اندھا ہو رہا ہوں روشنی میں
مری آنکھوں میں اب جھلمل بہت ہے
کسی کے واسطے راحت ہے دنیا
کسی کے واسطے مشکل بہت ہے
مجھے اذن سفر جس نے دیا تھا
مرے رستے میں وہ حائل بہت ہے

دشت وفا میں صورت گرد و غبار ہیں
ہم لوگ کن خزاؤں کی فصل بہار ہیں
دیکھی ہے کس نے روح کے زخموں کی کہکشاں
چہرے کے خط و خال ہی آئینہ دار ہیں
اک دن تری تلاش میں نکلے تھے گھر سے ہم
اب تک اسیر گردش لیل و نہار ہیں
تو بھی اداسیوں کا سبب پا نہیں سکا
ہم غم پسند لوگ اذیت شکار ہیں
ٹھہریں کہاں کہ دھوپ کی گرمی سے بچ سکیں
جو بھی شجر ہیں راہ میں بے برگ و بار ہیں

ہم ستاروں کے خریدار بنیں یا نہ بنیں
اک تماشا سر بازار بنیں یا نہ بنیں
تو وہ پتھر کہ رہ زیست میں حائل ہے مگر

ہم تری راہ میں دیوار بنیں یا نہ بنیں
شبنم دیدہ تر ہم نے چھڑک دی ان پر
پھول کھل کر ترا رخسار بنیں یا نہ بنیں
کشتیء جاں تو بہر حال ہمیں کھنی ہے
ہاتھ ٹوٹے ہوئے پتوار بنیں یا نہ بنیں
لذت ہمسفری سے تو شناسا ہوں گے
آبلے موجب رفتار بنیں یا نہ بنیں

شکست دل کی صدا آنکھ میں سنائی دی
بچھڑ کے تجھ سے ترے نام کی دہائی دی
تجھے نصیب نہیں، تجھ کو کیا خبر اس کی
وہ روشنی جو مجھے درد میں دکھائی دی
اسیر حلقہ خورشید تھا جھلس جاتا
مگر یہ شب کہ مجھے قید سے رہائی دی
یہی ہیں چند لکیریں مری ہتھیلی پر
جو میرے ہاتھوں نے لا کر مجھے کمائی دی

تو تو عالم ہے سمجھتا ہے کتابوں کی زباں
میرا چہرہ کبھی پڑھ کر مرے حالات بتا
جس سے ہو جائے مجھے تیری محبت حاصل
تو کوئی ایسی دعا ایسی مناجات بتا
تجھ سے ملنا مرا ممکن ہے کہ ہے ناممکن
دیکھ کر تو کبھی اے دوست مرا ہاتھ بتا

پروفیسر شرافت عباس

ولادت جنوری ۱۹۴۶ء

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں جامعہ بلوچستان کا حصہ پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر مجتبے حسین، پروفیسر شمیم احمد، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر وارث اقبال کی صورتوں میں دیکھیے یا ڈاکٹر فاروق احمد، ڈاکٹر عبدالخالق بلوچ، ڈاکٹر فردوس انور قاضی، اوریا مقبول جان، محمد عبداللہ، طاہرہ باقری، طاہرہ بلوچ، آغا محمد ناصر، صدف چنگیزی، عرفان احمد بیگ، بیرم غوری، فاروق فیصل اور راغب تحسین کی ادبی تخلیقات میں، یا نجمہ اسلم، پروین لونی، سہیل جعفر، رخسانہ بشیر، زیب عثمانی، احمد ساگر، صائمہ جبریل اور نوشین قمبرانی جیسے نوجوان لکھاریوں کی کاوشوں میں اسے تلاش کیجئے، ۱۹۷۳ء سے بلوچستان میں اردو شاعری کے حوالے سے جامعہ بلوچستان کے جن طلبا و طالبات اور اساتذہ نے اپنا حصہ ڈالا ان میں پروفیسر شرافت عباس کا حصہ بہت نمایاں اور قابل قدر ہونے کے ساتھ ساتھ قابل تقلید بھی ہے۔

شرافت عباس جنوری ۱۹۴۶ء میں سید مسلم حسین زیدی کے یہاں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حیدر آباد سندھ میں حاصل کی جہاں ڈاکٹر الیاس عشقی کے والد بزرگوار علامہ رزی جے پوری، مولانا حشمت علی، پروفیسر عنایت علی خان اور مختار کریمی جیسے شفیق اور قابل اساتذہ سے استفادہ کیا۔ آپ زمانہ طالبعلمی سے ہی شعر و ادب کی طرف مائل تھے اور کالج اور یونیورسٹی کے دور طالب علمی میں کئی رسائل و جرائد کی ادارت کے علاوہ محکمہ ٹیلی فون کے رسالے "ہیلو" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ آپ نے ایم اے (پولیٹیکل سائنس)، ایم اے (اردو)، اور ایم اے (فارسی) کے امتحانات سندھ یونیورسٹی جامشورو سے امتیازی نمبروں سے پاس کیے اور ۱۹۸۵ء میں جامعہ بلوچستان کے شعبہ اردو میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ اردو ادب کے علاوہ آپ شعبہ ابلاغیات میں بھی لیکچر دیتے

رہے اور جامعہ بلوچستان میں شعبہ فارسی کے قیام کے لیے گرانقدر کوششیں کیں، آجکل آپ شعبہ فارسی کے چیرمین ہیں۔ اردو کے علاوہ آپ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں۔

تخلیقی سرگرمیوں کے علاوہ پروفیسر شرافت عباس نے بلوچستان میں تحقیقی مقالے بھی لکھے ہیں جن میں "ہزرگی زبان و ادب" کے حوالے سے آپ کا کام انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کی کتاب "بلوچستان میں فارسی شاعری کے پچاس سال" حال ہی میں شائع ہوئی ہے جو بلوچستان کے فارسی شعراء پر آپ کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

شرافت عباس نظم و غزل کے علاوہ مرثیے اور منقبت کے نہایت اچھے شاعر ہیں، آپ نے بلوچستان میں قطعہ نگاری کے فروغ میں بھی اہم حصہ لیا ہے آپ کے قطعے روزنامہ "کوہستان" میں ایک سال تک تسلسل سے چھپتے رہے ہیں۔ سنجیدہ تحریروں کے علاوہ آپ کے مزاحیہ اشعار بھی بہت اچھے ہیں۔ آپ کوئٹہ کی بول چال اور روز مرہ کو جس سہولت سے اپنی شاعری میں استعمال کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

پروفیسر شرافت عباس کی شاعری اردو شاعری کے عظیم تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا تسلسل بھی ہے اور روز مرہ ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات سے آگاہی بھی۔ وہ اپنے گہرے لسانی اور تہذیبی شعور کی وجہ سے بلوچستان میں بولی جانے والی اردو اور روز مرہ کو جس سلیقے سے سموتے ہیں وہ نہ صرف بلوچستان میں اردو زبان و ادب کا گرانقدر سرمایہ ہے بلکہ اردو زبان کا مستقبل بھی۔ وہ لفظوں کے تقدس سے آگاہ بھی ہیں اور انہیں برتنے کا فن بھی جانتے ہیں، پروفیسر مجتبے حسین نے ان کے بارے میں کیا خوب کہا ہے کہ "شرافت عباس کی غزلیں، شخصیت بھی ہیں اور معاشرہ بھی ہیں اور ایک فضائی تاثیر بھی رکھتی ہیں، ان کا لہجہ چٹیلا، برماتا ہوا اور تیر و کمان سے لیس ہے، اس میں تہذیب کے عناصر بولتے ہیں اور عصر حاضر کی دانائی نقد و نظر بن گئی ہے"

پروفیسر شرافت عباس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ان کی زود نویسی اور بسیار نویسی سے بھی ہوتا ہے۔ وہ فی البدیہہ شعر ہوں یا کسی مضمون کی فرمائش، ریڈیو پر کسی کتاب پر تبصرہ یا اخبار کے لیے قطعہ، شرافت عباس یہ تمام تخلیقی کام ایک مشینی انداز میں کرکے

پ کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے۔

ایک روایتی استاد کی طرح لفظوں کی بنت، ان کے استعمال اور تلفظ پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ لفظوں کے تقدس سے آگاہ اور ان کے بر محل استعمال کا فن جانتے ہیں۔

حسن و عشق، ہجر و فراق، جیسے بنیادی اور روایتی موضوعات کے علاوہ شرافت عباس استعاروں اور تلمیحات کے ذریعے سماجی تبدیلیوں اور طبقاتی مسائل کو بھی بھرپور انداز میں اپنے اشعار کا موضوع بناتے ہیں، ان کا ذخیرہ الفاظ نہایت وسیع اور ترکیبیں دلکش ہیں اور بقول مجتبی حسین "ان کے لہجہ چٹیلا، برماتا ہوا اور تیر و کماں سے لیس ہے"۔

کبھی تو آئے گا راہ پر وہ کبھی تو وہ بے قرار ہو گا
چلو اسے یہ غزل ہی بھیجیں اسے بھی کچھ انتظار ہو گا

انہی ہواؤں کے سرورق پر لکھی ہے کوئی وصال ساعت
انہی فضاؤں انہی رتوں میں کہیں وہ جان بہار ہو گا

تم اپنے احساس کی زمیں پر جو پھول مہکے سنبھال رکھنا
کہ آنے والے دنوں کا منظر بڑا ہی بے برگ و بار ہو گا

محبتوں کے سفر پہ نکلو تو فاصلوں کو بھی سوچ لینا
مراجعت کی طلب نہ کرنا بلا کا گرد و غبار ہو گا

سواد خوباں کو جانے والو اسے نہ دینا خبر ہماری
وہ پہلے ہی کچھ ملول سا ہے سنے گا تو سوگوار ہو گا

پلٹ کے آنا تو اپنے آنسو ہماری آنکھوں میں دیکھ لینا
یہ واپسی کے سفر کا منظر ہمای جاں پر ادھار ہو گا

نصاب فردا کے سرورق پر ہمارے ہی نام ثبت ہوں گے
جو آج ہم لکھ رہے ہیں کل وہ روایتوں میں شمار ہو گا

دریا میں موج موج میں دھارا ہی ۔ اور ہے
اب کے تو ناخدا کا اشارہ ہی اور ہے

تم ، اپنے سرد و گرم کو پاتال میں رکھو
آب و ہوا ہمیں تو گوارا ہی اور ہے

سوداگران شہر طلب کو خبر نہیں
بازار شوق میں تو خسارہ ہی اور ہے

اے ساکنان ساحل امروز خوش رہو
اپنے خیال میں تو کنارا ہی اور ہے

صحرائے آرزو کے حدی خواں سنبھل کے چل
اس بار آسماں پہ ستارہ ہی اور ہے

ہم پر عیاں ہیں اس کے خد وخال کے طلسم
نقاش نے تو نقش اتارا ہی اور ہے

تشبیہ اس کو لالہ و گل سے نہ دیجئے
اس نے تو رنگ اپنا نکھارا ہی اور ہے

الفاظ کے حصار میں آئے وہ کس طرح
دست ہنر نے اس کو سنوارا ہی اور ہے

اے مشفقان شہر تمہیں کس طرح بتائیں
وہ حسن اور اس کا نظارہ ہی اور ہے

آئینہ خیال سے تا پیکر غزل
سارے تخیلوں سے وہ پیارا ہی اور ہے

واعظ پہ قدغنیں ہیں نہ ناصح پہ بندشیں
ثابت ہوا کہ جرم ہمارا ہی اور ہے

صبا کا جھونکا تھا ظل سحاب تھا کیا تھا
وہ شخص پھول تھا خوشبو تھا خواب تھا کیا تھا

کسی کو کچھ نہ بتایا کسی سے کچھ نہ کہا
تمام عمر ہمیں اضطراب تھا کیا تھا

وہ آرزو تھی کہ حسرت تھی خوف تھا کہ ملال
ہر اک سفر میں کوئی ہمرکاب تھا کیا تھا

سلگتی شام تھی یادوں کی راکھ تھی ہم تھے
پھر اس کے بعد مسلسل عذاب تھا کیا تھا

سواد کوچہ ء جاناں کا لطف آنے لگا
ہوا کے ہاتھ میں جام شراب تھا کیا تھا

نشہ ء جاہ و حشم رکھیو مت
اس خرابے میں قم رکھیو مت

نقد جاں ہے تو در آ محفل میں
صرف باتوں سے بھرم رکھیو مت

آتی جاتی ہوئی رت کہتی ہے
سر میں سودائے صنم رکھیو مت

قصہ ء حسن و وفا جاری ہے
طاق نسیاں میں قلم رکھیو مت

دفتر نظم ہو یا فرد غزل
شعر میں پہلوئے ذم رکھیو مت

غبار راہ کو حد نظر نہ سمجھا جائے

ہمیں خبر ہے ہمیں بے خبر نہ سمجھا جائے

بجا کہ چشم تغافل بھی ہے بنائے فراق
رقیب کو بھی مگر بے ہنر نہ سمجھا جائے

یہ دل کہ واقف آداب عشق ہے اس کو
کبھی ہواؤں کے زیر اثر نہ سمجھا جائے

وہ میکدہ جہاں ساقی بھی مست صہبا ہو
وہ میکشوں کے لیے معتبر نہ سمجھا جائے

شب ستم ہو، شب ہجر ہو، شب یلدا
کسی بھی رات کو یاں بے سحر نہ سمجھا جائے

سنا ہے اور بھی اہل سخن ہیں محفل میں
ابھی سے بزم کو زیر و زبر نہ سمجھا جائے

حاوی اعظم

ولادت اگست ۱۹۴۷ء

رمز و کنایہ میں گفتگو، شاعری کی اساس ہے لیکن زندگی کے حقائق اور تلخیاں شاید اس بات کی اجازت کم ہی دیتی ہیں کہ آپ ہر موقع پر اشاروں کنایوں میں گفتگو کر سکیں۔ غزل کے دو مصرعوں میں اب عشق کے معاملات ہی موضوع نہیں بنتے، اردو غزل کے موضوعات اس قدر وسیع ہو چکے ہیں کہ ان میں پیچیدہ فلسفیانہ مضامین سے پند و نصائح اور سیاسی و معاشی حالات و واقعات سے سائنسی اصطلاحات و ایجادات سب کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ انسانی نفسیات اور عمرانی اصولوں کی بات ہو یا نظام فطرت کے ساتھ ابن آدم کی ہم آہنگی، یہ تمام گفتگو اب ہماری شاعری کے موضوعات میں شامل ہے۔

زندگی کے ان تلخ حقائق کو جب بھی شعر کے قالب میں ڈھالا گیا اس پر تنقید ہوئی لیکن ان حقیقتوں کا بیان اور اظہار اور بھی ضروری ہو جاتا ہے جب معاشرہ خود تشخیصی اور خود تنقیدی سے بھی غافل ہو گیا ہو۔

مثال اس کے تنزل کی پھر بھلا کیا ہو
عروج ہی کسی تہذیب کا جو کوٹھا ہو

ہر سو متعدی سی فضا چھائی ہوئی ہے
طاعون سیاست کی وبا چھائی ہوئی ہے

شراب و جسم فروشی میں چند کا نقصان
ضمیر اور قلم بیچنے میں سب کا ضرر

حاوی اعظم کی شاعری زندگی کے انہی تلخ حقائق، فرسودہ اصولوں اور خود فریبی میں مبتلا رویوں کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ وہ نامردی اور پسپائی پیدا کرنے والے خیالات کو انسانی زندگی اور معاشرے کے لیے مضر سمجھتے ہیں اور باعزت و باوقار زندگی گزارنے کے

لیے تاریخی حقائق کو بے نقاب کر کے اپنے اشعار کے ذریعے زندگی بخش اصول دیتے ہیں۔
حاوی اعظم کی شاعری مروجہ شعری رجحانات سے ہٹ کر ہے اس لیے اکثر لوگ چونک کر انہیں دیکھتے ہیں اور پولیس کی وردی میں ملبوس اس خوبصورت جوان سے یوں گھبراتے ہیں جیسے رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔ لوگوں کو چونکا کر انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے کا ہنر ہی حاوی اعظم کی شاعری ہے۔

حاوی اعظم بلوچستان کے ان شعراء سے تعلق رکھتے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں اور نہ ہی پیشے کے حوالے سے وہ شاعری سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ساٹھ کی دہائی سے بلوچستان کے مقامی شاعروں میں حاوی اعظم کا نام ایک معتبر حوالہ ہے۔ حاوی اعظم اپنے مخصوص خیالات اور افکار کے ساتھ شعر کی فنی باریکیوں سے آگاہ، کم گو لیکن خوب گو شاعر ہیں۔

حاوی اعظم پہلے پہل اسلم افغانی کے نام سے شعر کہا کرتے تھے اور ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے اپنی کتاب "بلوچستان میں اردو" میں نوجوان شاعروں کے ضمن میں محبت کے ساتھ آپ کا ذکر کیا ہے۔ آپ اگست، ۱۹۴۷ء میں کوئٹہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام محمد اعظم خان تھا جو ایک نسل پہلے افغانستان سے کوئٹہ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ حاوی اعظم نے ابتدائی تعلیم کوئٹہ کے اسپیشل ہائی سکول سے حاصل کی اور ۱۹۶۳ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد کوئٹہ کے اکلوتے کالج گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۶۶ء میں اے ایس آئی کے طور پر پولیس میں بھرتی ہوئے۔ آج کل آپ ڈی ایس پی کے عہدے پر تعینات ہیں۔ آپ کی کتاب "تند و کند" ۱۹۹۱ء میں زمرد پبلیکیشنز، مستونگ سے شائع ہوئی جس میں غزلوں اور نظموں کے علاوہ نثر پارے بھی ہیں۔

حاوی زبان و بیاں پر مکمل قدرت رکھنے والے شاعر ہیں اور ان کا تنقیدی شعور ان کے ذاتی مشاہدے اور گہرے مطالعے کی وجہ سے خاصا بے رحمانہ بھی ہے۔ وہ اساتذہ فن کے کلام پر جس بیدردی سے گرفت کرتے ہیں اور اردو کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھنے والوں کی غلطیاں جس طرح پکڑتے ہیں اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ نہ صرف اردو

زبان پر مکمل عبور رکھتے ہیں بلکہ فن عروض پر بھی مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی غزلوں اور نظموں میں انتہائی پیچیدہ خیالات اور افکار کو کسی اضافی لفظ کے بغیر کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے ذاتی مشاہدے اور تجربات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کمزور طاقتوروں کے سامنے کچھ نہیں اور آج بھی در حقیقت Might is right کا قانون جاری و ساری ہے۔

یہی زمانے کے جنگل کی ریت ہے کہ یہاں
نہ بن سکا جو شکاری وہی شکار ہوا
ہے امن مکمل سبب جنگ خطرناک
اور جنگ خطرناک سے ہے امن مکمل
شیر سی طاقت تحفظ کے لیے کافی نہیں
لومڑی سا مکر، چیتے جیسی عیاری بھی سیکھ
میان برہ و آہو، پلنگ و گرگ آزاد
میپرس حال عوام و تحفظ حکام
زندہ رہنے دے نہ موذی کو، اگر طاقت ہے
دوسری شکل یہی ہے کہ سپیرا بن جا

حاوی اعظم کے اشعار کا سرسری جائزہ لینے والے انہیں طاقتوروں اور ظالموں کا حامی سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے اشعار میں زندگی کے حقائق اور ان سے نبرد آزما ہونے کے لیے جس توانائی اور بیدار مغزی کی ضرورت ہے اس کی طرف وہ اپنے قاری کو آمادہ کرتے ہیں۔

پہل کر پہل کہ شاید مری الجھن بھی ہو ختم
عین ممکن ہے وہی بات ہو تیرے دل میں
جس کے اظہار نے ڈالا ہے مجھے مشکل میں

وہ عزت نفس، خود داری، خود اعتمادی کا درس اس انداز میں دیتے ہیں کہ زندگی

کے مصائب و آلام کا شکار' زندگی سے نبرد آزما ہونے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کے سامنے دست سوال پھیلانے اور گریہ و زاری کو انسانی زندگی کے لیے زہر قاتل سمجھتے ہیں۔

میں با ادب تھا مجھے کہہ کے بارہا گستاخ
شعار اہل ادب نے بنا دیا گستاخ
ہے شرط ادب کی جو دیوث و ہیجنی کا طریق
تو با ادب سے ہو بہتر بدرجہا گستاخ

دوبارہ جا نہیں سکتا وہاں خجالت سے
میں ایک بار نکالا گیا ہوں جنت سے

وہ اپنے گہرے مشاہدے کی وجہ سے صدیوں سے طے شدہ سماجی افکار کو رد کرنے کی جرات بھی رکھتے ہیں اور نئے راستوں کا تعین بھی۔ وہ ایک حقیقی پولیس آفیسر کی طرح مجرم کو پکڑ کر معاف کرنا نہیں جانتے بلکہ اسے عدالت تک لیجاتے ہیں جہاں اس کے مقدر کا فیصلہ ہو۔ ان کے اشعار میں انسانی کمزوریوں کی نشاندہی جس سلیقے سے کی گئی ہے وہ اردو شاعری کا ایک انوکھا اور منفرد انداز ہے اور یہی حاوی اعظم کا کمال بھی۔

آپ ہزاروں اشعار میں سے حاوی کے اشعار کی نشاندہی فوراً" کر سکتے ہیں وہ چبائے ہوئے نوالوں کی بجائے اپنے فکر خوش سے زندگی کے حقائق کا پردہ چاک کرتے ہیں اور ایک ماہر سرجن کی طرح معاشرے کے گندے اصولوں کو اس کے جسم سے نکال کر شفایاب کرتے ہیں۔ جو لوگ سرجن کے نشتر اور قصاب کی چھری کے فرق کو نہیں سمجھتے وہ حاوی کے کلام کو نہیں سمجھ سکیں گے۔

بچے کے واسطے تو کھلونا ہے سانپ بھی
انساں کو تجربات نے بزدل بنا دیا

نہیں' وہ سہو نہیں' مدعائے باطن ہے
جو شخص نشہ میں وحت کوئی بات کہہ جائے

کم فہمی و خطا کا سبب ہی نہ تھا فریب
مجھ کو خلوص نے بھی دیا بارہا فریب

وہ میری خامیوں سے بخوبی ہیں آشنا
ناقابل ازالہ ہے احباب کا فریب

خود ڈھونڈھتا ہوں اپنی بدی کے لیے جواز
مجھ سے زیادہ دے گا مجھے کون کیا فریب

مشکل سے جب ارادہ ترک بدی کیا
امید اختیار بدی نے دیا فریب

سود و زیاں کا اس میں فقط احتمال ہے
ہے تجربہ خطا تو خطا ذہن کا فریب

صحرا میں ہے سموم گلستاں میں ہے نسیم
ماحول کے اثر سے بنی ہے ہوا فریب

درشت و سخت مزاج اور دل ہے جل کی طرح
مری مثال سراسر ہے' ناریل کی طرح

یہ عصر سفلہ کہاں اور ہم کہاں لیکن
ہیں پر شکوہ غلاضت میں بھی کنول کی طرح

بھلا بھروسہ جوانی کا کیا ہے کوئی بھی آن
گرے کسی کی بھی جھولی میں پختہ پھل کی طرح

پلٹ کے آ گیا ماضی کہ وقت ساکن ہے
کہ آج بھی ہے وہی اضطراب کل کی طرح

مجھے پسند نہیں اس لیے، کہ اچھی ہے
بس اس لیے ہے وہ اچھی، پسند میری ہے

خیال میں ہے نہ وہ دل میں، بلکہ اسکی یاد
دل و خیال میں آنے کی وجہ بنتی ہے

بھلا اسے کوئی مردانہ بات کیا بھائے
زنانہ رنگ صدا کا جو کان عادی ہے

نتیجہ کی نہیں پروا، نتیجہ کچھ بھی ہو
مری لڑائی بدی کے خلاف جاری ہے

نمک ہی تھا گو ہمارا وجود آٹے میں
جو ہم نہیں تو زمانے کی بزم پھیکی ہے

وہ سامنے ہو تو کیفیت اس گھڑی کیا ہو
سوال یہ نہیں کوئی حسین کتنی ہے

ضرر ہے صبر میں، اور احتیاط میں نقصان
اگر تقاضہ حالات جلد بازی ہے

میں ڈر رہا ہوں اسی خوفناک وحشی سے
پناہ لے کے جو مجھ میں، مجھی پہ حاوی ہے

خلاف خو ہے، پہ حاوی میں اپنی خو پر ہوں
عقاب جنگ میں ہوں، امن میں کبوتر ہوں

کمال سبزہ مرے پیش پا، صنوبر ہوں
ہما شما کی حقیقت ہی کیا، سکندر ہوں

گداز و دلکش و پر خار ہوں، معطر ہوں
اگر گلاب نہیں ہوں گلاب پیکر ہوں

نہ کیوں نشانہ ء ذہن یہود پیکر ہوں
جہان معنی و فکر و نظر کا ہٹلر ہوں

مری تلاش کوئی کر سکے اگر تو کرے
میں کوہ سار میں کان جواہر و زر ہوں

بدلتی ہیں مری کیفیتیں ہوا کی طرح
میں دوستوں کو صبا، دشمنوں کو صرصر ہوں

مری سرشت کو چہرے سے جاننے والو
برنگ پستہ و بادام سخت پیکر ہوں

مرے وجود سے تیری ہے قدر، اے دنیا
ترے کریہہ بدن پر حسین زیور ہوں

آنے دو حادثات کو مجھ سخت جان پر
طوفان کا اثر نہیں ہوتا چٹان پر

ہونا پڑا کہیں جو زمانے کا ہم رکاب
چلنا پڑا وہیں ہمیں خنجر کی سان پر

اب درپہ ء زمیں ہے خدا کا یہ لاڈلا
جی بھر کے گل کھلانے کے بعد آسمان پر

یہ مصلحت پسند بنا وہ خطر پسند
تاثیر عقل الگ ہے ضعیف و جوان پر

یہ بھی رہے خیال وہیں سے گرا نہ دے

تجھکو بٹھائے وقت اگر آسمان پر

ارباب اختیار کا محبوب مشغلہ
پگڑی اچھالنا کبھی، کبھی پگڑی سنبھالنا
کیا مدعا بیاں ہو، کدھر جایئے بھلا
گونگا ہے ترجمان، تو اندھا ہے رہنما
اندھے کو آنکھ مل گئی، مردے کو زندگی
لیکن گدھا، ہمیشہ گدھے کا گدھا رہا
بدذوق، بدمزاج، گھمنڈی کہا کہ کیوں
ہم نے خوشی جتانے کو ڈالا نہ بھنگڑا
تلوار جو علامت جمہوریت ہوئی
ہو گا یوٹوپیا کا نمائندہ بھڑیا
جس کا یقین تھا، نہ ہوا، بلکہ بیشتر
وہم و گمان میں بھی نہ تھا جو وہی ہوا
بچے کے واسطے تو کھلونا ہے سانپ بھی
انساں کو تجربات نے بزدل بنا دیا

حوالہ جات

کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، بلوچستان میں اردو، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
حاوی اعظم، تند و کند، زمرد پبلی کیشنز مستونگ، ۱۹۹۱ء

سعید گوہر

پیدائش ۲۵، دسمبر ۱۹۴۷ء

سعید گوہر بلوچستان کے وہ باصلاحیت، صاحب استعداد اور قادرالکلام شاعر ہیں جو نہ صرف اردو بلکہ پشتو کے بھی صف اول کے شاعر، ادیب، مترجم، محقق اور نقاد شمار کیے جاتے ہیں۔ نام و نمود، شہرت و مقبولیت سے بے نیاز، بلوچستان کا یہ قابل فخر فرزند انتہائی انہماک، لگن اور تسلسل سے گزشتہ تین دہائیوں سے اردو زبان و ادب کے فروغ میں کوشاں ہے۔ بلوچستان میں اردو شاعری کے حوالے سے گفتگو سعید گوہر کے ذکر کے بغیر کبھی بھی مکمل نہیں ہو سکتی۔

سعید گوہر ۲۵، دسمبر ۱۹۴۷ء کو حکیم بہادر نواز اورک زئی کے یہاں کاکڑی محلہ لورالائی میں پیدا ہوئے۔ اپنے بڑے بھائی پروفیسر ربنواز مائل کی طرح ابتدائی تعلیم لورالائی میں ہی حاصل کی اور ۱۹۷۹ء میں پشاور یونیورسٹی سے ایم اے پشتو کی ڈگری حاصل کی۔ آج کل اسلام آباد میں وزارت اطلاعات و فروغ ابلاغ حکومت پاکستان میں ڈپٹی ڈائریکٹر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سعید گوہر اب تک متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں "لیکنخئی" (جدید پشتو نظم و نثر کا انتخاب) ۱۹۸۴ء، "پس دیوار" مجموعہ اردو غزل، ۱۹۸۵ء، پشتو قاعدہ جماعت اول، بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ ۱۹۹۰ء، دیوان مرزا جناں بارکزئی ۱۹۹۶ء، "پٹہ خزانہ فی الحقیقت" (معروف پشتو قلمی نسخے پر تحقیق و تنقید) ۱۹۹۶ء قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر شمیم احمد نے سعید گوہر کی کتاب "پس دیوار" کے بارے میں لکھا تھا کہ "بلوچستان میں عطا شاد اور سعید گوہر جدید طرز احساس کے جدید تر پہلوؤں کو دو مختلف اسالیب میں بیان کر رہے ہیں بالکل ۱۹۳۶ء کے فطری اور طبعی شعری تناظر میں سعید گوہر مجاز اور فیض کی طرح اپنا شعری رشتہ اردو کی بنیادی شعری روایت سے قائم رکھنا چاہتے

ہیں جب کہ عطا شاد، ارشد کی طرح اپنے شعری آہنگ کو روایت کے مقابلے پر انحراف اور اسے شعری تجربات میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ بڑا دلچسپ تناظر ہے یہاں میں عین سلام اور ربنواز مائل کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا جن کو میراجی اور ارشد کی شاعری کا تتبع کرنے کا خیال بلوچستان میں سب سے پہلے آیا۔"

پروفیسر سحر انصاری ۱۹۸۵ء میں پروفیسر شیم احمد کے ہمراہ سعید گوہر کی پہلی کتاب "پس دیوار" کی تقریب رونمائی میں شرکت کے لیے کوئٹہ تشریف لائے اور سعید گوہر کی شاعری پر اپنے مضمون سے بھی نوازا۔ یہ ایک یادگار تقریب اس لیے بھی تھی کہ مرحوم شیم احمد اپنے مزاج اور اصول کے برخلاف کسی ادبی تقریب میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اپنا مضمون بھی سنایا۔ سعید گوہر کی شاعری کے بارے میں پروفیسر سحر انصاری نے لکھا تھا کہ "سعید گوہر کی غزل کا بنیادی خمیر ایک رجائیت پسند انسان کے مزاج سے اٹھا ہے۔ وہ زندگی، اس کے گرد و پیش اور اس کی ماورائی کیفیات پر اسی طرح سوچتے ہیں جیسے ایک حساس انسان کو سوچنا چاہیے۔ انہیں خیر و شر، تیرگی و روشنی کی کشمکش میں یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ شب پرستوں نے بنیادی حقائق کو اپنے انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے لیکن فتح بہرحال خیر اور روشنی ہی کی ہوئی ہے۔ یہ حوصلہ ایک زندگی گزار کر حاصل ہوتا ہے اور اس زندگی کے نشیب و فراز اور پیچ و خم کا احساس سعید گوہر کے کلام میں جابجا ملتا ہے۔.....
سعید گوہر کی غزلوں کا مطالعہ کرکے سب سے پہلا تاثر یہ قائم ہوتا ہے کہ ان کی غزل کسی رسمی اظہار کی دین نہیں ہے بلکہ ان کے پاس کچھ کہنے کو ہے جس کے لیے وہ غزل کا اسلوب اختیار کرتے ہیں ان کی غزلوں میں ایک اہم بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ بہت کم کسی کی غزل پر غزل کہتے ہیں اس کے بجائے وہ اپنی زمینیں خود اختراع کرتے ہیں اور یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ شاعر کی طبع زاد زمین اس کے لیے زیادہ سازگار اور تازہ کاری کا سبب ہوتی ہے۔"

عبدالکریم بریالی سعید گوہر کے ان دوستوں میں سے ہیں جنہوں نے لڑکپن اور جوانی کی منزلیں ساتھ ساتھ طے کی ہیں۔ سعید گوہر کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں

بریالی لکھتے ہیں کہ " سعید گوہر کی شاعری درد اور کرب کے رجحان ساز ماحول کی پیداوار نہیں۔ اپنے مطالعے کی بنیاد پر انہوں نے جو کچھ اخذ کیا ہے اس میں ذاتی واردات بہت حد تک اثر انداز رہی ہے۔ یہ دعوی نہیں بلکہ ایک ثبوت ہے ایک لمبے عرصے تک میں نے اپنے ہمزاد کی حیثیت سے انہیں قریب سے محسوس کیا ہے۔ ان کی کیفیات اپنے ماحول کے سماجی تناظر اور انسانوں کے ساتھ استوار رشتوں کا ردعمل، ان کی شاعری کا سرچشمہ ہے۔ وہ انسانی وجود کو خوشی دینے کا سہارا ضرور لیتے ہیں لیکن ان کے تصور نے انسانی وجود کو عدم تحفظ کا طرز فکر دیا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی ذات کی انا کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ کائنات کی منفی قوتیں، موت، تیرگی، فتنے، رتجگے، کھنڈر، تھکن، ویرانی اور فنا منظر نگر سے انہیں روبرو ہونا پڑا ہے اور فکری ژولیدگی کے نتیجے کو مثبت پیرائے کی خاطر غزل کے سانچے میں ڈھال دیا ہے ..... گوہر اپنی حال کی واردات اور جذباتی روئیداد کو اس ترکیب اور شدت کے ساتھ شعر میں سمیٹ لیتا ہے کہ سانحہ متحرک محسوس کیا جا سکتا ہے"

"پس دیوار" کے بعد سعید گوہر کی شاعری نے کئی رنگ بدلے ہیں اور ان کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ خدا کرے ان کا تازہ مجموعہ جلد چھپ کر سامنے آئے۔

خواہش و خواب دیے ہستی و عالی نے مجھے
محو پرواز رکھا بے پر و بالی نے مجھے
یہی احسان بہت ہے کہ جگہ بخشی ہے
سر چھپانے کو کسی خانہ ء خالی نے مجھے
میں نے دیکھی ہی نہیں آنکھ اٹھا کر دنیا
رہن رکھا تری تصویر خیالی نے مجھے
اک روپے کے عوض کتنی دعائیں دے دیں
کر دیا کتنا غنی ایک سوالی نے مجھے

میری شاخیں، مرے پھل پھول، مہک اور سایہ
خوب سینچا ہے لہو سے مرے مالی نے مجھے
دیر آنے کی ہے بس، مجھ کو یقیں ہے واللہ
باندھ لینا ہے ترے روضے کی جالی نے مجھے

تری خدائی سے نسبت کوئی نہیں رکھتے
ہم ایسے لوگ ضرورت کوئی نہیں رکھتے
ہمارا کام محبت کو عام کرنا ہے
دلوں میں بغض و عداوت کوئی نہیں رکھتے
جہاں فروختنی ہوں، انا، ضمیر، قلم
ہم ایسے شہر میں قیمت کوئی نہیں رکھتے
ہمارے ہاتھوں کی الجھی ہوئی لکیریں ہمیں
بتا رہی ہیں کہ قسمت کوئی نہیں رکھتے
ہمارا جسم ادھورا، شناخت ادھوری ہے
ہم اسم رکھتے ہیں، صورت کوئی نہیں رکھتے
ہمارے شعر بھی جھوٹے ہیں، فن بھی جھوٹا ہے
ہمارے لفظ بھی حرمت کوئی نہیں رکھتے

چاند بوؤں گا مگر تاریکیاں کاٹوں گا میں
عمر بھر خوابوں کی فصل رائیگاں کاٹوں گا میں
وہ شجر ہوں میں جو اپنے آپ میں گلزار ہے
خشک ہو جائیں تو اپنی ٹہنیاں کاٹوں گا میں
میں وفاداری میں بھی بے مثل، غداری میں بھی

قید کاٹوں گا وگرنہ بیڑیاں کاٹوں گا میں
قربتوں کے ذائقے کم کم ملے قربت میں بھی
کب تلک یہ فاصلے، یہ دوریاں کاٹوں گا میں
تجھ کو چاہا ہے تو پانا بھی ہے، اپنانا بھی ہے
دشت پاٹوں گا یہ اونچی چوٹیاں کاٹوں گا میں
میں بتاتا ہوں فنا کیا ہے، بقا کیا چیز ہے؟
عمر اور پھر عمر قید جاوداں کاٹوں گا میں
حق نہیں لکھے گا تو گوہر قلم کر دوں گا ہاتھ
سچ نہیں بولے گی تو اپنی زباں کاٹوں گا میں

مکتب عشق سے نکلے سر مقتل آئے
زندگانی کے کسی کام تو پاگل آئے
سر سے دستار گری، ہاتھ سے تلوار گری
ایسے حالات میں کیا یاد وہ آنچل آئے
تیری تصویر بنا لوں، تجھے تحریر کروں
یاد اب کے تری آئے تو مسلسل آئے
پھر کوئی کرب کا عالم ہے دل و جاں پہ محیط
بس ذرا دیر میں بارش ہے کہ بادل آئے
کیا میری، کیا میری آنکھوں کی خطا ہے اس میں
خواب ادھورا سہی، تعبیر مکمل آئے
رات دن درپہ ء جاں دشمن جاں تھے گوہر
چہرہ ء وقت پہ ہم اپنا لہو مل آئے

میں ان کو خوش نہیں دیکھوں تو سو نہیں سکتا
میں اپنے بچوں سے ناراض ہو نہیں سکتا
میں آگے جاؤں کہ پیچھے، یہ سوچنا ہو گا
سفر کا پھر سے تو آغاز ہو نہیں سکتا
ابھی یہ پر مرے زخمی ہیں، خون میں تر ہیں
ابھی میں شامل پرواز ہو نہیں سکتا
یہ زندگی ہے، اسے زندگی سمجھ کے گزار
معاملات سے اغماض ہو نہیں سکتا
جو میری رات کا قصہ ہے اور حصہ نہیں
وہ میری ذات کا ہمراز ہو نہیں سکتا
اگر میں اپنی ہی پہچان کے نہیں لائق
اگر میں اپنی ہی آواز ہو نہیں سکتا
میں ہوں تو اپنے حوالے سے زندہ ہوں گوہر
غزل میں حافظ شیراز ہو نہیں سکتا

خجل نہیں کہ برے کو بھلا نہیں لکھا
لکھا تو جس کو ہر گز ہوا نہیں لکھا
یہی بہت ہے کہ اس منحرف زمانے میں
بتان گلبدناں کو خدا نہیں لکھا
اسی میں وحدت و کثرت کی سب کہانی ہے
ترے وجود کو خود سے جدا نہیں لکھا
رہے ادھورے، وضاحت طلب نکات تمام
کتاب میں نے لکھی، حاشیہ نہیں لکھا

اس عاجزی میں بھی جھکنا مرا مزاج نہیں
دعا تو لکھی مگر مدعا نہیں لکھا
شکایت شب جبر اور جبر شب گوہر
حکایت لب و گیسو میں کیا نہیں لکھا

•

قفل ابجد ہوں مگر کھول تو سکتا ہے کوئی
یہی رشتہ تو مری ذات سے رکھتا ہے کوئی
دور رہتا ہے مگر روشنی دیتا ہے مجھے
اک ستارہ سا سر بام چمکتا ہے کوئی
جھوٹ کیا بولوں کہ آنسو ہیں گواہی کو بہت
سچ یہی ہے کہ مرے دل میں دھڑکتا ہے کوئی
موت آ سکتی ہے پر صبر نہیں آ سکتا
اس سے کہنا کہ ترا راستہ تکتا ہے کوئی
سوچتا ہوں مرے اعصاب شکستہ کیوں ہیں
دیکھتا ہوں، تری تصویر پہ سکتہ ہے کوئی
رات ہوتی ہے تو اب بھی مرے اندر گوہر
ہوک اٹھتا ہے، تڑپتا ہے، سسکتا ہے کوئی

کاغذ کی ناؤ بر سر آب حیات میں
اس پر بھی سوچتا ہوں کہ ہوں کائنات میں
تو ساری کائنات کا حاصل ہے اصل ہے
خود سے بچھڑ گیا ہوں مگر تیرے ساتھ میں
ہم میں سے جھوٹ بول رہا ہے کوئی ضرور

یا میری ذات تو نہیں یا تیری ذات میں
کاغذ بنا، قلم نہ سیاہی، نہ شعر تو
چوڑی بنا، کلائی نہ مہندی، نہ ہاتھ میں
ہم دونوں اپنی اپنی جگہ محترم، اہم
راحت کا دن ہے تو تو محبت کی رات میں
عہد گزشتہ کی کسی تاریخ کی طرح
ٹوٹا ہوا سا سلسلہ ء واقعات میں
گوہر نجانے آئے گی کب منزل مراد
محو سفر ہوں کب سے مرے ساتھ ساتھ میں

مرا چہرہ نما ہے
محبت آئینہ ہے
میں تجھ جیسا نہیں ہوں
یہی تو مسئلہ ہے
تو ہی تو ہے جو میری
تہجد کی دعا ہے
سنو تو سسکیاں ہیں
کوئی تو رو رہا ہے

حوالہ جات

سعید گوہر، پس دیوار، پشتو ادبی ملگری، ۱۹۸۵ء
پندرہ روزہ "وادی" کوئٹہ، جلد نمبر۲ شمارہ نمبر ۱۴-۱۵

عرفان الحق صائم

ولادت ۱۴، ستمبر ۱۹۵۱ء

بلوچستان میں سنجیدگی اور تسلسل کے ساتھ گزشتہ تیس برسوں سے نظم و نثر میں یکساں لکھنے والوں میں عرفان الحق صائم کا نام قابل ذکر ہے۔ غزل، نظم، قطعہ، مضمون نویسی کے علاوہ آپ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے بھی لکھتے رہے ہیں اور مختلف اخبارات و رسائل میں صحافتی خدمات بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ اپنے ہم عصروں میں تاریخ گوئی کے حوالے سے بھی آپ منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

عرفان الحق صائم ۱۴، ستمبر ۱۹۵۱ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے، آپ کے دادا میراں بخش مفتوں ۱۸۸۵ء میں مشرقی پنجاب سے سب پوسٹ ماسٹر ژوب کی حیثیت سے بلوچستان آئے اور یہیں کے ہو رہے۔ آپ کے والد قاضی مظفر الحق ظفر بھی محکمہ ڈاک میں ملازم رہے اور بلوچستان میں خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے دادا صاحب دیوان شاعر تھے جبکہ آپ کے والد بھی شعر کہتے تھے۔ صائم نے ابتدائی تعلیم کوئٹہ میں حاصل کی اور ۱۹۶۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج کوئٹہ کے طالب علم بنے تو آغا صادق حسین سے اپنے اشعار پر باقاعدہ اصلاح لینا شروع کیا، اور فنی امور پر ان سے تربیت لینے کے ساتھ ساتھ بطور خاص تاریخ گوئی کا فن سیکھا۔ آغا صادق حسین کے بعد آپ اخگر سہارنپوری سے اصلاح لیتے رہے، تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ شناختی کارڈ کے محکمے سے وابستہ ہوئے اور ڈپٹی ڈائریکٹر کے عہدے پر ریٹائرمنٹ لے لی۔ آج کل آپ روزنامہ زمانہ سے وابستہ ہیں۔

یہ صرف ڈراتا ہے مگر کچھ نہیں کہتا
اس شب کے اندھیرے سے نہ ڈر کچھ نہیں کہتا
موسم ہی اگر کہہ دے کوئی بات تو کہہ دے
سہمی ہوئی چڑیوں کو شجر کچھ نہیں کہتا

یادیں ہی پرندوں کو اڑا لاتی ہیں واپس
جب گھر سے نکلتے ہیں تو گھر کچھ نہیں کہتا
مل جائے صعوبت میں سر راہ اگر وہ
ایسے میں ہمیں رنج سفر کچھ نہیں کہتا
کٹ کر بھی جو سر جھک نہ سکے اس کی صدا سن
طاقت سے جھکایا ہوا سر کچھ نہیں کہتا
تم خواب سفینوں کو ادھر شوق سے بھیجو
آنکھوں کے سمندر کا بھنور کچھ نہیں کہتا
یہ آگ تمہیں بڑھ کے بجھاؤ تو بجھاؤ
صائم کبھی جلتا ہوا گھر کچھ نہیں کہتا

مرا ہر فائدہ اب تک مسلسل خواب جیسا ہے
مگر دھڑکا خسارے کا کسی گرداب جیسا ہے
کہا اپنی غرض کے واسطے ہر ایک نے اپنا
ہمارا حال بھی کھوئے ہوئے اسباب جیسا ہے
اسے تو دور رکھنا تھا تجسس کے شیشوں سے
کہا بھی تھا وہ ضدی فطرتاً سیلاب جیسا ہے
جہاں بھولے سے کچھ پیاسے پرندے اب بھی آتے ہیں
ہمارا شہر بھی سوکھے ہوئے تالاب جیسا ہے
خبر رکھتا ہوں میں سطح زمین ماہ کی ساری
مرا محبوب لیکن آج بھی مہتاب جیسا ہے
جنہیں لکھیں نہ لکھیں لفظ میں موجود رہتے ہیں

مرے شعروں میں تیرا ذکر بھی اعراب جیسا ہے
ضرورت کی کوئی شے وقت پر ملتی نہیں صائم
مرا گھر بھی کسی حد تک مرے احباب جیسا ہے

کیسی ہے یہ دل میں ہلچل' ایسا کیوں ہے
پھرتا ہوں میں جنگل جنگل' ایسا کیوں ہے
دھرتی کا ہرذرہ بے کل' ایسا کیوں ہے
میں بھی پاگل تو بھی پاگل ایسا کیوں ہے
آموں کا موسم تو کب کا بیت چکا ہے
کوک رہی ہے باغ میں کوئل ایسا کیوں ہے
دل کے صحرا میں تو قحط سرابوں کا بھی
چھلک رہی ہے آنکھ کی چھا گل' ایسا کیوں ہے
گھر کے صحن کی ہر دیوار ہے اونچی پھر بھی
ڈھلکے باہر بیل کا آنچل' ایسا کیوں ہے
اس کے پیتل کے زیور بھی سونا صائم
اور اپنا سونا بھی پیتل ایسا کیوں ہے

تمہاری آنکھوں میں وہ رتجگے سے کیسے تھے
کہ تم تو نیند میں ڈوبے ہوئے جزیرے تھے
یہ میرے ہاتھ نہ تھے ہار ماننے والے
یہی تو ساتھ مرے دو بڑے قبیلے تھے
یہ شہر خواب یونہی بے سبب نہیں اجڑا

سنا ہے نیند کے لشکر یہیں سے گزرے تھے
ہوا حساب تو اک صاحب نصاب تھا میں
اگرچہ پاس مرے صرف تیرے وعدے تھے
ملیں کمال رفاقت سے منزلیں صائم
وگرنہ غول میں زخمی کئی پرندے تھے

کشتیاں شوق سے کاغذ کی ڈبونے آئے
پر مرے شہر کو بارش کوئی دھونے آئے
گاؤں کی تازہ ہوا سے کوئی جا کر کہہ دے
شہر میں اور پریشان نہ ہونے آئے
اس کی آنکھوں کو چمکتی ہوئی تعبیریں دیں
اپنی آنکھوں میں مگر خواب نہ بونے آئے
غیب کا علم ہر انساں کو اگر ہو جائے
اپنے بچے کوئی میلے میں نہ کھونے آئے
اس کو ہر شہر اگر شہر پذیرائی ہو
چاندنی رات کو جنگل میں نہ سونے آئے
کیسے چل پائے گی یہ زیست کی گاڑی صائم
اس کے حصے میں تو پہیے بھی تکونے آئے

اتنے برے حالات نہیں تھے جینے کی آسائش تھی
لاشوں کے انبار نہیں تھے، گنتی کی گنجائش تھی
میں نے شاید پہلے اک تقریب میں تم کو دیکھا ہے

شہر کا نام تو یاد نہیں زخموں کی ایک نمائش تھی
گولی چلنے کی آوازیں اس دن اتنی زیادہ تھیں
جیسے شہر کے ہر اک گھر میں بیٹے کی پیدائش تھی
کیونکر مجھ کو نیند آجاتی تھی یخ بستہ راتوں میں
شاید یہ بھی اس کی اچھی یادوں کی گرمائش تھی
شیر نے ہرنوں کے اک غول سے مارا بھی تو ایک ہرن
جنگل کے قانون میں صائم اتنی تو گنجائش تھی

اب تو مالک میرے ہر اک درد کا درمان کر
کب تلک لیٹا رہوں زخموں کی چادر تان کر
اب تو حیرانی کسی بھی بات پر ہوتی نہیں
ہوسکے تو، توڑ یہ سکتہ، مجھے حیران کر
بند بوری شہر ناپرساں میں اک پیغام ہے
یہ لفافہ کھولنا اپنا پتا پہچان کر
اجنبی، مل بیٹھنے کے کچھ تقاضے تو نبھا
لوٹ کر گھر کا پتا، جھوٹا کوئی پیمان کر
سوچتا ہوں بیوفائی اس کی مجبوری نہ ہو
اس نے رخ پھیرا مجھے اچھی طرح پہچان کر
میں محبت میں بیان مصلحت سنتا نہیں
یا مجھے تسلیم کر یا جنگ کا اعلان کر
اپنے خوابوں کے محل کے ڈھیر پر بیٹھا ہوا میں
مجھ کو اب بے دخل اس حق سے نہ میری جان کر

زندگی پہلے ہی صائم آج کل دشوار ہے
ہوسکے تو اپنی باتیں اور بھی آسان کر

BURIED MINE

تم نے کچھ دن تو، بہت ٹوٹ کے،
اس دل سے محبت کی تھی،
پھر تمہیں شک نے جلایا تو بچا کچھ بھی نہیں
ہاں مگر یاد رہے، دل ہوا راکھ
مگر راکھ میں اکثر دبی رہتی ہے کوئی چنگاری
میں نے مانا تمہیں احساس نہیں ہے اس کا
سچ بہرحال ہے سچ، تم نے کچھ دن تو بہت ٹوٹ کے
اس دل سے محبت کی تھی
میں جبھی کہنے پہ مجبور ہوں جاناں
ایک دن میرا خیال آئے گا جب ٹوٹے گی
تھپکیاں دے کے سلائے ہوئے بارود کی نیند!

عرفان احمد بیگ

ولادت ۱۲ دسمبر ۱۹۵۴ء

عرفان احمد بیگ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، کالم نویس، مضمون نگار اور محقق ہیں، بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں جن نوجوانوں نے شعوری طور پر اپنا بھرپور کردار ادا کیا، عرفان احمد بیگ کا نام ان میں سرفہرست ہے۔ وہ ایک نہایت محنتی، مستقل مزاج اور باحوصلہ شخص ہے جس نے اپنی شبانہ روز کی محنت اور ریاضت سے نہ صرف اردو شاعری میں تخلیقی سطح پر اپنا نام پیدا کیا ہے بلکہ اپنے تنقیدی اور تحقیقی شعور کی وجہ سے بھی قابل قدر ہے۔ عرفان احمد بیگ کی شاعری حسن و عشق کی روایتی موضوعات کے ساتھ ساتھ سماجی اقدار، طبقاتی تقسیم کے رد عمل کی شاعری ہے۔ وہ انتہائی سادہ زبان اور چھوٹی بحروں میں شعر کہتا ہے۔

عرفان احمد بیگ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۴ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حسان احمد بیگ ریلوے میں گارڈ تھے اور ہندوستان سے ہجرت کرکے کوئٹہ میں آباد ہو گئے تھے۔ عرفان نے اپنا بچپن ریلوے کالونی کے کوارٹر میں شرارتوں کے ساتھ گزارا، اپنے بچپن کی شرارتوں کیوجہ سے وہ دوستوں اور ہمجولیوں میں آج تک مقبول ہے۔ اس کے برجستہ جملے، برمحل لطیفے اور بے تکلفانہ گفتگو ادبی حلقوں میں اسکی ہردلعزیزی کی بڑی وجہ ہے۔ میٹرک کرنے کے بعد عرفان احمد بیگ ۱۹۷۴ء میں ہی اسکول ٹیچر بن گئے اور پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ جامعہ بلوچستان سے بی اے کا امتحان پرائیوٹ پاس کیا اس دوران روزنامہ مشرق کوئٹہ میں مختلف کالم، مضامین اور انٹرویوز کا سلسلہ بھی جاری رکھا، ۱۹۸۴ء میں سکول سے رخصت لے کر یونیورسٹی میں شعبہ سماجی بہبود میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۸۶ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ جس کے بعد فزیکل ایجوکیشن میں ڈپٹی ڈائریکٹر رہے اور ۱۹۹۳ء میں کالج میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۵ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

اسلام آباد سے "پروفیسر مجتبیٰ حسین، فن اور شخصیت" کے عنوان سے ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھا اور کامیاب ہوئے۔ عرفان احمد بیگ آجکل گورنمنٹ کالج حب میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

عرفان احمد بیگ نے مسلسل جدوجہد، محنت، خوداعتمادی اور یقین کامل سے اپنے آپ کو منوایا ہے۔ عرفان اب تک سینکڑوں تحقیقی، علمی اور ادبی مضامین لکھ چکے ہیں جو ۱۹۸۰ء سے اب تک مختلف اخبارات و جرائد میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ بلوچستان کی ادبی شخصیات کے انٹرویوز ہوں یا ادبی محفلوں کی رپورٹنگ، تنقید و تحقیق ہو یا سماجی جائزے، عرفان نے ہر موضوع پر نظم و نثر میں یکساں طور پر اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ امداد نظامی نے چند سال پیشتر اپنے ایک مضمون "مغل بچے کے عرفان غزل" میں کیا اچھا لکھا تھا کہ "عرفان احمد بیگ کا شمار منفرد لب و لہجہ اور تازہ تر محسوس ہونے والے نوجوان شعراء میں ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں جدید حسیت اور اپنے عہد کے انسانی مسائل کی فنکارانہ عکاسی کے حوالے سے بے حد اہم سمجھی جاتی ہیں وہ غزل کی دلکش روایت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی غزل کو اپنے ماحول میں اس کے مادی و روحانی مسائل اور دوسرے خارجی عوامل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش اس قدر خوب صورت انداز میں کرتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔۔۔ وہ ایک نوجوان شاعر ہیں اور ایک فطری امر کے طور پر ان کے اشعار میں ایک نوجوان کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے، والہانہ انداز کی رومانیت اور ہجر و فراق کی کسک بھی ان دھڑکنوں کے نغموں میں شامل ہے....."

شاعری، اخباری کالموں کے علاوہ عرفان افسانے اور مزاح بھی لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے بلوچستان کے معروف شاعر عطاشاد پر پی ایچ ڈی کے لیے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں اپنے باقاعدہ کام کا آغاز کرلیا ہے۔

جو دیکھا آئینہ گھبرا گیا تھا
میں اپنے آپ سے ٹکرا گیا تھا

وہاں ملبے کی بولی لگ رہی تھی
میں گرچہ شام کو گھر آ گیا تھا
مری ہی کرچیوں میں ہے کہیں گم
وہ پتھر جو مجھے راس آ گیا تھا
اب آدھی قیمتوں پر بک رہا ہوں
میں پوری قیمتیں ٹھکرا گیا تھا
مجھے کچھ یاد آئے آج عرفاں
جو عرفاں کل مجھے سمجھا گیا تھا

تیری خوشبو کو لکھا تھا میں نے
تیرے سائے کو سنا تھا میں نے
بند کمرے میں کتابیں لے کر
مدتوں تجھ کو پڑھا تھا میں نے
اب ساعت کا گماں یاد نہیں
کس کو آواز کہا تھا میں نے
ایک ہچکی کا تصور کرکے
پھر ترا نام لیا تھا میں نے
اب جو بکھرا ہوں تو یاد آیا ہے
درد کا ضبط سہا تھا میں نے
کیسا انجام ہوا ہے دل کا
کیسا آغاز کیا تھا میں نے

آج اپنی کمی کو فرض کریں
عمر کی زندگی کو فرض کریں
آؤ سانسوں کی اوٹ میں بیٹھیں
لمس کی باطنی کو فرض کریں
آؤ انسان کو کریں معلوم
آؤ اس آدمی کو فرض کریں
آؤ دل بانٹ دھڑکنیں کھیلیں
درد کی سنسنی کو فرض کریں
لا کا مفہوم مل ہی جائے گا
آؤ اک آگہی کو فرض کریں

شعور جامد نہیں

ہوا کی جو راہ گزر ہے
وہاں ہوا چلے گی
صدا کا مسکن، خلا نہیں ہے
ہوا چلے گی
شمال مشرق، جنوب مغرب
شعور جامد نہیں رہے گا!

حوالہ جات

پندرہ روزہ "وادی" کوئٹہ

بیرم غوری

پیدائش ۲۵، دسمبر ۱۹۵۴ء

بلوچستان کے "صاحب دیوان" شعراء میں بیرم غوری اپنے منفرد اسلوب، فنی استعداد، پختہ کاری اور شعری ندرت کی وجہ سے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ بیرم کا پہلا شعری مجموعہ "آدھی نیند" کے نام سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

بیرم غوری ۲۵، دسمبر ۱۹۵۴ء کو کوئٹہ میں عبدالعزیز غوری کے یہاں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ سنڈیمن ہائی اسکول کوئٹہ سے حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۱ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ جس کے بعد محکمہ صنعت میں ڈیزائنر کی حیثیت سے منسلک ہو گیا۔ ۱۹۸۹ء میں جامعہ بلوچستان سے ابلاغیات میں ایم اے کرنے کے بعد ۱۹۸۹ء سے ہی جامعہ بلوچستان میں لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۸ء سے جنگ کے ادبی صفحے کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے۔

پھر بھی بیچ ہمارے ٹھہری جنموں والی باڑ
پل پل ٹوٹ رہی تھی چاہے صدیوں والی باڑ
تنہائی کی اوٹ سے دیکھی ڈھلنے والی دھوپ
سپنوں کی دیوار کے سائے پھولوں والی باڑ
چاند ابھر آنے سے پہلے والا اک سناٹا
توڑ رہا تھا خاموشی میں گلیوں والی باڑ
سلگ رہی تھی دل میں لیکن کوئی پرانی یاد
خوش منظر تو شام بہت تھی گملوں والی باڑ
تیرے ساتھ بھی کیسا ہے یہ دل کا خالی رہنا

اچھا تو ہے نا ہی لانا رشتوں والی باڑ
کھلے ہوئے دروازوں میں ہے مرا بھی اک دروازہ
اپنے آگے اب مت رکھنا باتوں والی باڑ
ایک دوپٹہ آنکھوں میں ہے موسم موسم ساتھ
ٹوٹ گئی ہے جب سے پچھلے جاڑوں والی باڑ

خیال تازہ پہ ہے منحصر چراغ جلے
بیاض مصرع گل پر اگر چراغ جلے
ہمیں حوالہ نسبت ہے معتبر لیکن
ہمارے بعد کوئی معتبر چراغ جلے
خط زمین پہ چلتے ہوئے زوال کے وقت
رکا تو ہو گا کہیں نامہ بھر چراغ جلے
مرا خیال، مرا آسماں ستاروں بھرا
یہ پھول ہیں کہ مری خاک پر چراغ جلے
میں آ گیا تو ہوں اے شہر آشنائے مراد
میں جاؤں گا بھی مگر کس کے گھر چراغ جلے
ابھی ہے وقت کوئی جشن کوئی ہنگامہ
جو ہم نہ ہوں گے تو کس کو خبر چراغ جلے
اداس ہوتے ہوئے بھی اداس مت لگنا
یہ کیا۔ ضرور کہ ہر موڑ پر چراغ جلے
انہیں کو زحمت دیوار و در گوارا تھی
جو لوٹ آتے رہے اپنے گھر چراغ جلے

طلوع صبح کے منظر میں ساتھ تھا جس کے
میں اس کے ساتھ نہیں ہوں مگر چراغ جلے

زمیں سے نکلے ہوئے آسماں سے نکلے ہوئے
ہم اور لوگ تھے دونوں جہاں سے نکلے ہوئے
پلٹ پڑے ہیں تو سینہ سپر بھی کرنا ہے
ہمارے تیر ہماری کماں سے نکلے ہوئے
یہ رنگ پھول پرندے خیال ہیں شاید
فضائے کوچہ پیغمبراں سے نکلے ہوئے
وفا کے نام پہ خاموش ہو گئے لیکن
جیئے ہیں کس کے لیے جسم و جاں سے نکلے ہوئے
یہ روز و شب کا تسلسل رہے رہے نہ رہے
ابھی تو ہم ہیں تمہاری اماں سے نکلے ہوئے
پہنچ سکیں گے کسی منزل تیقن پر
ہمارے بعد یہ نوحہ کناں سے نکلے ہوئے
خبر ہے کیسے ہیں وہ گھر وہ موڑ وہ گلیاں
زمانہ ہو گیا ہم کو وہاں سے نکلے ہوئے
اداس پیڑ تھے خاموش کھڑکیاں کمرے
خزاں میں لوٹ کے آئے خزاں سے نکلے ہوئے

فلش فارورڈ

ہم لوگ کسی رات کے زینے سے اترتے

مل جاتے کسی صبح کی فٹ پاتھ پہ چلتے
ٹھہرے گا خلاؤں میں کہاں تک مرا رستہ
اک عمر گزاری ہے اسی خاک پہ چلتے
اب شام بھی ہونے کو ہے سردی بھی ہے لیکن
تم ہوتے تو کچھ دیر درختوں میں نکلتے
ایسا نہ ہوا خیر کوئی بات نہیں ہے
کچھ دور تو چلنا تھا ترے ساتھ ٹہلتے
وہ عمر وہ الزام پسندی نہیں لیکن
اے کاش تری راہ میں ہم بیٹھ ہی سکتے
ہونا تو یہی ہے کہ حوالہ بھی نہ ہو گا
نسبت میں تو سچ ہے ترے کچھ بھی نہیں لگتے

حوالہ جات

سرآب (جشن سیمیں) شعبہ اردو جامعہ بلوچستان، کوئٹہ
بیرم غوری، "آدھی نیند" ناشاد پبلشرز کوئٹہ ۱۹۹۸ء

اوریا مقبول جان

پیدائش ۱۸ جنوری ۱۹۵۶ء

جامعہ بلوچستان کی بنیاد پڑی تو بلوچستان کے علاوہ ملک کے دیگر حصوں سے بھی اس صوبہ کی علمی اور ادبی خدمت کے لیے بہت سے اساتذہ کوئٹہ آئے جن میں کچھ تو جلد ہی چلے گئے اور کچھ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں سے رخصت ہوئے، لیکن سی ایس ایس کرنے کے باوجود بھی بلوچستان میں رہنے والے اوریا مقبول جان وہ واحد شخص ہیں جو بلوچستان کی محبت میں یہیں کے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اوریا مقبول جان بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں نظم و نثر میں یکساں طور پر نہ صرف قرطاس و قلم کے ذریعہ بلکہ ٹیلی ویژن کے ڈراموں کے ذریعے بھی قابل ذکر خدمات انجام دے رہے ہیں، آپ کی شخصیت اور فن کے بارے میں پروفیسر مجتبیٰ حسین نے کیا خوب لکھا تھا کہ " اوریا مقبول جان کی شاعری ان کی شخصیت ہے، ان کی شخصیت میں جاذبیت ہے، دلکشی ہے اور دھنک کا رنگ ہے، مختلف مباحث پر وہ جان نکار کی طرح گفتگو کر سکتے ہیں، اختلاف مزاج کو برداشت کرنا ان کی شخصیت کی بنیادی خصوصیت ہے، وہ بے لوث اور بے لاگ ہیں، اپنی صاف کھری رائے دینے میں کبھی نہیں چوکتے، اس رائے میں کد، کینہ پروری یا عداوت کا شائبہ نہیں ہوتا، صرف صداقت ہوتی ہے۔ ان کے کلام کا وصف یہ بھی ہے کہ نہایت نازک باتوں کو جن کو چھپانے ہی میں مصلحت اور عافیت ہے وہ برملا اور بے لاگ طور پر کہہ دیتے ہیں، اوریا مقبول جان کی شاعری کے یہ دونوں پہلو ان کے رومانی مزاج پر حاوی ہو جاتے ہیں، طبعاً وہ رومان پسند ہیں، ان کے یہاں جسم و جان کی سرگوشیاں، لہراتی ہوئی زلفیں اور نیزے کی طرح بلند ہوتا ہوا قد رعنا، زندگی کو رنگ، آہنگ اور خوابناکی دیتا ہے۔"

اوریا مقبول جان ۱۸، جنوری ۱۹۵۶ء کو گجرات میں پیدا ہوئے، آپ کے والد محترم کا نام مقبول احمد عباسی ہے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گجرات کے گورنمنٹ کمپری ہنسیو ہائی سکول

سے حاصل کرنے کے بعد صرف تیرہ سال کی عمر میں ۱۹۶۹ء میں سرگودھا بورڈ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور زمیندار ڈگری کالج سے ۱۹۷۵ء میں بی اے کرنے کے بعد جامعہ پنجاب میں شعبہ سماجی بہبود میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۸ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ایم اے کرنے کے بعد آپ کچھ عرصہ فونٹین ہاؤس لاہور میں کام کرتے رہے اور ایک کورس کے لیے امریکہ میں چھ ماہ رہے اور پھر ۱۸، مارچ ۱۹۸۰ء کو جامعہ بلوچستان سے لیکچرر کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۸۴ء میں آپ نے سی ایس ایس کیا اور سول سروسز اکیڈمی لاہور میں ایک سال کا کورس کرنے کے بعد ۱۹۸۶ء میں دوبارہ کوئٹہ آ گئے اور بلوچستان کے مختلف اضلاع میں اسسٹنٹ کمشنر اور بعد ازاں ڈپٹی کمشنر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں آج کل آپ حکومت بلوچستان میں سوشل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ میں ڈائریکٹر ہیں۔

آپ کا مجموعہ کلام "قامت" کے نام سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا جس کا پیش لفظ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کا ٹیلی ویژن ڈرامہ "گرداب" بھی کتابی صورت میں ۱۹۹۰ء میں چھپ چکا ہے۔

عطاشاد نے اوریا مقبول جان کے بارے میں کیا اچھا کہا ہے کہ "اوریا مقبول جان ان چند چنیدہ شاعروں میں ایک ہیں جو باخبر بھی ہیں، متوازن بھی، جو ہجوم مصلوباں میں قد نکالنے کا فن بھی جانتے ہیں اور جو نظر بھی رکھتے ہیں اور ہنر بھی"

"جب بہت سے استعارے مردہ ہو جائیں اور گل و لالہ کا حجاب ختم ہو جائے تو بین السطور گفتگو کرنے والا اچھا اور اپنا اپنا لگتا ہے، اوریا مقبول جان ایسا ہی صاحب کلام ہے، اس کے نام کی طرح اس کی شاعری میں کئی ثقافتی رنگ یکجا ہو گئے ہیں، مجھے اوریا کی شاعری میں انتہاؤں کے درمیان زندگی بسر کرنے والا آدمی نظر آیا ہے، وہ ان انتہاؤں کو اپنی شاعری کی صورت میں ایک وحدت بنا دیتا ہے" (ابوالخیر کشفی)

کون اس اجڑے نگر میں جاگتا رہ جائے گا
ہاں کہ جو دکھ جھیلتا سکھ بانٹتا رہ جائے گا

خواہشیں سو جائیں گی تیرے وصال و قرب کی
بند آنکھوں میں تصور جاگتا رہ جائے گا

دوستی کر لے گا اس سے کوئی مرد تند خو
اور تو شائستگی کو بانٹتا رہ جائے گا

سانپ ڈس جائے گا اس کی مدھ بھری گولائیاں
اور تو گونگی لکیریں پیٹتا رہ جائے گا

خود ڈبو ڈالے گا اپنے آپ کو ہر ایک شخص
وقت دریا کا تحیر دیکھتا رہ جائے گا

دور ہوتی جائے گی بچھڑے ہوئے قدموں کی چاپ
گم، اکیلا، چپ وہ کیا کچھ سوچتا رہ جائے گا

کوئی دستک بھی نہ دے گا دل کے دروازے پہ جان
من منڈیروں پر سے کوا بولتا رہ جائے گا

تم سے بچھڑے رت جگوں کا سلسلہ چلنے لگا
غم ستارہ، دل فلک پر رات بھر کھلنے لگا

چاند کے چہرے میں تجھ کو دیکھنا اور چاند سے
چپکے چپکے گفتگو کا سلسلہ چلنے لگا

تم بھی کچھ مغرور بن بیٹھے انا کے خول میں
میں بھی کیا تھا بے نیازی کا گلہ کرنے لگا

آنکھ کے روزن سے آنسو جھانکتے تھے بارہا
رفتہ رفتہ قیدیوں کو راستہ ملنے لگا

دوریوں کی دھوپ میں جو شخص بادل روپ تھا

کس افق کی سمت جانے وہ بھی اب چلنے لگا
ڈھونڈنے نکلے تجھے اس شہر میں جان وصال
تم نہ مل پائے مگر اپنا پتہ ملنے لگا

قامت ولدار

عام سا چہرہ کہ جس کے نقش سارے خواب خواب
عام سی رنگت کہ جیسے بجھ گیا ہو آفتاب
عام سی آنکھیں کہ کھل اٹھیں گلابوں کی طرح
خواب سی پلکیں کہ چھا جائیں حجابوں کی طرح
عام سی باتیں، کھلنڈرا پن، جوانی کا خمار
خواہشوں کے بوجھ سے ٹوٹے بدن کا برگ و بار
رات کی صورت گھنی زلفوں کا سایہ بے حساب
روشنی کھو دیں جہاں جذبوں کے سارے آفتاب
ہاں مگر قامت کہ ہو جیسے جدائی کی گھڑی
یا شب فرقت تری تجسیم کی صورت کھڑی

حوالہ جات

اوریا مقبول جان، "قامت" پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، لاہور ۱۹۸۸ء

نجمہ واحد

پیدائش پچاس کی دہائی

سیدہ نجمہ واحد بلوچستان کی شاعرات میں خاصی سینیر ہیں تقریباً" بیس بائیس سال سے شاعری کر رہی ہیں۔ ان کی شاعری کا آغاز کالج کے زمانے میں ہو گیا تھا اور گورنمنٹ گرلز کالج کوئٹہ کے مشاعروں نیز کالج میگزین "زرغون" کے ذریعہ ان کی صلاحیتیں ۷۶-۱۹۷۷ء کے دوران سامنے آئیں۔

نجمہ واحد نے ۱۹۷۸ء میں جامعہ بلوچستان سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد ادارہ نصابیات میں شمولیت اختیار کر لی۔ مشغلہ، مصروفیت اور شوق کے یکجا ہو جانے کی وجہ سے ان کی شاعری میں خاصا نکھار پیدا ہوا اور مشق سخن نے اس کو مزید جلا بخشی، چنانچہ اب وہ بڑے التزام کے ساتھ غزلیں اور نظمیں لکھتی ہیں۔

نجمہ واحد بنت سید عبدالواحد شاہ محمد خالد کی اہلیہ ہیں جو خود بھی محکمہ تعلیم سے منسلک ہیں۔ نجمہ واحد کا اب تک کوئی مجموعہ کلام سامنے نہیں آیا ہے۔

گزری ہے عمر دھوپ کے آزار دیکھ کر
نیند آ رہی ہے سایۂ دیوار دیکھ کر
ہم مشکلوں میں آج بھی مشکل پسند ہیں
تھکتے نہیں ہیں راہ کو دشوار دیکھ کر
دانستہ پھر فریب ہی کھانا پڑا مجھے
ان کے لبوں پہ وعدہ دیدار دیکھ کر
راہ طلب میں اپنے قدم تیز تھے مگر
رکنا پڑا ہے وقت کی رفتار دیکھ کر

وہ جن کی آرزو میں لٹائی متاع جاں
بیگانہ بن گئے مجھے نادار دیکھ کر
منزل قریب ہوتے ہوئے دور ہو گئی
ہم رک گئے تھے راہ کو ہموار دیکھ کر
ویرانیاں سمیٹی ہیں نجمہ تمام عمر
اب کیا کریں گے رونق بازار دیکھ کر

رنگ رخ نکھرنے میں دیر کتنی لگتی ہے
زندگی سنورنے میں دیر کتنی لگتی ہے
گھر کو بھول جانا تو ریت ہے پرندوں کی
آشیاں بدلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
بے ہنر بھی اب خود کو باشعور کہتے ہیں
حیثیت بدلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
دل میں آرزو بھی ہو ہو کوئی سہارا بھی
گر کر پھر سنبھلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
تیز ہوں ہوائیں گر لاکھ ہوں گھٹائیں گر
چاند کے نکلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
وہ جو مہرباں ہو کر بخش دے خوشی دل کو
قسمتیں سنورنے میں دیر کتنی لگتی ہے
آج کل کے بیوپاری ہیر پھیر کرتے ہیں
پینترا بدلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

کل خزاں کا موسم تھا آج موسم گل ہے
نجمہ رت بدلنے میں دیر کتنی لگتی ہے

کوئی بھی بہانہ بنا دیجئے
مجھے درمیاں سے ہٹا دیجئے
مری عرض پہلے سنیں تو سہی
مجھے پھر جو چاہے سزا دیجئے
فقط اک تبسم بہت ہے مجھے
مرے سارے شکوے مٹا دیجئے
اداسی اداسی ہے چاروں طرف
خدا کے لئے مسکرا دیجئے
محبت مرا دین و ایماں ہے
میں مجرم ہوں مجھ کو سزا دیجئے
محبت سے نجمہ کہا ہے انہیں
یہ رنجش کی دیوار ڈھا دیجئے

مجھے آہ و فغاں کا درد و غم کا پھر پیام آیا
نجانے کونسی منزل ہے یہ کیسا مقام آیا
گلہ کیسا' شکایت کیا' مقدر ہی کچھ ایسا تھا
قدم جس راہ پر رکھا کوئی مشکل مقام آیا
زمانہ ہو گیا ہم سے تعلق توڑ بیٹھے ہیں
تعجب ہے اچانک آج کیوں ان کا سلام آیا

نگاہ لطف ہی تیری بہت دلکش تھی اے ساقی
تری یہ مہربانی تھی کہ ہم تک دور جام آیا
میں ناواقف تھی تیرے میکدے کے راز سے ساقی
رہی مایوس میں برسوں، نہ تم آئے نہ جام آیا
کہیں رسوا نہ ہو جاؤں، انہیں رسوا نہ کر ڈالوں
اسی ڈر سے کبھی نجمہ نہ لب تک ان کا نام آیا

آغا محمد ناصر

پیدائش ۴، مارچ ۱۹۵۶ء

ترے ہر غم سے سمجھوتہ کیا ہے
جو دل اب چین سے یوں رہ رہا ہے
دہکتا تھا جو انگارے کی صورت
ترے غم کا وہ شعلہ بجھ چکا ہے
کہیں محرومیاں بھی بھولتی ہیں
مگر یہ کام بھی دل کر گیا ہے
بہت آرام سے دن کٹ رہے ہیں
بہت آرام سے دل جل رہا ہے
تجھے دیکھوں نہ دیکھوں ایک موسم
میری آنکھوں میں آ کر رک گیا ہے
مجھے تنہائیاں کہتی نہیں کچھ
اب ان سے دوستانہ کر لیا ہے
بہت آرام ہے اس دل کو جب سے
غموں نے تیرے آ کر گھر کیا ہے
مسلسل دوریاں ہی دوریاں ہیں
تری فرقت کا اچھا دائرہ ہے
کبھی پوچھا نہیں جو تو نے مجھ سے
جواب اس کا بھی دل نے دے دیا ہے

اس طرح میں تجھ سے آشنا ہوں
تو میرا میں تیرا آئینہ ہوں
یہ کون ہے مجھ میں ساتھ میرے
میں کس سے کلام کر رہا ہوں
اس خلوت غم میں کون ہے وہ
ہر لمحہ جسے میں سوچتا ہوں
چھوڑا تھا جہاں پہ ساتھ اس نے
کیا سوچ کے میں وہاں کھڑا ہوں
اظہار کا یہ بھی ہے طریقہ
اشعار میں خود اتر گیا ہوں
اے مجھ سے نظر چرانے والے
پلکوں پہ تری سجا ہوا ہوں
میں ڈھونڈ رہا ہوں کس کو ناصر
پھولوں کا طواف کر رہا ہوں

یہ کیا شام و سحر میں ہے ہمارے
تماشا سا جو گھر میں ہے ہمارے
توازن ہے اسی سے زندگی میں
یہ سودا سا جو سر میں ہے ہمارے
وہ اتراتا پھرے ہم اس پہ خوش ہیں
ابھی تک وہ اثر میں ہے ہمارے

یہ اعجاز وفائے دلبراں ہے
وگرنہ کیا ہنر میں ہے ہمارے
تری یادیں، تیری زلفوں کی خوشبو
ابھی دیوار ودر میں ہے ہمارے
کوئی مٹتی ہوئی تصویر تیری
ابھی تک چشم تر میں ہے ہمارے
محیط ہر دو عالم ہے وہ ناصر
مگر قلب و نظر میں ہے ہمارے

پرندوں کے پروں میں زور کیا ہے
ہواؤں سے یہ جا کر پوچھنا ہے
تحیر سے ہر اک یہ پوچھتا ہے
ہمارے سامنے کیا ہو رہا ہے
بھلا کر بھی اسے دل خوش نہیں ہے
وہ یاد آتا ہے کیوں یہ سوچنا ہے
اسے دیکھا کیے ہم زندگی بھر
اب اپنے آپ کو بھی دیکھنا ہے
ان آنکھوں کو بھلا کر سوچتا ہوں
مری نظروں کو یہ کیا ہو گیا ہے

ایک احساس ہو، چاندنی کی طرح، روشنی کی طرح، زندگی کی طرح
تم مرے پاس ہو، چاندنی کی طرح، روشنی کی طرح، زندگی کی طرح

آرزو بھی ہو تم، جستجو بھی ہو تم، اور تمہی باعث حسرت و یاس ہو
اور تمہی آس ہو، چاندنی کی طرح، روشنی کی طرح، زندگی کی طرح

استعارہ بھی تم اور تشبیہ بھی، ایک اجمال بھی ایک تصریح بھی
کس قدر خاص ہو، چاندنی کی طرح، روشنی کی طرح، زندگی کی طرح

میں سراب مسلسل ہوں صحرا ہوں اور تم مری جان اک چشمہ آب ہو
تم مری پیاس ہو، چاندنی کی طرح، روشنی کی طرح، زندگی کی طرح

خاک نمناک میں ہوں اگر تو مرا تم ہی ذوق نمو، تم ہی اعجاز ہو
پھول ہو باس ہو، چاندنی کی طرح روشنی کی طرح، زندگی کی طرح

غم کے بادل یہاں سے گزر جائیں گے، بس ذرا دیر میں مثل موج رواں
کتنے حساس ہو، چاندنی کی طرح، روشنی کی طرح، زندگی کی طرح

تو کوئی پھول نہیں، چاند یا ستارہ نہیں
ترے لیے کوئی تشبیہ و استعارہ نہیں
یہ غم نہیں ہے کہ میرا نہ بن سکا لیکن
ملال یہ ہے کسی کا بھی تو سہارا نہیں
دیا ہے تو نے یہ ییسا شعور غم دل کو
فراق میں بھی گریباں جو پارہ پارہ نہیں
میں تجھ سے دور سہی، تو نہیں ہے مجھ سے دور
یہ جان کر تجھے ہر پل، کہاں پکارا نہیں
جو پار لگتے ہیں ہر موج ان کو ساحل ہے
یہ اور بات کہ اس بحر کا کنارا نہیں

میں اور میں

مجھے ایک کمرے سے زیادہ کی قطعاً ضرورت نہیں ہے
میں تنہا ہوں اور میری ہر چیز اس میں،
نہایت قرینے سے رکھی ہوئی ہے
اگر اتفاقاً کبھی روشنی بھی نہ ہو تو مجھے،
موم بتی، صراحی، گلاس اور ماچس کی ڈبیا کی خاطر،
تلاش اور تردد کے آزار سے کام پڑتا نہیں ہے
مگر اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے
کہ میری امنگیں جوانی سے پہلے ہی مر کھپ چکی ہیں
مجھے میری تنہائیاں بھا گئی ہیں
فقط میں نے اپنی ضرورت کو خواہش سے
اور خواہشوں کو ہوس سے
جدا کر لیا ہے
حقیقت کو اپنا خدا کر لیا ہے

خواب

ہونا تو وہی ہے جو مقدر میں لکھا ہے
لیکن وہ مرے خواب، مرے خواب، مرے خواب
مرے خواب، مرے خواب......
....
....

نون الف کے نام

اس نے مجھ کو لکھا تھا، مجھ کو سوچتی ہے وہ
روز و شب خیالوں میں مجھ کو پوجتی ہے وہ
اس نے یہ بھی لکھا تھا، میرے دن سنہرے ہوں
میری یاد کے لمحے اس کے دل میں گہرے ہوں
مان تھا اسے مجھ پر کج ادائیوں پر بھی
چاہتی تھی وہ مجھ کو بے وفائیوں پر بھی
مجھ سے میرے غم لے کر انبساط دیتی تھی
جس طرح سے ممکن تھا، میرا ساتھ دیتی تھی
زندگی برتنے پر بار بار اکساتی
کہر میں کرن بن کر مجھ کو راہ دکھلاتی
جب بھی میں بکھر جاتا وہ سمیٹ لیتی تھی
میری تلخیاں لے کر مجھ کو پیار دیتی تھی
جس ذہین لڑکی کی دوستی پہ نازاں ہوں
آج بھی نجانے کیوں اس سے میں گریزاں ہوں

صلہ

تو نے اچھا نہ کیا
توڑ کے دل
چھوڑ کے ساتھ
تو نے اچھا نہ کیا
میری برسوں کی محبت کا صلہ

یوں بہ انداز جفا
دے کے سزا
تو نے اچھا نہ کیا
میری گذری ہوئی تنہا راتیں
تجھ سے ہونی تھیں جو ساری باتیں
میری بے نور سی ویراں راتیں
تیری گلیاں، مری راہیں
پوچھتی ہیں جو ترا
کیا کہوں تو ہی بتا
جان وفا
تو نے اچھا نہ کیا
تو نے اچھا نہ کیا

گہن

ختم ہی نہیں ہوتیں
یہ فراق کی راتیں
یہ فراق کی باتیں
روز وصل کا سورج
کب گہن سے نکلے گا
ہجر چاندنی بن کر
مجھ کھلے سمندر پر
مہرباں ہے برسوں سے!!!

سرور جاوید

پیدائش ۲۰' جولائی ۱۹۵۷ء

سرور جاوید ۲۰' جولائی ۱۹۵۷ء کو محمد شفیع کے یہاں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں جامعہ بلوچستان سے کیمسٹری میں ایم ایس سی کرنے کے بعد ۱۹۸۷ء میں پی سی ایس کا امتحان پاس کیا جس کے بعد بلوچستان کی ضلعی انتظامیہ میں اے ڈی سی کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کا شعری مجموعہ "سر مجس شب" کے نام سے ۱۹۹۸ء میں شائع ہو چکا ہے۔

جان لیوا ہے سکوت آؤ صدا ہو جائیں
ہم سر مجس شب باد صبا ہو جائیں

آپ کے قرب سے منزل کی مہک آتی ہے
مجھ سفر بخت سے چاہیں تو جدا ہو جائیں

تم کہ ہو پھول مہکتے رہو گلشن گلشن
ہم کہ خاکستر اندوہ وفا ہو جائیں

اپنی چاہت کا ہر اک رنگ چھپا کر رکھیں
عکس تحریر بنیں برگ حنا ہو جائیں

ملے جو زخم تھے کیا اور خواب کیسے تھے
صحیفہ غم ہستی کے باب کیسے تھے

کبھی نہ ختم ہوئی رات کس بلا کی تھی
ابھر سکے نہ کبھی آفتاب کیسے تھے

ہمارے نام کیے وقت کے سبھی آلام
کتاب درد ترے انتساب کیسے تھے

وہ بوجھ ہے کہ تہوں تک اتار لایا ہے
مگر یہ لوگ سر سطح آب کیسے تھے
تری رضا یہ نہیں تھی تو پھر بتا مجھ کو
مری زمیں پہ جو اترے عذاب کیسے تھے
اگر حیات سفر میں نہ تھے تضاد تو پھر
بھنور میں پاؤں نظر میں سراب کیسے تھے
ثمر بریدہ ہوئی آج شاخ جاں سرور
وہ اب بچھڑ ہی چکا ہے تو خواب کیسے تھے

دیار ظلمت کے سلسلوں میں دل تپاں کی مسافتیں تھیں
نصیب فکر و خیال میں بھی کہاں کہاں کی مسافتیں تھیں
تو پھر کوئی روشنی کے اس قافلے کا آغاز کیسے کرتا
کہ دشت ہستی میں سب کے پیش نظر اماں کی مسافتیں تھیں
وہ کون تھے جن کو اب بھی درپیش تھے سفر راہ عافیت کے
وہ ہم کہ جن کے مقدروں میں لکھی زیاں کی مسافتیں تھیں
نہ جانے اپنے اداس چہروں پہ کیسے گرد ملال آئی
کہ صبح امید کے سفر میں غبار جاں کی مسافتیں تھیں
نگار ہستی میں پھول سجنے لگے تو شدت سے یاد آئیں
تلاش صبح بہار میں جو شب خزاں کی مسافتیں تھیں
کہیں پہ آغاز کا جنوں تھا کہیں تھی آغوش منزلوں کی
مگر انہیں کون دیکھ پایا جو درمیاں کی مسافتیں تھیں

یہ ڈر ہے اس کا ارادہ بدل نہ جائے کہیں
جو موت سر پہ کھڑی ہے وہ ٹل نہ جائے کہیں
مرا جنوں بھی نہ تھک جائے راستے ہیں کٹھن
ترے جمال کا سورج بھی ڈھل نہ جائے کہیں
بہت حسین سہی تیری قربتوں کا سفر
کسی جگہ ترا رستہ بدل نہ جائے کہیں
جو دسترس میں ہے تیری مری گرفت میں ہے
ردائے جاں سے وہ لمحہ نکل نہ جائے کہیں
بکھر رہا ہوں تو یہ سوچتا ہوں جان ثبات
تو میرے پاس رہے ایک پل نہ جائے کہیں

روشنی مانگتے ہیں فکر تپاں مانگتے ہیں
لفظ فنکار سے پیراہن جاں مانگتے ہیں
وقت نے چھین لی احساس کی حدت ورنہ
سانحے اب بھی گزرتے ہیں فغاں مانگتے ہیں
میں تو مر جاؤں گا آواز کے اس مقتل میں
جس میں جینے کے عوض لوگ زباں مانگتے ہیں
ان کو بھی جبر کا آداب شناسا کر لیں
آئینے آپ سے اب عکس نہاں مانگتے ہیں
دکھ اٹھاتے ہیں انہیں جاں کی طلب ہوتی ہے
سائے بڑھتے ہیں تو کرنوں کی سناں مانگتے ہیں
میں تو خود اپنی صداؤں سے بھی ڈر جاتا ہوں

اب مرے زخم ازالہ ء زیاں مانگتے ہیں

کٹ گئے ماہ و سال آنکھوں میں
آج بھی ہیں سوال آنکھوں میں
روح تک زخم نارسائی کا
خواہش اندمال آنکھوں میں
جب بھی دیکھی ہے انتہا دیکھی
کب رہا اعتدال آنکھوں میں
یوں بھی گزرے تضاد کے موسم
دل میں منظر، خیال آنکھوں میں
شب کدے میں ہوں میں مگر تو ہے
روشنی کی مثال آنکھوں میں
اب تو پتھر کا ہو گیا ہوں میں
ہجر ہے نے وصال آنکھوں میں

حوالہ جات

سرور جاوید، "سر مجلس شب" الحمد پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۸ء

زاہد آفاق

ولادت ۱۹۵۸ء

بلوچستان کے نوجوان شعراء میں اپنی خوبصورت شخصیت کی طرح زاہد آفاق اس لیے بھی دوسروں سے منفرد ہے کہ اس نے اپنے ہم عصروں میں سب سے پہلے اپنے مجموعہ کلام "خواب جزیرہ" کی اشاعت کا کارنامہ انجام دیا۔ "خواب جزیرہ" نہ صرف اپنی کتابت و طباعت اور ظاہری حسن کے لحاظ سے بلوچستان میں چھپنے والی تمام کتابوں سے خوبصورت، دیدہ زیب اور بہترین ہے بلکہ اس کے باطن میں بھی ایک جہان خوش رنگ لفظوں کی صورت آباد ہے۔

زاہد آفاق بلوچستان کے نوجوان شاعروں میں ایک سنجیدہ اور تسلسل کے ساتھ شعر کہنے والا شاعر ہے۔ پولیس کی نوکری میں دن رات مصروف رہنے کے باوجود انتہائی خوش گفتار، نرم خو اور مہذب نوجوان کی شاعری اس کے دکھوں اور محرومیوں کی کہانی بھی ہے اور زبان و بیان پر مکمل قدرت رکھنے کی وجہ سے بلوچستان کے شعری افق پر چمکتا ہوا روشن ستارا بھی۔

پنجابی یونیورسٹی انڈیا کی ڈاکٹر زینت اللہ جاوید نے بالکل درست کہا ہے کہ "زاہد آفاق محبت کا شاعر ہے، لیکن محض کوئے یار کا دلدادہ نہیں، اس کے فکر و فن کی قوت محرکہ دور حاضر کی وہ تنگ گلیاں بھی ہیں جن میں انسانیت کا دم گھٹ رہا ہے اور زاہد کی شخصیت کا یہ پہلو قابل داد ہے کہ وہ عام جدید شاعر کی طرح تنہائی کا مرثیہ خواں نہیں اور نہ ہی خود پرستی کا شکار ہے، بلکہ سماجی خیر اور ماضی کی سنہری اقدار کا محافظ و امین ہے، وہ ظاہر کی پرتصنع اور پر فریب زندگی سے مطمئن نہیں ہوتا، باطن کے اندر جھانک کر انسان کے درد کو محسوس کرنا بھی جانتا ہے"۔

ہونٹوں کے تبسم سے تسلی نہیں ہوتی
سینے میں کوئی درد چھپا ہو تو بتاؤ

زاہد آفاق کا پورا نام زاہد حسین ہے اور آفاق سے پہلے زاہد تخلص کیا کرتے تھے۔

آپ نے کوئٹہ کے تعمیر نو پبلک اسکول سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور ۱۹۷۷ء میں پولیس میں اے ایس آئی (ASI) بھرتی ہوئے۔ ۱۹۸۴ء میں انسداد دہشت گردی کے کورس میں پاکستان بھر میں اول آئے' جوڈو کے کھلاڑی ہیں اور پولیس کورس میں جوڈو میں اول درجہ حاصل کر چکے ہیں' اس کے علاوہ اسالٹ گروپ میں بھی امتیازی درجہ حاصل کیا ہے۔

۹۲۔۱۹۹۳ء میں اقوام متحدہ (United Nations) کے مشن میں شامل ہو کر کمبوڈیا گئے اور اقوام متحدہ کا میڈل حاصل کیا۔ ۹۵۔۱۹۹۴ء میں اقوام متحدہ کے مشن کے ساتھ ایک سال تک بوسنیا میں بھی رہے۔ پولیس میں اعلیٰ کارکردگی پر صدر پاکستان نے انہیں صدارتی پولیس میڈل (PPM) سے بھی نوازا ہے۔

زاہد آفاق ستر کی دہائی سے شعر کہہ رہے ہیں اور ۱۹۹۰ء میں ان کا پہلا مجموعہ کلام "خواب جزیرہ" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۹۲ء میں نیشنل کونسل آف کلچر اینڈ آرٹس کراچی کی طرف سے ان کی کتاب کو شیلڈ اور پہلا انعام دیا گیا۔

"خواب جزیرے" کے بارے میں تابش دہلوی فرماتے ہیں کہ "... ایک بات انہیں دوسرے شعراء سے ممیز کرتی ہے اور وہ ہے انسانی کردار اور انسانی نفسیات کی آگہی کا بھرپور اندازہ' غالباً" اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے محکمے سے وابستہ ہیں جہاں انسانی کردار اور انسانی نفسیات کو سمجھنے کے زیادہ مواقع میسر ہیں' یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں انسانی جذبات اور احساسات کا یہ پہلو زیادہ نمایاں ہے اور اسی خوبی نے ان کی شاعری کو تاثیر اور تاثر کا وافر ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ اس طرح زاہد آفاق انسانی مسائل کی ترجمانی میں ایک اہم مقام پر فائز ہیں"

امجد اسلام امجد زاہد آفاق کی شاعری کے متعلق کہتے ہیں کہ "عام نوجوان شاعروں کے برعکس ان کے ہاں شاعری کے فن اور ہنر دونوں پہلوؤں پر یکساں محنت اور توجہ کا احساس ہوتا ہے' وہ شعر کہتے ہی نہیں بلکہ انہیں سنوارتے بھی ہیں"

عطاء الحق قاسمی کے مطابق "وہ ایک بہادر انسان اور شعر کی نزاکتوں کو سمجھنے والا

بہت خوبصورت شاعر ہے"

فن شاعری میں زاہد آفاق کے استاد' استاد رشید انجم زاہد کے فن اور شخصیت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ "زاہد آفاق بچپن ہی سے موزوں طبع شاعر ہے' اس کے اشعار میں تصنع' مبالغہ اور تعلی کا اثر بہت کم نظر آتا ہے۔ غزل میں تعشق اور تغزل کے درمیان سے گزرنا اس کی فطرت ہے۔ زمانے کی ستم ظریفی سے مقابلہ اس کی ہمت مردانہ کا ثبوت ہے جس کی جھلک کہیں کہیں اس کے اشعار میں بھی نظر آتی ہے"

پنجابی یونیورسٹی' پٹیالہ انڈیا کے ڈاکٹر سید ذاکر حسین کےمطابق "زاہد آفاق کے فکر و فن میں انتشار نہیں ملتا یہ ان کے اسلوب بیاں اور تخیل کی کارفرمائی ہے جس کے باعث ان کی شعری کاوشیں ادبی تخلیق کی حیثیت سے اپنی قدر و قیمت رکھتی ہیں"

انڈیا کی ڈاکٹر زینت اللہ جاوید کہتی ہیں کہ "اسلوب کی پختہ کاری' زبان کی سادگی اور بیان کی شستگی اور شگفتگی نے زاہد آفاق کی شاعری کو وہ مہارت بخشی ہے جو اس کی آپ بیتی کو جگ بیتی بنانے میں کامیابی عطا کرتی ہے"

بلوچستان کے نوجوان شعراء میں زاہد آفاق نہ صرف اپنی اعلیٰ شعری تخلیقات کی وجہ سے اہم ہیں بلکہ شاعری سے ان کی کمٹمنٹ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے ہم عمروں میں سب سے پہلے اپنے کلام کی اشاعت کے بعد شعرگوئی پر مزید توجہ دی ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے نوجوانوں میں بھی ادبی ذوق پروان چڑھا۔

زاہد آفاق کی شاعری کے موضوعات اگرچہ ہجر و فراق اور سماجی رویوں کے رد عمل کے بارے میں ہیں لیکن انھوں نے جس تہذیبی شعور کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں اپنے احساسات اور افکار کو اردو شعر میں پیش کیا ہے اس سے بلوچستان میں تخلیقی سطح پر اردو زبان کے نشو و نما کا پتہ چلتا ہے۔

بلوچستان میں اردو شاعری کا مستقبل زاہد اور انہی کے ساتھی ہیں

اس کی تنہائی کا منظر نہیں دیکھا جاتا
کیسے دیکھوں میں پلٹ کر نہیں دیکھا جاتا

یوں تو ہر شخص سے ملتا ہے وہ خم ہو کے مگر
کوئی قد اپنے برابر نہیں دیکھا جاتا

میں کنارہ ہوں سمندر نہیں دیکھا جاتا
دور تک ایک ہی منظر نہیں دیکھا جاتا

وقت آئینہ تو ہر روز دکھاتا ہے مگر
ہم سے کیوں اپنا ہی پیکر نہیں دیکھا جاتا

جب غلامی ہے مقدر تو بغاوت کیسی
سر جھکانا ہو تو پھر در نہیں دیکھا جاتا

ڈر یہ رہتا ہے کہ گر جائے نہ دستار کہیں
سر اٹھا کر کبھی اوپر نہیں دیکھا جاتا

ہم نے دیکھے ہیں کئی جلتے ہوئے گھر آفاق
ان سے جلتا ہوا اک گھر نہیں دیکھا جاتا

عذاب بن کے کئی کروٹیں بدلتا ہے
جو زخم روح کی گہرائیوں میں پلتا ہے

وہ ایک روز توازن بحال کر لے گا
قدم قدم پہ جو گرتا ہے اور سنبھلتا ہے

نیا خیال بناتا ہے دائرے کیا کیا
نظر کا جب بھی کوئی زاویہ بدلتا ہے

سیاہی اوڑھتا ہے جب یہ شہر خوابیدہ
تری تلاش میں گھر سے کوئی نکلتا ہے

چپ ہو دیوار تو در بولے گا
کچھ تو جلتا ہوا گھر بولے گا

میں تو خاموش رہوں گا لیکن
تیری دہلیز پہ سر بولے گا

چھیڑ کر دیکھ کوئی نغمہ جاں
میرے لہجے کا اثر بولے گا

جب کڑی دھوپ سروں پر ہوگی
چڑھتے سورج کا اثر بولے گا

گھر ہی جب ایک کھنڈر بن جائے
کسی آسیب کا ڈر بولے گا

زندگی رقص کرے گی آفاق
جب مرا حسن نظر بولے گا

وہ دور سہی میرا نمائندہ ہے
قسمت کا ستارہ ابھی رخشندہ ہے

شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا
وہ خواب نگر کا کوئی باشندہ ہے

آئینے سے اب آنکھ ملائے کیسے
خود اپنی نظر میں کوئی شرمندہ ہے

ہم نقش کف پا تھے سو مٹ جاتے تھے
وہ نقش بہ دیوار ہے پائندہ ہے

کیا فکر چراغ غم جاناں آفاق

جو تیز ہواؤں میں بھی تابندہ ہے

رفتہ رفتہ ہوئے نظر انداز
ہم پہ جو لوگ تھے اثر انداز
بے نیازی سے دیکھنا اس کا
یہ بھی ہے ایک باخبر انداز
اس کے آنے سے جب چراغ جلے
رات ہونے لگی سحر انداز
اتنے آنسو وہ دے گیا مجھ کو
میری آنکھیں ہوئیں گہر انداز
صورتوں کا تو اعتبار نہیں
آئینے کا ہے معتبر انداز
جل رہا ہوں میں آج کل آفاق
اس کا ہر شغل ہے شرر انداز

حوالہ جات

زاہد آفاق "خواب جزیرہ" گوشہ ادب کوئٹہ، جون ۱۹۹۰ء

سلطان ارشد القادری

پیدائش تین محرم ۱۹۶۰ء

سلطان ارشد القادری بلوچستان کے نئے لکھنے والوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں اور انہوں نے نہایت ہی مختصر عرصے میں بلوچستان میں شعر و ادب کی دنیا میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے۔ایک اچھے شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ادبی رسالے "دستگیر" کی ادارت اور پبلشنگ کا کام بھی کرتے ہیں۔ عین سلام، عطا شاد، خادم مرزا کی کتابوں کی اشاعت کے علاوہ اب تک کئی نوجوانوں کے شعری اور افسانوی مجموعے شائع کر چکے ہیں۔

سلطان ارشد القادری مئی ۱۹۶۰ء کو غلام دستگیر ناشاد کے یہاں جھنگ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم جھنگ میں حاصل کرنے کے بعد میٹرک کا امتحان لاہور سے پاس کیا اور اس کے بعد ایف ایس سی کوئٹہ اور بی اے کی ڈگری جامعہ بلوچستان سے حاصل کی۔ ۱۹۸۳ء میں پہلی اور ۱۹۸۴ء میں دوسری شادی کرنے کے بعد جولائی ۱۹۸۹ء سے "دستگیر" اور ۱۹۹۱ء میں اپنا شعری مجموعہ "رتجگوں میں خواب" شائع کر چکے ہیں۔ آج کل کوئٹہ میں "ناشاد بکس" کے نام سے کتابوں کی دکان چلانے کے ساتھ ساتھ علمی اور ادبی نشستوں کے انعقاد میں پیش پیش ہیں۔

سلطان ارشد القادری کی شاعری ایک سچے عاشق کی وہ جستجو ہے جو مجاز و حقیقت کے درمیاں گوہر اصیل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ان کے حمدیہ اشعار ہوں یا نعتیں، نظمیں ہوں یا غزلیں، خالق حقیقی سے گریہ و زاری ہو یا محبوب مجازی سے راز و نیاز، ایک صاحب دل کی مختلف کیفیتیں پیش کرتی ہیں۔ ان کے اشعار اور شخصیت میں دوئی نہیں بلکہ یکتائی کا احساس ہوتا ہے اور ایک ایسے پر محبت شخص کی تصویر دل میں بنتی ہے جس سے محبت کیے بغیر چارہ نہیں رہتا اور یہی وجہ ہے کہ کوئٹہ کے لوگ جو اپنے پہاڑوں کی طرح جلد اجنبیوں پر نہیں کھلتے سلطان ارشد کے ساتھ تو من شدی من تو شدم کے مصداق یک

جان ہو گئے ہیں۔ سلطان ارشد نے کتابوں کی دکان کیا کھولی ہے شہر کے ادیبوں اور شاعروں کا "قلخانہ" بنا دیا ہے۔ آپ نے کسی ادیب یا شاعر کا پتہ کرنا ہو تو ان کے پاس چلے جائیے' وہ صاحب یا تو آپ کو وہیں مل جائیں گے یا ان کا ٹیلی فون نمبر اور پتہ۔

بلوچستان کے ادیبوں اور شاعروں کی تعداد کم سہی لیکن یہ وہ جنس ہے جو اپنی جنس کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے کتراتی ہے ان سب کبوتروں کو ایک کابک میں جمع کرکے خوش رکھنے کا ہنر سلطان ارشد القادری کا ہنر ہے۔

میانوالی کے ظفر خان نیازی کی طرح سلطان ارشد القادری کو جس چیز نے اہل کوئٹہ کا محبوب بنا رکھا ہے وہ ان کی بے غرضی' خلوص اور شفاف محبت ہے۔ وہ آپ کو تکلف میں کلی کرانی پہنچانے کے لیے بے چین رہیں گے جبکہ انہیں کوئٹہ کینٹ میں کسی سے ملنے کے لیے جانا ہو۔

شاعری میں ان کے استاد اور بزرگ صاحبزادہ رفعت سلطان ہیں۔ ان کے اشعار دیکھئے

جس شخص نے دھرتی سے لپٹ کر نہیں دیکھا
عظمت نے کبھی اس کو پلٹ کر نہیں دیکھا
جو عکس' پس عکس تھا' روپوش رہا ہے
آئینہ کسی نے بھی الٹ کر نہیں دیکھا
پوشیدہ حدوں میں بھی ہیں قدرت کے کرشمے
قطرے میں سمندر نے سمٹ کر نہیں دیکھا
ہم نے بھی تصوف سے جدا ہو کے نہ سوچا
اس نے بھی زر و سیم سے ہٹ کر نہیں دیکھا
ہے خاک رہ عشق میں کیا سطوت و رفعت
تم نے کبھی اس گرد میں اٹ کر نہیں دیکھا
گو پیار کیا' جوگ لیا' پھر بھی جہاں میں

ذروں کی طرح دشت میں بٹ کر نہیں دیکھا
غیروں سے تو ہے جنگ تری حرص و انا کی
خود اپنے مقابل کبھی ڈٹ کر نہیں دیکھا
پانی میں فنا ہو گئی خودداری کے باعث
پر موج نے ساحل کو پلٹ کر نہیں دیکھا
دیکھا ہے جدائی کا خزاں رنگ' ہمیشہ
یادوں کے شجر سے کبھی کٹ کر نہیں دیکھا
ارشد نے بھی روکا' نہ محبت سے صدا دی
جاتے ہوئے اس نے بھی پلٹ کر نہیں دیکھا

مہ و نجوم سے' خوشبو سے' گل رخوں سے جدا
میں ہو رہا ہوں ترے شہر منظروں سے جدا
سمو کے آنکھ کی پتلی میں سب حسین منظر
پھروں گا دشت جدائی میں بستیوں سے جدا
میں ریزہ ریزہ کروں خواب آرزو' پھر بھی
نہ ہو سکوں گا کبھی اپنے رتجگوں سے جدا
تمہارے گھر' میں کبھی لوٹ کر نہ آؤں گا
نہ چاہتے بھی رہوں گا مدارتوں سے جدا
فراق رت کے تسلط کا جبر سہ لوں گا
نہ ہو سکوں گا مگر یاد موسموں سے جدا
تمام قہقہے بچوں کی نذر کر دوں گا
نہ کر سکوں گا مگر خود کو آنسوؤں سے جدا

نہ شاہِ وقت، نہ درباں، نہ تخت کا خواہاں
سو ہو رہا ہوں محلاتی سازشوں سے جدا
انا پرست ہوں، سمجھوتہ اب تو ناممکن
رہوں گا کیسے مگر ایسی سولیوں سے جدا
زمین اوڑھ کے کیوں سو رہوں نہ میں ارشد
کہ کر رہے ہیں مجھے یار، دوستوں سے جدا

سب رنگ وہی، ڈھنگ وہی، ناز وہی تھے
اس بار تو موسم کے سب انداز وہی تھے
بس عجز کی خوشبو کی جگہ کبر کی بو تھی
لہجے میں ذرا فرق تھا، الفاظ وہی تھے
کیا جانیئے، کیوں اب کے مرے دل میں نہ اترے
سُر، لے وہی، آواز وہی، ساز وہی تھے
جو ننگ خلائق تھے، جو دشمن تھے وطن کے
سینوں پہ سجائے ہوئے اعزاز وہی تھے
جبریل سے آگے گئے جو نور سراپا
شہباز وہی، حاصل پرواز وہی تھے

مخالفوں کے جلو میں وہ آج شامل تھا
وفا پرست رتوں کا جو شخص حاصل تھا
جسے کبھی مری چارہ گری میں شہرت تھی
اسی کے تیر سے سارا وجود گھائل تھا

وہ میری ذات کی پہچان بھی، تعارف بھی
مرے لہو میں برنگ حیات شامل تھا
حسین رات تھی، ہاتھوں میں ہاتھ تھے، ہم تھے
کنار آب خموشی تھی، ماہ کامل تھا
کچھ اس طرح اسے بھڑکا دیا تھا لوگوں نے
مرے خلاف گواہی پہ بھی وہ مائل تھا
کسی بھی در سے طلب کی نہ احتیاج کبھی
کہ میں تو اپنے ہی مرشد کے در کا سائل تھا
مجھے بھی فقر کی دولت پہ فخر تھا یارو
اسے بھی لعل و گہر کا غرور حاصل تھا
بہت ہی سادہ طبیعت تھا ان دنوں ارشد
کہ جب وہ مہر و خلوص و وفا کا قائل تھا

یا وصال کا موسم برقرار رہنے دے
یا تو میری آنکھوں کو اشکبار رہنے دے
لال لال پھولوں کو تو سجا طرب گھر میں
زرد زرد چہروں کو سوگوار رہنے دے
آس بیل آنگن میں در پہ میری نم آنکھیں
نیم وا دریچے میں انتظار رہنے دے
لطف ہے صعوبت میں، جستجو میں، حسرت میں
میرے راستے کے سب کوہسار رہنے دے
پی رہا ہے تو بھائی! خون اپنے بھائی کا

کچھ تو آدمیت کا اعتبار رہنے دے
رائیگاں ہی جائے گا سب رفوگری کا فن
دامن دل ارشد تار تار رہنے دے

یقیں نہ تھا کہ یہ منظر گزر بھی سکتا تھا
کہ بھائی، بھائی کے ہاتھوں سے مر بھی سکتا تھا
خیال خاطر احباب ہی رہا ملحوظ
وگر نہ پار سلامت اتر بھی سکتا تھا
خزاں رتوں میں بکھرنا پسند تھا، ورنہ
بسر بہار میں یہ زیست کر بھی سکتا تھا
وہ جس نے مجھ کو سنوارا ہے گیسوؤں کی طرح
وہ چاہتا تو الجھ بھی، بکھر بھی سکتا تھا
محبتوں میں جو پھلتا رہا وفا کا شجر
وہ بے رخی کی ہوا سے اجڑ بھی سکتا تھا
میں اس کی ذات کا حصہ تھا، اجنبی کب تھا؟
وہ ساری بات، مرے ساتھ کر بھی سکتا تھا
وہ خود برتتا رہا، اجتناب چارہ گری
مسیح تھا وہ مرے زخم بھر بھی سکتا تھا

حوالہ جات

سلطان ارشد القادری، رتجگوں میں خواب، ناشاد پبلشرز، لاہور ۱۹۹۱ء

افضل مراد

ولادت ۲، جنوری ۱۹۶۱ء

بلوچستان میں اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر نائب ملا محمد حسن براہوئی سے افضل مراد تک بلوچستان میں اردو شاعری کی عمر تقریباً" دو سو سال بنتی ہے۔ ان دو صدیوں میں اردو زبان و ادب کو پروان چڑھانے میں قلات اور کوئٹہ کے جن براہوئی بولنے والوں نے قابل ذکر کردار ادا کیا ان میں افضل مراد کا نام شامل ہے۔

بلوچستان کی تاریخ اور ثقافت پر نگاہ رکھنے والے یہاں کی قبائلی طرز معاشرت اور کاروانوں کے سفر کو عصر جدید کے پیچیدہ طرز حیات میں ڈھلتے دیکھ رہے ہیں، یہاں کے دیہاتوں کو قصبوں اور قصبوں کو شہروں میں، قبائلی اور سرداری نظام کو جدید منتخب جمہوری اداروں کی شکل اختیار کرتے دیکھ رہے ہیں، اس سفر میں زبان و بیان نے کیا کیا رنگ بدلے، طرز معاشرت نے طرز فکر کو، اور طرز فکر نے جذبہ و احساس پر کیا کیا اثرات ڈالے، اس کا تجزیہ ہمیں یہیں کے باسیوں کے حوالے سے کرنا ہو گا۔

افضل مراد اس تہذیبی اور تمدنی سفر کا راہی ہے جو بلوچستان میں نہایت سست روی سے جاری ہے لیکن اس کی جڑیں پہاڑوں کی طرح گہری اور پھیلی ہوئی ہیں، اس میں تغیر کی رفتار صنوبر کے درخت کی طرح آہستہ اور پروقار ہے کوئی بے ہنگم اور فوری تبدیلی نہیں، اور یہی خصوصیات افضل مراد کی شاعری میں آپ کو نظر آتی ہیں۔

افضل مراد کوئٹہ کے نواحی محلے "ہدہ" میں ۲، جنوری ۱۹۶۱ء کو عبدالعزیز محمد شہی کے یہاں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پرائمری سکول ہدہ سے حاصل کرنے بعد ۱۹۷۸ء میں میٹرک کا امتحان جامع ہائی سکول ہدہ سے پاس کیا جس کے بعد ۱۹۷۹ء سے ٹیچر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

افضل مراد اردو کے علاوہ براہوئی زبان کے شاعر، افسانہ نگار، اور ڈرامہ نگار بھی

ہیں۔ براہوئی میں ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں گندار (براہوئی شعری مجموعہ، ذنار نا ذکھ، بلمہ رنگ، بادام نا پھل (براہوئی ہائیکو کا مجموعہ) کاوِیل (براہوئی شعری مجموعہ، درو شم (خاکے) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اردو کلام اخبارات و رسائل میں چھپتا رہتا ہے۔

یہ افضل مراد کی انتھک محنت، ریاضت اور اردو سے محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ آج وہ اپنے ہم سنوں میں ایک خوش کلام شاعر کی حیثیت سے نہ صرف معروف ہیں بلکہ مقبول بھی ہیں۔

کسی منظر میں کھونا چاہتی ہیں
یہ آنکھیں خاک ہونا چاہتی ہیں
کسی کے نام پورے دن کا سورج
کہیں منظر سلونا چاہتی ہیں
تمہارا لمس میرے لفظ لے کر
نیا احساس بونا چاہتی ہیں
کسی تکمیل سے تشنہ صدائیں
کسی کا جسم ہونا چاہتی ہیں
تمہارے بعد ساری آرزوئیں
کسی کا غم پچھونا چاہتی ہیں
یہ کس تعبیر کی منزل ہے جس پہ
یہ آنکھیں اب بھی رونا چاہتی ہیں

دن میں جس رات کی کہانی ہے
وہ مری ذات کی کہانی ہے
ایک سنگ رواں ہوں چشمے کا

جس میں اثبات کی کہانی ہے
عرصہ دہر تیرا سرمایہ
رنج و آفات کی کہانی ہے
ان وصال آشنا نگاہوں میں
رات کی بات کی کہانی ہے
ایک ویراں فریم کے اندر
دل کی ہر بات کی کہانی ہے
یہ مری خواہشوں کی دنیا ہے
وہ مری مات کی کہانی ہے
تیری پلکوں پہ ہجر کا ساون
ایک برسات کی کہانی ہے
جب مراد دل کے پاس آجاؤ
چند صدمات کی کہانی ہے

زندگی سے بڑی آرزو کے لئے
یہ سفر ہے تیری جستجو کے لئے
میری نادیدہ منزل کی تصویر میں
کوئی رستہ نہیں ہے عدو کے لئے
وہ کہاں جا سکے گا حدوں سے ورا
جو نہیں سوچتا روبرو کے لئے
کون سمجھے گا تیرے جنوں رنگ کو
ڈھونڈتے ہو کسے گفتگو کے لئے

ایک بے منزلی ساتھ چلتی رہی
حلقہ دام جام و سبو کے لئے
میرا حرف ہنر میرا سارا سفر
دشت بے آب تیری نمو کے لئے
اب مراد اپنے سانسوں کی رفتار میں
ایک آواز ہے میری ھو کے لئے

کسی کے دیدہ بے خواب میں رہتا نہیں اب
دل ایسے موجہ گرداب میں رہتا نہیں اب
سمجھتا ہوں برتنے کا سلیقہ زندگی کو
فسون شعلہ بیتاب میں رہتا نہیں اب
کسی جذبے کی شدت ٹوٹتی رہتی ہے پیہم
یہ دل کہ حلقہ آداب میں رہتا نہیں اب
تو پھر کس کے لئے رنگ شفق کی گفتگو ہو
کوئی بھی کوچہ خوناب میں رہتا نہیں اب
مراد ان کو عزیز جان تو رکھتا ہوں لیکن
میں اپنے حلقہ احباب میں رہتا نہیں اب

خواب کے مان سے نکل کر دیکھ
جان پہچان سے نکل کر دیکھ
تو کبھی آ افق کی اس جانب
حد امکان سے نکل کر دیکھ

صرف خواہش میں خواب مرتے ہیں
خواب کے مان سے نکل کر دیکھ
سب الگ جانتے ہیں تجھ کو مگر
ان کی پہچان سے نکل کر دیکھ
اس سے آگے بھی ہیں جہان کئی
دل کے دیوان سے نکل کر دیکھ
اس کو حیران کرکے دیکھ مراد
اس کے احسان سے نکل کر دیکھ

دشت جنوں سے پیاس کا رشتہ بنائیے
صحرا میں عکس حسرت دریا بنائیے
کچھ تو سفر کے واسطے زاد سفر رہے
رستوں کی دھند میں کوئی سپنا بنائیے
شاید کہیں پہ بھٹکا ہوا قافلہ رکے
خیمے میں انتظار کا سایہ بنائیے
یادوں کے موسموں میں کسی جسم کی طرح
"کیا کیا اسے تراشیے کیا کیا بنائیے"
اب دشت کے سفر میں کسی روشنی کے ساتھ
خوابوں کے آس پاس ٹھکانہ بنائیے
سیلاب آتے جاتے ہیں اپنے لئے مراد
گھر ایک اور برلب دریا بنائیے
اس جسم اس ادا کے کئی رنگ ہیں مراد

پھولوں کی باس، لمس کا سایہ بنائیے

مکمل خود سے میرا رابطہ ہونے نہیں دیتا
مگر ایسا بھی ہے مجھ کو مرا ہونے نہیں دیتا
نجانے کب سے کیسی کشمکش میں مبتلا ہے وہ
میرے حق میں کوئی بھی فیصلہ ہونے نہیں دیتا
وہ اپنے ہمنواؤں میں مجھے شامل تو رکھتا ہے
میری آواز کو لیکن دعا ہونے نہیں دیتا
یہ پتھر کا نگر ہے اور میں آئینہ صورت ہوں
میرا احساس مجھ کو دوسرا ہونے نہیں دیتا
تجھے ان چاہنے والوں سے گر فرصت ملے پل بھر
اسے بھی سوچ جو تیرا برا ہونے نہیں دیتا
مراد اس کے لئے شاید ہماری ہی وفا کم تھی
کوئی تو ہے اسے جو بے وفا ہونے نہیں دیتا

صدف چنگیزی

ولادت ۲۴، جون ۱۹۶۱ء

بلوچستان کے نوجوان شاعروں میں صدف چنگیزی اپنے پختہ تہذیبی شعور اور شعری روایت سے آگاہی کی وجہ سے ایک قابل ذکر شاعر ہیں۔ صدف اپنی مادری زبان فارسی کی طرح اردو میں بھی بیک وقت غزل، نظم، منقبت، سلام، دوبیتی اور قطعہ کے ساتھ ساتھ نثر بھی خوب لکھتے ہیں۔ فارسی سے بابا طاہر عریان اور امام خمینی کے منظوم کلام کا کچھ حصہ اردو میں نظم کر چکے ہیں۔ بلوچستان کے نوجوان شعرا میں زبان و بیان اور فنی حوالے سے مکمل استعداد رکھنے والے شاعر ہیں۔

صدف چنگیزی کا پورا نام غلام عباس ہے جبکہ صدف چنگیزی تخلص کرتے ہیں۔ صدف ۲۴، جون ۱۹۶۱ء کو کوئٹہ میں محمد ابراہیم کاغذی کے یہاں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے گھر کے قریب گورنمنٹ یزدان خان ہائی اسکول سے حاصل کی، ۱۹۷۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۹۸۵ء میں جامعہ بلوچستان سے بی اے اور ۱۹۸۷ء میں شعبہ اردو جامعہ بلوچستان سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ جون ۱۹۹۰ء سے فیڈرل گورنمنٹ کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

صدف کے فن کے بارے میں ۱۹۸۶ء میں "پندرہ روزہ وادی" میں ریاض قمر نے لکھا تھا کہ " صدف چنگیزی بلوچستان کے نوجوان شعراء میں اپنی فکر اور اپنے انداز بیان کی وجہ سے اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ صدف نے بہت تیزی سے اپنا تعارف کرایا ہے بطور ایسے شاعر کے جو اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سراغ پا گیا ہو.... صدف زندگی کا شعور رکھنے والا شاعر ہے جس کے یہاں درد و سوز کی آنچ اور آرزو مندی کی تڑپ مل کر زندگی اور کائنات کو سمجھنے کا ایک زاویہ فراہم کرتے ہیں۔ صدف کی مادری زبان فارسی ہے۔ فارسی کی چمک نے اس کی اردو شاعری کو ایک رواں دواں طرز بیاں سے آشنا کیا ہے۔

صدف مختصر بحر میں بہت اچھی غزلیں کہتا ہے اور بلوچستان کے نوجوان شعراء میں فن عروض کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔"

فکر تخلیق کے سراغ میں ہے
ایک ہلچل دل و دماغ میں ہے
شب گزر جائے گی کسی بھی طرح
روشنی کچھ مرے چراغ میں ہے
ایک مدت سے سوچ میں گم ہوں
جانے کیا کیا خلل دماغ میں ہے
فہم و ادراک کی بلندی پر
فکر آوارہ کس سراغ میں ہے
کچھ تو ہے یاد رفتگاں کا اثر
کچھ حرارت سی دل کے داغ میں ہے
اس بھروسے پہ غم کی دھوپ میں ہوں
ایک سایہ مرے سراغ میں ہے
بستر گل پہ سو رہا ہے صدف
ان دنوں آتش فراغ میں ہے

ہے تصور میں اک حسیں وادی
جس میں ہے واہموں کی شہزادی
کس کی آہٹ نے ہم کو چونکایا
کس کی یادوں نے ہم کو ایذا دی
دور پیڑوں سے تک رہی ہے مجھے

خوشبوؤں کی حسین شہزادی
تھیں یہاں کتنی بستیاں آباد
اب تو ویرانہ ہے نہ آبادی
سانحہ میرے عہد کا دیکھو
چڑھتے سورج نے آگ برسا دی
یوں قفس کے قریب سے گزری
یوں بہاروں نے ہم کو ایذا دی
اک تبسم پہ اس قدر بے چیں
اک اشارے پہ اتنی بربادی
موسم گل میں بن کھلی کلیاں
یہ اسیری ہے یا کہ آزادی
آج اک جنبش نظر میں صدف
داستاں غم کی ہم نے دہرا دی

راہزن راہبر سے لگتے ہیں
راستے پر خطر سے لگتے ہیں
سوچ کی اک حسین وادی میں
واہمے معتبر سے لگتے ہیں
دیکھتے کچھ ہیں بولتے کچھ ہیں
لوگ آشفتہ سر سے لگتے ہیں
سنگ لگتے تو ہیں مرے سر پر
کون جانے کدھر سے لگتے ہیں

یہ جو شبنم زدہ گل تر ہیں
یہ مری چشم تر سے لگتے ہیں
آؤ اس شہر سے نکل ہی چلیں
سب یہاں بے خبر سے لگتے ہیں
خاک اڑاتے ہوئے یہ میخانہ
میرے دیوار و در سے لگتے ہیں
اس قدر صاعقہ خرام نہ ہوں
پاؤں کے سنگ سر سے لگتے ہیں
کتنی صدیوں کے فاصلے ہیں صدف
پھر بھی یہ مختصر سے لگتے ہیں

خواب چہروں سے گفتگو کرنا
کچھ دھندلکوں سے گفتگو کرنا
دھیرے دھیرے وہ جب بھی یاد آئے
گزرے لمحوں سے گفتگو کرنا
مشغلہ گلشن تصور کا
پھول کانٹوں سے گفتگو کرنا
جاتی رت نے ہمیں سکھایا ہے
زرد پتوں سے گفتگو کرنا
ایک وحشت ہے اک حقیقت ہے
بند کمروں سے گفتگو کرنا
باب ہستی کے یہ حسیں اوراق

ان حوالوں سے گفتگو کرنا
میں صدف، تم چراغ بن جاؤ
پھر ہواؤں سے گفتگو کرنا

شام ہجراں میں اس کی یاد آئی
پھر مجھے ڈس رہی ہے تنہائی
جب بھی یاد آئی قید تنہائی
رک گئی نبض آنکھ بھر آئی
مڑ کے دیکھا تو بن گئے پتھر
جانے کس سمت سے صدا آئی
جب چمن جل رہا تھا شدت سے
آشیاں پر نگاہ دوڑائی
عمر بھر ایک فاصلہ سا رہا
بن گیا میں صدائے صحرائی
بے زبانی کی رسم کس سے چلی
کب ہوئی ضبط کس کی گویائی
مجھ میں اور اس میں فرق اتنا ہے
وہ تمنا میں اک تمنائی
وہ سراپا سمندروں کا سکوت
میں رمیدہ نفس کی گہرائی
ایک سورج کو میں نے دیکھا تھا
چھن گئی مجھ سے میری بینائی

وہ کوئی اجنبی نہیں ہے صدف
ایک مدت سے ہے شناسائی

ویدنی ہے خزاں رسیدہ فضا
خشک پتے اڑا رہی ہے ہوا
کس کڑی دھوپ کے سفر میں ہوں
مجھ سے سایہ بھی ہو گیا ہے جدا
دل کی دنیا میں اب رہا کیا ہے
چند خوابیدہ حسرتوں کے سوا
دم نہ گھٹ جائے ایسی بستی میں
سر پہ چھائی ہے نفرتوں کی گھٹا
بزم یاراں سے سب ہوئے رخصت
رہ گئی شمع انجمن تنہا
آخر شب یہ انتظار صدف
کون آئے گا اب جلانے دیا

حوالہ جات

"پندرہ روزہ وادی" کوئٹہ جلد نمبر۲، شمارہ ۱۴-۱۵ فروری ۱۹۸۶ء

پروین لونی

پیدائش ساٹھ کی دہائی

رابعہ خضداری کی فارسی شاعری سے پروین لونی کی اردو شاعری تک بلوچستان میں شعر و ادب کے حوالے سے چند ہی خواتین کا نام آتا ہے، جس طرح رابعہ فارسی شاعرات میں نقش اول کی حیثیت رکھتی ہیں اسی طرح بلوچستان میں اردو شاعری کے حوالے سے مقامی خواتین میں پروین لونی کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے۔

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے فروغ میں یہاں کی خواتین کا حصہ انتہائی اہم رہا ہے۔ بیگم خورشید مرزا، یاسمین صوفی، حمیدہ جبین، رفعت زیبا، شاہین روحی بخاری، شبنم شکیل، نادرہ ضمیر، طاہرہ باقری حنفی، طاہرہ بلوچ، نجمہ اسلم، روبینہ بٹ، سائرہ خان اور زیب عثمانی جیسی فعال اور تخلیقی استعداد رکھنے والی خواتین نے ناول، افسانے اور شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں لیکن ان میں بیشتر خواتین کی مادری زبان اردو اور پنجابی ہے، بلوچستان کی مقامی خواتین نے اردو ادب میں کم ہی دلچسپی کا اظہار کیا ہے، پروین لونی اپنی فطری صلاحیتوں اور خداداد شعری ذوق کی وجہ سے بلوچستان کی ایک ایسی منفرد اور ممتاز شاعرہ ہے جس کی مادری زبان اردو نہ ہونے کے باوجود، اردو میں انتہائی بھرپور طریقے سے اظہار کی قدرت رکھتی ہے۔ اس کی شاعری ایسی بیساختہ، رواں اور جذبات سے بھرپور ہے جس پر بلوچستان کو ناز ہے۔

پروین لونی ساٹھ کی دہائی میں سبی کے نواح میں "لونی" نامی قصبے میں پیدا ہوئی، ان کے والد عزیز لونی بلوچستان کے نامور ادیب اور مورخ ہیں۔ لونی صاحب جہاں اپنی علم دوستی، روشن نظری اور خوش فکری کیوجہ سے پورے بلوچستان میں احترام سے دیکھے جاتے ہیں وہاں انہوں نے اپنی بیٹیوں کو خاص طور سے زیور علم سے آراستہ کرنے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو سنوارنے اور نکھارنے میں بھرپور حصہ لیا۔ یہ عزیز لونی کی شفقت پدرانہ

کا اثر تھا کہ پروین لونی نے کالج کے زمانے سے ہی شعر گوئی کا آغاز کیا اور یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے اس کی شاعری بلوچستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔ ۱۹۸۵ء میں جامعہ بلوچستان سے معاشیات میں ایم اے کرنے کے بعد پروین لونی رشتہ ازدواج میں منسلک ہو کر کراچی چلی گئی جہاں آجکل ایک کالج میں لیکچرر کے طور پر خدمات انجام دے رہی ہے۔

پروین کی شاعری میں نسوانی جذبات اور احساسات کا اظہار سیدھے سادے لفظوں میں جس خوش سلیقگی اور شائستگی سے ملتا ہے وہ نہ صرف بلوچستان بلکہ اردو شاعری کا قابل قدر حصہ ہے۔ وہ چھوٹی اور بڑی بحروں میں یکساں سہولت کے ساتھ نہایت اچھے شعر کہتی ہے اور بقول ریاض قمر "جب ہم پروین لونی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں زندگی کے دھنک رنگ جذبوں کیفیتوں کی کہکشاں چمکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بلوچستان کے نوجوان شعراء و شاعرات میں پروین لونی اپنی روشن فکری' بے ساختگی' اظہار کی سادگی' الفاظ کا ترنم اور اپنے کلام کی اثر آفرینی میں سب سے جدا سب سے الگ کشیدہ قامت لگتی ہے۔ غزل ہو یا نظم یہ دونوں میں صداقت' سچائی اور خلوص کی روشنی کے سہارے شاعری کے نئے راستے پر رواں دواں نظر آتی ہے۔ اس کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعری پروین لونی کا مشغلہ نہیں بلکہ مسئلہ ہے' شوق نہیں لگن ہے' خاموشی نہیں اظہار ہے۔ اس کی تخلیقی رفتار بڑی تیز اور خوش آئند ہے۔ اگرچہ اس کی شاعری ابھی ذات کی شاعری ہے مگر خوبصورت اظہار کی شاعری ہے۔ اس نے اپنے داخلی جذبوں کے اظہار کے لیے جو وسیلے اور راستے تلاش کیے ہیں وہ بھی بہت خوبصورت ہیں' یہ وسیلے' چاند' رات' پھول' ستارے' شبنم' بادل' ہوا' موسم' برف' کہکشاں' آرزو' طلب' محبت' غم' تنہائی' آس' امید' صبح کا اجالا' دل کا درد' جدائی کی کسک یہ وہ لفظ اور استعارے ہیں جو پروین لونی کو ایک منفرد سوچ کی شاعرہ کا مقام عطا کرتے ہیں۔"

تمہاری باتیں سنا رہی ہیں دیارِ دل کی ہوائیں اب تک
فضائے غم میں گلاب بن کر مہک رہی ہیں وفائیں اب تک
شفق کے رنگوں میں ڈھل گئے ہیں سلگتی آنکھوں کے خواب سارے

چھپائے زخم دل شکستہ ہیں چاندنی کی ردائیں اب تک
وہ ایک منظر جدائیوں کا' نظر میں آ کر ٹھہر گیا ہے
سماعتوں میں بسی ہوئی ہیں' گئے دنوں کی صدائیں اب تک
جو اپنے دامن میں لے کے آئیں جدائیوں کے اداس موسم
ہتھیلیوں پر لکھی ہوئی ہیں وصال کی وہ دعائیں اب تک
بچھڑتے لمحے کی چشم پرنم میں لوٹ آنے کی لو جلی تھی
بھٹک رہی ہیں ہر ایک رہ میں اسے بلاتی صدائیں اب تک
تم اپنی آنکھوں سے چاہتوں کی ہر ایک تحریر کو مٹا دو
کہ ایک جرم وفا کی یہ دل بھگت رہا ہے سزائیں اب تک
وہ جانب دل بڑھا تو حائل انا کی دیوار ہو گئی تھی
چلا گیا ہے تو اس کی یادیں' شبوں میں آ کر رلائیں اب تک
بھٹک رہے ہیں ہم اپنے ہونٹوں پہ تشنگی کے سراب لے کر
ترے نگر کے سمندروں پر برس رہی ہیں گھٹائیں اب تک

رات لہروں میں اک لہر روتی رہی' بیکراں بحر میں ساحلوں سے پرے
اور میں پا شکستہ بھٹکتی رہی' راستوں میں کہیں منزلوں سے پرے
کوئی بچھڑا کہیں' کارواں بے خبر' اپنی دھن میں مگن' یونہی محو سفر
آبلے پاؤں کے' مرہم اشک سے' کوئی دھوتا رہا' قافلوں سے پرے
بعد مدت بھی ملتا ہے کچھ اس طرح' قید لب سے نہ آزاد ہو حرف اک
پھر بھی شکوے گلے' غم کی پرچھائیاں' جا کے سو جاتے ہیں فاصلوں سے پرے
وہ تلاش سحر میں بھٹکتا رہا' کتنی پرخار راہوں پہ چلتا رہا
میرے چھالوں میں ٹیسیں اٹھیں درد کی' اس کے پاؤں کے سب آبلوں سے پرے

خوشبوئے یار ئیں بھی اسی کی ادا، آج ملتی رہی کل بچھڑتی رہی
اپنی ہر آرزو میں بھی خود داریاں، جا کے بستی رہی ہیں دلوں سے پرے
ہم تو سنتے رہے چاہتوں میں کبھی وصل کے بعد آتی جدائی بھی ہے
وصل آیا نہیں اور جدائی رہی، چاہتوں کے سبھی مرحلوں سے پرے
ایک مجنوں نہ تھا، جسکو کوئی جنوں، خاک بر سر نہیں چاک داماں نہیں
ایک لیلی تھی جو بند کمرے میں روتی رہی رات بھر مملوں سے پرے

کتنی شدت غم یاد جاناں میں تھی، ہم بہت دیر تک رات روتے رہے
سلسلہ درد کا پھیلتا ہی گیا، ڈوبتے چاند کے ساتھ روتے رہے
بے سبب دل پہ غم کی گھٹا چھا گئی، بے وجہ بات بے بات روتے رہے
ابر آنگن میں کھل کر برستا رہا، لے کے آنکھوں میں برسات روتے رہے
اسکا ملنا بچھڑنا مقدر میں تھا، کیا وفا، کون سی بے وفائی کا دکھ
جیت کے سائے لمحوں سے دامن بھرے، کھا کے تقدیر سے مات روتے رہے
شہر بھر میں اسی سے شناسائی تھی، وہ جو ملتا رہا اجنبی کی طرح
اور بچھڑا فقط نقش پا چھوڑ کر، چوم کر اس کی سوغات روتے رہے
یوں اچانک ملا وہ سر رہگذر، وقت تھم سا گیا، چاند گہنا گیا
کیا سناتے شب ہجر کی داستاں، دو گھڑی تھی ملاقات روتے رہے
اسکی آنکھیں، مرا دل، گلابوں کے لب، خوف وقت جدائی سے خاموش تھے
چند باتیں زبانوں پہ اٹکی ہیں، دل میں سلگتے سے جذبات روتے رہے
جن کے لب حرف چاہت سے نا آشنا، جن کی آنکھوں میں کوئی کہانی نہ تھی
وقت رخصت مگر جانے کیوں دیر تک، لے کے ہاتھوں میں وہ ہاتھ روتے رہے
پھر ہوا آئی ہے، تیری خوشبو لیے، ضبط پھر ریزہ ریزہ بکھرنے لگا

پھر گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر، مل کے تنہائی کے ساتھ روتے رہے

لیے آنکھوں میں چاہت کا حسیں عالم چلے آئے
چراغ زندگی کی لو سہی مدھم چلے آئے
دریدہ دل، شکستہ پا، بہ چشم نم چلے آئے
جہاں تک تیری خوشبو تھی وہاں تک ہم چلے آئے
بہت تاریک تھیں راہیں سبھی شہر تمنا کی
ہتھیلی پر لیے جلتے ہوئے کچھ غم چلے آئے
ہمیں کو آرزو تھی دیکھنے کی محفل جاناں
ہمیں لے کر طبیعت اس قدر برہم چلے آئے
ابھی شدت کہاں غم میں، کہاں کرب جدائی ہے
ابھی سے آپ لے کر پیار کا مرہم چلے آئے
جسے لمحہ بہ لمحہ ڈھونڈھنے روشنی کھو دی
اسے دیکھا تو آنکھوں میں لیے شبنم چلے آئے
تری خواہش میں شب بھر دامن تقدیر وا رکھا
سحر آئی تو کتنے خوبصورت غم چلے آئے
نہ تھی تاب غم ہجراں، نہ ضبط درد کی عادت
ہمیں ان سے تھی امید وفا بھی کم چلے آئے
ابھی آنگن میں آیا بھی نہ تھا برسات کا بادل
کہ پھر یادوں کے ویراں زرد رو موسم چلے آئے

جسے خزاؤں کے زرد موسم میں بھی ہرایا بہار کہنا

اسی کو ملنا تو بے وفائی کا لفظ بے اختیار کہنا

وہ جسکی خاطر ہر ایک رہ سے چنے ہیں لفظوں کے سیپ اس نے
اسی کی خاموشیوں کو اپنی محبتوں کا وقار کہنا

سیاہ راتوں کی خامشی میں تمہارے غم کے چراغ لے کر
جنون رسوا کی داستاں کو بہ طرز صد اختصار کہنا

کبھی تو رکھنا دل شکستہ کو اس کی یادوں کے دم سے قائم
کبھی اسی دل کو اس کی یادوں کا ایک کہنہ مزار کہنا

دکھوں کا پانی بصورت اشک جس کی آنکھوں کو دے گیا ہے
اسی کی آنکھوں میں بس رہا ہے سدا ترا انتظار کہنا

ٹھرتی راتوں کی چاندنی میں سلگتی آواز بانسری کی
سنو تو دم توڑتی ہے اس میں بھی میرے دل کی پکار کہنا

کہیں ملے وہ ستم کی راہوں کا بے خبر اجنبی مسافر
مرے غموں پر بھی چھا گیا ہے سمے کا اڑتا غبار کہنا

یاد کا تارہ

کبھی جیون کی راہوں، اندھیرا حد سے بڑھ جائے
اور اس لمحے، کوئی تارہ
چمکتی کہکشاں سے ٹوٹ کر آئے، تمہارے راستوں میں
روشنی چاہت کی پھیلائے
تو بس اتنا سمجھ لینا
یہی وہ ایک تارہ ہے
جو میلوں دور تم سے، ایک لمحے کے لیے اس دم
تمہاری یاد کی آنکھوں میں چمکا ہے!!!

حسن جاوید

ولادت   یکم اپریل، ۱۹۶۲ء

کوئٹہ کے نوجوان شاعروں میں حسن جاوید اپنی فنی استعداد اور خوش فکری کیوجہ سے ممتاز و منفرد ہیں۔ آپ غزل، نظم، قطعہ، سلام، منقبت، مرثیہ، افسانہ، انشائیہ، مضامین کے علاوہ ڈرامہ بھی لکھتے ہیں اور اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی اچھے شعر کہتے ہیں اور فیض احمد فیض کے کلام کا ایک حصہ منظوم پنجابی ترجمہ کر چکے ہیں۔

حسن جاوید کا اصل نام جاوید حسین ہے، آپ یکم اپریل ۱۹۶۲ء کو محمد نواز کے یہاں نارووال پنجاب میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مقامی ہائی سکول سے حاصل کرنے کے بعد آپ نے گورنمنٹ ڈگری کالج نارووال سے ایف اے کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۹۵ء میں بلوچستان یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۹۳ء سے کوئٹہ میں مقیم ہیں اور آجکل روزنامہ جنگ کوئٹہ سے منسلک ہیں۔

مرے مقدر کے زائچے میں، لکھی ہوئی ہے فگار خوشبو
میں بحر عمر رواں، کہ جس کے نہ آر خوشبو نہ پار خوشبو

ہوائے وحشی سے لڑ رہی ہے نجانے کب سے، نجانے کب تک
تمہاری خواہش کی جیت خوشبو، مری تمنا کی ہار خوشبو

میں کاغذی پھول کی روایت میں زندگی کاٹنے پہ مجبور
مجھے نظر آ گلاب تازہ، مجھے کہیں سے پکار خوشبو

وفائیں بنجر زمین جیسی، محبتیں دشت کی طرح ہیں
نہ تیرا وعدہ گلاب جیسا، نہ میرے قول و قرار خوشبو

اے میری بے حس رتوں کے مالک، مری ریاضت جزا طلب ہے
میں شاخ بے باس کی طرح ہوں، مری جڑوں میں اتار خوشبو

وقت نے میرے پاؤں کے نیچے بوئی جلتی ریت
اسی لیے تو میرے ساتھ نہ روئی جلتی ریت
ایک مسافت صحرا کی' اک منزل باغ بہار
کوئی سکھ برگد کی چھاؤں' کوئی جلتی ریت
خود صحرا کو گھر میں لائے' خود برباد ہوئے
خود اپنے کاندھوں پہ رکھ کر ڈھوئی جلتی ریت
جلتے سورج کی سازش میں دن بھر رہی شریک
لکھ کر میرے پاؤں میں چھالے سوئی جلتی ریت
ہم نے دکھ کی مالا پہنی' وحشت کا جوگ لیا
اور دھاگے میں موتی جان پروئی جلتی ریت
کس نے اپنی آنکھوں کے سب منظر خون کیے
کس کی آنکھوں میں جاوید چبھوئی جلتی ریت

بے جرم بہت روئے سزاؤں سے لپٹ کر
بازو سے بندھی ماں کی دعاؤں سے لپٹ کر
ہنستا بھی ہے کج فہمی انسان پہ مجھ کو
رونا بھی ہے پتھر کے خداؤں سے لپٹ کر
دیکھا تھا کھلے سر جسے دنیا نے بس اک بار
وہ آج بھی روتی ہے رداؤں سے لپٹ کر
بچھڑے ہوئے بیٹوں کو بھلا اس کی خبر کیا
تصویریں بھی رو لیتی ہے ماؤں سے لپٹ کر
اک دھوپ تھی سو پھیل گئی دشت بدن میں

اک سایہ تھا سو رہ گیا پاؤں سے لپٹ کر
اک پل میں مسافر کو بنا دیتے ہیں پتھر
وہ اشک جو آتے ہیں صداؤں سے لپٹ کر
پھر میں ہوں' کڑی دھوپ ہے' صحرا کا سفر ہے
بس دیکھ لوں اک بار میں چھاؤں سے لپٹ کر

چلو جو سوچتا ہوں اس کو کاغذ پر بناتا ہوں
کہ شہر سنگ میں اک کانچ کا پیکر بناتا ہوں
تم اپنی آنکھ میرے پاس رکھ دو رہن اور پھر میں
تمہارے واسطے اک خوشنما منظر بناتا ہوں
میں دریا کے کنارے پر ہوں سیلابوں کی زد میں ہوں
یہ سب کچھ جانتا ہوں پھر بھی اپنا گھر بناتا ہوں
امیر شہر کی مجھ سے فقط اتنی لڑائی ہے
جنہیں جھکنا نہیں آتا میں ایسے سر بناتا ہوں
مرے فن میں یہی اک عیب ہے ناقد کی نظروں میں
کہ میں شانوں پہ چہروں کی جگہ پتھر بناتا ہوں
شکست فاش میں کوئی تو میرے دکھ میں شامل ہو
"میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں"

آغاز عشق جب ترا انجام آئے گا
کیا کیا نہ اپنی ذات پہ الزام آئے گا
جا تو رہا ہے دل ترے اقرار کی طرف

میں جانتا ہوں لوٹ کے ناکام آئے گا
جب مستجاب ہوگا دعاؤں کا سلسلہ
اک اور دشت ہجر مرے نام آئے گا
کیسی اذیتوں سے گزر جائے گا یہ دل
کس دکھ سے میرے لب پہ ترا نام آئے گا
ہونٹوں کا لمس دے کے مجھے اس نے یہ کہا
لے جا اسے سفر میں ترے کام آئے گا

جبین وقت پہ شکنیں سنوار، کچھ بھی نہیں
زمین اپنے کناروں کے پار، کچھ بھی نہیں
اے میری روح نہ کر اس پہ انحصار کوئی
محافظت کو بدن کا حصار، کچھ بھی نہیں
دیئے جلائے کہ سارے دیئے بجھا جائے
ہوائے تند ترا اختیار، کچھ بھی نہیں
یہ بات وقت کی ہے اور وقت پر اے دوست
یقین کر کہ میرا اختیار، کچھ بھی نہیں
میں قافلہ ہوں نہ منزل ہوں اور نہ رستہ ہوں
فقط غبار ہوں میں اور غبار، کچھ بھی نہیں

عبدالرشید حسرت

پیدائش ۲۶، جون ۱۹۶۳ء

بلوچستان کے نوجوان شعراء میں رشید حسرت اپنی سنجیدگی، ریاضت اور خاموشی کے ساتھ تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کی وجہ سے نمایاں ہیں۔ رشید حسرت اپنے دیگر ہم عصروں کے برعکس تمام گروہ بندیوں سے دور صرف اور صرف لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ آپ کی مادری زبان براہوئی ہے، لیکن اردو میں شعر کہتے ہیں۔ان کی غزلوں میں ان کے دکھ اور محرومیاں سماجی ناانصافیوں کی آواز بن کر سامنے آتے ہیں۔

رشید حسرت رئیسانی کا پورا نام عبدالرشید ملا زئی ہے، وہ ۲۶، جون ۱۹۶۳ء کو ضلع بولان کے ایک گاؤں مٹھڑی میں ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اٹھارہ سال کی عمر میں حکومت بلوچستان میں کلرک کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی اور اختصار نویس کے عہدے تک ترقی کی اور اس دوران پڑھتے بھی رہے۔ ۱۹۹۳ء میں جامعہ بلوچستان سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۹۵ء میں ہرنائی کالج میں لکچرر مقرر ہوئے، آج کل گورنمنٹ موسیٰ کالج میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ رشید حسرت تقریباً" بیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کی غزلیں مقامی اخبارات و رسائل میں چھپتی رہتی ہیں۔

شکستہ دل، تہی دامن، بچشم تر گیا آخر
صنم مل کر ہمیں پھر آج تنہا کر گیا آخر
غریب شہر تھا خاموش رہنے کی سزا پائی
وفا کرنے پہ بھی الزام اس کے سر گیا آخر
بڑھا کر ہاتھ الفت کا سدا کی بے کلی دے دی
تمہاری چاہ کرکے ایک شاعر مر گیا آخر

یہ طے تھا ہم انا کے فیصلے سے منہ نہ موڑیں گے
رہی دستار قائم تن سے لیکن سر گیا آخر
فنا کے ہاتھ اپنی زندگی کو چھو نہ سکتے تھے
مگر مالک تری دنیا سے یہ دل بھر گیا آخر
تھکن سے چور تھا اس کا بدن اور آنکھ بوجھل تھی
وہ شب بھر گھر سے باہر تھا پلٹ کر گھر گیا آخر
وہ جس کی جستجو میں ہم نے اپنی زندگی کھو دی
وہی تو آج حسرت ہم پہ تہمت دھر گیا آخر

دل و نظر تھے جو آج چہرہ بدل گئے ہیں
کہ خواب آنکھوں کے یاس و حسرت میں ڈھل گئے ہیں
جو پانیوں میں ہماری تصویر کھینچتی تھی
وہ جھیل سونی ہے رنگ سارے پگھل گئے ہیں
ترے بدن سے دھنک کے رنگوں کی باس مانگوں
نہیں تمنا، چمن بہاروں سے جل گئے ہیں
وہ جن کے چہروں سے کہکشائیں شکست کھائیں
وہ پھول اب تو خزاں کے زخموں سے گل گئے ہیں
یہ چوٹ ایسی نہ تھی کہ دامان دل بچاتے
ہے خوش نصیبی رشید حسرت سنبھل گئے ہیں

بدل لی بیچ سفر میں ہی راہ آپ نے بھی
کہ زر کی چھاؤں میں لے لی پناہ آپ نے بھی

مری امید کو اک دن اجڑ ہی جانا تھا
خود اپنی ذات کو کیوں کی تباہ آپ نے بھی
بجا کہ عشق بھی کچھ کچھ تھا مصلحت کا شکار
ہوا کے رخ کی طرح کی ہے چاہ آپ نے بھی
کبھی تو دھڑکنیں دل کی سنائی دیتی تھیں
سنی نہ جگ کی طرح آج آہ آپ نے بھی
ردیف قافیے سب آپ کے لیے ہیں مرے
مگر نہ بھول کے کی "واہ واہ" آپ نے بھی
سوائے صدق مرے پاس اور کچھ بھی نہیں
خرید رکھے ہیں جھوٹے گواہ آپ نے بھی
وفائیں آپ کی سنگت پہ ناز کرتی ہیں
صلہ وفا کا دیا ہے کراہ آپ نے بھی
رشید لوگ تو بستی اجاڑ دیتے ہیں
کیا ہے دل کو دکھا کر گناہ آپ نے بھی

جانتا ہوں پس منظر ہر حسین منظر کا
پھر بھی عکس رہتا ہے دل میں ایک پیکر کا
اس طرح سے تو مجھ سے دور ہے خلاؤں میں
جس طرح کہ دھرتی سے فاصلہ ہے امبر کا
تذکرے تو سنتا ہوں اب بھی تیرے جھومر کے
پاسباں ہے پر کوئی اور تیرے جھومر کا
تیرگی کے نشتر بھی روشنی کا منبع ہیں

ہاں مگر ہو جب شامل تیرے درد کا چرکا
میں بھی شعر کہہ لوں گا کب بھلا یہ ممکن تھا
ہے اثر جو گیتوں میں وہ ہے تیری ٹھوکر کا
آسماں سے اترا کیوں میں زمیں کی پستی میں
اب پتہ بھی پوچھوں کیوں رات سے ترے گھر کا
ایک دن تو پھوٹیں گی روشنی کی کرنیں بھی
جاگ اٹھے گا اے حسرت آدمی جب اندر کا

تلاش شیشے کی پتھروں میں کہاں کہاں کی
سمجھ میں آتی نہیں ہیں رسمیں ترے جہاں کی
شکست کھا کر بھی مسکرانا ہے میری فطرت
کہ مجھ پہ سایہ فگن ہمیشہ دعائیں ماں کی
نصیب اجڑے کہ دوستوں نے اجاڑ ڈالا
ہوئی ہے آخر کو انتہا میری داستاں کی
سکھا کے ریشم سے نرم لہجے میں بات کرنا
کہاں پہ وسعت میں کھو گیا ہے وہ آسماں کی
جلن ہے آنکھوں میں کتنی صدیوں کے صبحدم کی
کہ جو تمنا تھی آخر شب دھواں دھواں کی
نشیب میں خیمہ زن تھے جو لوگ اب کہاں ہیں
خزاں سی اک رہ گئی پہاڑوں میں کارواں کی
کبھی تو سانجھے تھے دکھ بھی خوشیاں بھی ایک سی تھیں
اور اب یہ عالم کہ خشک بیلیں ہیں اس مکاں کی

راغب تحسین

پیدائش ۲۸' اگست ۱۹۶۲ء

راغب تحسین بلوچستان کے ان نوجوان شعراء میں سے ہیں جن کو شاعری ورثے میں ملی ہے۔ اردو زبان و ادب کی خدمت میں پیش پیش راغب تحسین گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنے اعلیٰ شعری ذوق اور فنی استعداد کیوجہ سے اپنے ہم عمر شاعروں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی غزلیں آپ کے سماجی شعور کا آئینہ دار ہیں۔

راغب تحسین ۲۸' اگست ۱۹۶۲ء کو کوئٹہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد ابراہیم شارب بھی شاعر ہیں۔ راغب نے ۱۹۷۹ء میں میٹرک اور ۱۹۹۲ء میں جامعہ بلوچستان سے ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔ ۲۱' جون ۱۹۹۲ء کو ڈگری کالج ژوب میں لکچرر مقرر ہوئے اور آجکل گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

راغب تحسین کی غزلیں ان کی پہچان ہیں۔ ان کی شاعری میں جدید غزل کے موضوعات کے ساتھ ساتھ روایتی مضامین بھی انتہائی اچھے انداز میں ملتے ہیں۔

تلاش کرنا مجھے دوستو گماں سے پرے
میں چھپ گیا ہوں کہیں اپنے جسم و جاں سے پرے
سوائے دھوپ کی شدت کے یاد کچھ بھی نہیں
تمام عمر گزاری ہے سائباں سے پرے
ذرا سی بات پہ ہم سے خدا گریزاں ہے
ذرا سی دیر کو سوچا تھا آسماں سے پرے
میں ان کے پاس جو بیٹھا تو ہنس کے یوں بولے
ضرور بیٹھیے لیکن ذرا یہاں سے پرے

یہ التجا ہے کہ اس غیر کے اشارے پر
کیا نہ جائے ہمیں بزم دوستاں سے پرے
یہ اور بات مہینوں نظر نہیں آتا
وہ رہ رہا ہے اگرچہ مرے مکاں سے پرے

دشت بلا میں ابر نظر آ گیا تو کیا
میں دور ہوں وہ پاس نظر آ گیا تو کیا
ہم کو تو جھیلنا ہے مسلسل سفر کا دکھ
رستے میں اتفاق سے گھر آ گیا تو کیا
اس شہر بے ہنر میں مری خامشی کے بعد
لوگوں کو گفتگو کا ہنر آ گیا تو کیا
کاٹا ہے زندگی کا سفر تیز دھوپ میں
رستے میں ایک آدھ شجر آ گیا تو کیا
صحراؤں کے سفر سے بھی لوٹا ہوں سرخرو
آگے سمندروں کا سفر آ گیا تو کیا

نجانے کس راستے پہ ہم لوگ چل پڑے ہیں
کہ برسوں پہلے جہاں تھے اب بھی وہیں کھڑے ہیں
یہ آرزو تھی تمام ہمسائے مل کے بیٹھیں
مگر یہاں گھر کے لوگ آپس میں لڑ پڑے ہیں
ابھی اجازت نہیں ملی رزق بانٹنے کی
جہاز ساحل پہ حکم کے منتظر کھڑے ہیں

وگرنہ سچ کے سفر پہ تنہائی مار دیتی
چلو یہ دو چار لوگ تو ساتھ چل پڑے ہیں

شراب و ابر و گل موجود ہوں تب وہ نہیں ہوتا
ہم اکثر سوچتے ہیں جس طرح سب وہ نہیں ہوتا
یہاں ہر شے جگہ سے بے جگہ معلوم ہوتی ہے
یہاں جو جس جگہ ہے اس کا منصب وہ نہیں ہوتا
مرے جاتے ہیں کیوں ہم عارضی شہرت کی خواہش میں
جسے کھونا ہو دن میں حاصل شب وہ نہیں ہوتا
پس محراب و منبر سے کشاد فکر کہتی ہے
کرے جو راستے مسدود مذہب وہ نہیں ہوتا
وہ دن بھی تھے کہ جب اس کو بہت چاہا بہت سوچا
یہ سب کچھ اب بھی ہوتا ہے مگر اب وہ نہیں ہوتا
مرے آنسو، ہنسی، چپ، گفتگو، ملنے بچھڑنے سے
سمجھ لیتے ہو جو تم میرا مطلب وہ نہیں ہوتا
وہ ہو تو ذہن قید فکر سے آزاد رہتا ہے
زمانے بھر کے غم رکھتا ہوں میں جب وہ نہیں ہوتا

ہزاروں کام ہیں اور وقت کم، گھبرا گیا ہوں
بہت جلدی میں اپنے آپ سے ٹکرا گیا ہوں
یہاں تو عمر ڈھل جاتی ہے شب ڈھلتی نہیں ہے
یقیناً میں کسی آسیب گھر میں آ گیا ہوں

وہی دنیا، وہی منظر، وہی سب سلسلے ہیں
وہی میں ہوں بس اتنا ہے کہ دہرایا گیا ہوں

رموز کائنات آخر پریشاں ہو گئے ہیں
سو اب میں بھی توہم سے یقیں تک آ گیا ہوں

یہ عقل نارسا اور حیرتوں کا اک تسلسل
میں ان کے درمیاں رہتے ہوئے بکھرا گیا ہوں

کسی کے ہاتھ پر میرا لہو کیوں ڈھونڈتے ہو
میں اپنے آپ سے لڑتا ہوا مارا گیا ہوں

بہت دشوار تھے رستے مگر یہ بات چھوڑو
مجھے تم ڈھونڈتے پھرتے تھے لو میں آ گیا ہوں

زمیں کا درد ہے اور خوف آسمان کا ہے
ہمارے واسطے یہ وقت امتحان کا ہے

میں شہر بھر کا ہدف ہوں یقیں سے کیسے کہوں
جو آ رہا ہے ادھر تیر کس کمان کا ہے

حساب عمر رواں کیا کریں تمہارے ساتھ
کہ تم سے میرا تعلق تو جسم و جان کا ہے

یہ بستیاں ہیں کہ جنگل، یہ آدمی ہیں کہ بت
کوئی اٹھے کہ یہی مرحلہ اذان کا ہے

کہا گیا تھا کہ بنیاد اس کی ٹھیک نہیں
سو دیکھ لو کہ یہ ملبہ اسی مکان کا ہے

فاروق فیصل

پیدائش ۷، مئی ۱۹۶۳ء

جامعہ بلوچستان کے فارغ التحصیل طلباء میں فاروق فیصل کا شمار ان خوش گو صاحب دیوان نوجوان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے ایک قلیل مدت میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے خود کو روشناس کرایا ہے۔ بلوچستان میں استاد رشید انجم کی سرپرستی میں فروغ ادب کے لیے کوشاں "انجمن دبستان بولان" کے فارغ الاصلاح شعراء میں فاروق فیصل ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ کا مجموعہ کلام "جادہ کہکشاں" کے نام سے ۱۹۹۶ء میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

فاروق فیصل کا پورا نام غلام فاروق اور فیصل تخلص ہے۔ فاروق فیصل ۷، مئی ۱۹۶۳ء کو پیدا ہوئے آپ کے والد کا نام احمد علی تھا۔ ابتدائی تعلیم تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خان کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۷۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا، اور ۱۹۸۶ء میں جامعہ بلوچستان سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۸۸ء تک فیڈرل کالج کوئٹہ میں پڑھاتے رہے جس کے بعد دسمبر ۱۹۸۸ء سے کیڈٹ کالج مستونگ میں پڑھانے پر مامور ہیں اور آج کل اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

فاروق فیصل اپنے احساسات و افکار کو نہایت آسان طریقے سے بیان کرتے ہیں ان کے لہجے میں تکلف یا بناوٹ نہیں۔ ان کے موضوعات میں تنوع ہے اور وہ قلبی و جذباتی وارداتوں کے ساتھ ساتھ سماجی تبدیلیوں پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔

کچھ ایسے ہاتھ لگے اپنے مہربانوں کے
کبھی چراغ نہ پھر جل سکے مکانوں کے

جنوں بدلتا ہے جب زاویئے اڑانوں کے
تو ٹوٹ جاتے ہیں دروازے قید خانوں کے
دلوں سے دور اگر ہوں کدورتیں ساری
ستارے توڑ کے لائیں گے آسمانوں کے
دہکتی دھوپ میں سایہ کہاں تلاش کریں
بھٹک رہا ہوں تجسس میں سائبانوں کے
جبین وقت پہ اب گرد پڑ گئی ہے بہت
اداس چہرے نظر آئے ہیں جوانوں کے
شب فراق کا آغاز ہو گیا فیصل
رہ حیات میں دن آئے امتحانوں کے۔

بس دیکھتے رہتے اسے' رستہ نہ بدلتے
ہوتی جو ملاقات سر راہ گزرتے
اک عمر تو لگتی ہے تغیر کے سفر میں
جس طرح پہاڑوں سے صنوبر کو نکلتے
معیار بنانے کے لیے وقت ہے درکار
گرتے ہیں جو نظروں سے نہ دیکھے وہ سنبھلتے
کرتی ہیں سلام ان کو روایات ہمیشہ
چڑھتے ہوئے سورج کی جو پوجا نہیں کرتے
اک عمر سے مصروف عبادت رہے پھر بھی
احرام میں دیکھا انہی لوگوں کو بھٹکتے
کر جاتی بڑا کام تری چشم توجہ

دیوار سے انسان نہ سر پھوڑ کے مرتے

ہمیشہ توڑ دیتا ہے جو میرے پیار سے رشتہ
ملا دیتا ہے اکثر نت نئے آزار سے رشتہ
محبت کا تعلق تو بڑا نازک سا ہوتا ہے
ذرا سی بات پر بس ٹوٹتا ہے یار سے رشتہ
"زمیں کے گرد ان دیکھی ہواؤں کی فصیلیں ہیں"
سفر میں ٹوٹ جاتا ہے در و دیوار سے رشتہ
مصائب کو وہ خاطر میں کبھی بھی لا نہیں سکتا
ہمیشہ جس نے رکھا مالک و مختار سے رشتہ
بھٹکتا رہ گیا ہے وہ ہمیشہ رہگزاروں میں
سفر میں پاؤں کا ٹوٹا جہاں رفتار سے رشتہ
فقیروں کی کمائی اس لیے محفوظ رہتی ہے
وہ رکھتے ہی نہیں اپنا کبھی سرکار سے رشتہ
بہت پامال ہوتی ہو جہاں انسانیت فیصل
سروں کا ٹوٹ جاتا ہے وہاں دستار سے رشتہ

پاکیزہ خیالوں کی شہزادیاں گاؤں میں
لگتی ہیں بہت پیاری آکاش کی چھاؤں میں
یہ شوق جنوں مجھ کو کس راہ پہ لے آیا
کشکول ہے ہاتھوں میں زنجیر ہے پاؤں میں
جب سے ترا دیوانہ نکلا ترے کوچے سے

ہے شہر میں خاموشی اور شور ہے گاؤں میں
قاتل ہیں جہاں والے سرسبز درختوں کے
جینا ہے بہت مشکل آلودہ فضاؤں میں
ان کالی گھٹاؤں سے اک خوف سا آتا ہے
بچوں کو چھپاتی ہیں اب مائیں رداؤں میں
مٹی یہ مری فیصل اکسیر بصیرت ہے
ماتا نے جسے مانگا دن رات دعاؤں میں

محبت کے سفر میں فاصلوں کو کون دیکھے گا
ہمارے بعد ایسے راستوں کو کون دیکھے گا
حجابوں سے نکل آئے گی جب چہرے کی تابانی
تو پھر رخسار پر ان آنچلوں کو کون دیکھے گا
تجھے برسوں کی جب کھوئی ہوئی یادیں ستائیں گی
تری آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو کون دیکھے گا
ترے ہونٹوں پہ جب کھلنے لگیں گے پھول خوشبو کے
تو پھر میرے جنوں کی وحشتوں کو کون دیکھے گا
فزوں تر ہو گی جب آلودگی شفاف پانی میں
سمندر میں سنہری مچھلیوں کو کون دیکھے گا
ہمارے بعد ہر جذبہ فنا ہو جائے گا فیصل
جلا کر کشتیاں پھر ساحلوں کو کون دیکھے گا

عظمی جون

پیدائش ۲۷ ستمبر ۱۹۶۴ء

عظمی جون کا اصل نام محمد عظیم عظمی ہے۔ آپ ۲۷ ستمبر ۱۹۶۴ء کو عبدالرحیم قریشی کے یہاں سبی میں پیدا ہوئے۔ جامعہ بلوچستان سے ایم ایس سی کرنے کے بعد شعبہ تعلیم سے منسلک ہوئے اور آج کل گورنمنٹ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر (زولوجی) کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شاعری میں آپ کو محسن بھوپالی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ آپ بلوچستان کے نوجوان لکھنے والوں میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں۔ آپ کی نظمیں اور غزلیں مقامی اور قومی اخبارات و جرائد میں تسلسل کے ساتھ چھپتی رہتی ہیں۔

سوئی ہوئی آنکھوں میں جاگی ہیں تری آنکھیں
ہر موڑ سے خوابوں کے ابھری ہیں تری آنکھیں
طوفاں نہ تلاطم ہے، ٹھہری ہیں تری آنکھیں
جھیلوں سے سمندر سے گہری ہیں تری آنکھیں
ایام بہاراں کے آتے ہی گلستاں میں
کھلتے ہوئے پھولوں میں کھلتی ہیں تری آنکھیں
اک رت تھی کہ ہم پر بھی، بارش تھی عنایت کی
بدلا ہے وہ موسم تو بدلی ہیں تری آنکھیں
ہیں سرخ مری آنکھیں روکے ہوئے اشکوں سے
بھیگے ہوئے کاجل سے کالی ہیں تری آنکھیں
اس راز محبت کو تو لاکھ چھپا رکھے
کہتا ہے ترا چہرہ، کہتی ہیں تری آنکھیں
بچپن میں جو دیکھی تھی خوابوں میں پری اس نے

ملتا ہے ترا چہرہ' ملتی ہیں تری آنکھیں
وہ گیت محبت کے عظمی نے جو لکھے ہیں
پڑھتے ہیں ترے لب تو گاتی ہیں تری آنکھیں

دل کی میں آواز سنوں یا رہنے دوں
آنکھوں میں کچھ خواب بنوں یا رہنے دوں
چاہت کی سرتال بجے تو جان جاں
سر دیوانہ وار دھنوں یا رہنے دوں
خاموشی کا ناگ ترے بن ڈستا ہے
سناٹے کا شور سنوں یا رہنے دوں
تیرے میرے بیچ انا کا جھگڑا ہے
دیوار پندار چنوں یا رہنے دوں
اس پر میری جان ہمیں ہی چلنا ہے
رستے کے سب خار چنوں یا رہنے دوں
شاید عظمی جوں ضرورت پڑ جائے
رکھ لوں اپنے ساتھ جنوں یا رہنے دوں

نگاہوں کی شہادت کو شنیدہ کہہ نہیں سکتا
نہ دیکھوں جس کو آنکھوں سے میں دیدہ کہہ نہیں سکتا
کسی کوتاہ قامت کو کشیدہ کہہ نہیں سکتا
خوشامد کے لیے شہ کا قصیدہ کہہ نہیں سکتا
کبھی صحراؤں کو میں نے جو نخلستاں نہیں لکھا

سمندر کو بھی دشت نم ندیدہ کہہ نہیں سکتا
مسلماں ہو کہ عیسائی' یہودی ہو کہ نصرانی
کتاب آسمانی کو جریدہ کہہ نہیں سکتا
جنہیں بس آب و دانہ کی ہوس اڑنے نہیں دیتی
انہیں میں طائران پر بریدہ کہہ نہیں سکتا
اگر جھانکے کبھی چاک گریباں میں کوئی اپنے
تو پھر مجنوں کو وہ دامن دریدہ کہہ نہیں سکتا
محبت تو ازل سے ہے' محبت تا ابد ہو گی
اسے میں دور حاضر کا عقیدہ کہہ نہیں سکتا
کبھی ملنا بلا ناغہ' کبھی ہفتوں نہیں ملنا
کوئی بھی اس تعلق کو کشیدہ کہہ نہیں سکتا
ہمیشہ سچ کو سچ لکھا مرے سب پیش رووں نے
شب تیرہ کو صبح نو دمیدہ کہہ نہیں سکتا
ہیں گرچہ میرے شعروں میں حکایات غم دوراں
کوئی پھر بھی مجھے لیکن کبیدہ کہہ نہیں سکتا
کتاب زندگی میں ہے رقم باب محبت بھی
مگر کتنی ہیں سطریں خط کشیدہ کہہ نہیں سکتا
اگر سمجھو تو کیا کہنے' نہ سمجھو تو گلہ کیسا
تمنائے دل حرماں رسیدہ کہہ نہیں سکتا
یہ رب کی دین ہے عظمی' کہاں تاب سخن میری
کس و ناکس تو شعر چیدہ چیدہ کہہ نہیں سکتا

طلسم چشم حیراں سے نکل جاتا تو اچھا تھا
خرد کا تھام کے دامن نکل جاتا تو اچھا تھا

ترے دل پر تغافل کا جما ہے جو گلیشیر
نگاہوں کی حرارت سے پگھل جاتا تو اچھا تھا

تری یادوں کی منڈلاتی نہیں ہیں تتلیاں اب تو
جو موسم میرے دل کا بھی بدل جاتا تو اچھا تھا

اگرچہ ساتھ ہیں میرے تری تصویریں، تحریریں
میں ان کاغذ کے ٹکڑوں سے بہل جاتا تو اچھا تھا

تمہارا درد سینے میں الاؤ بن کے جلتا ہے
یہ آنسو بن کے آنکھوں سے نکل جاتا تو اچھا تھا

ہمارے سر پہ آ پہنچا ہے جو لمحہ جدائی کا
تمہاری جنبش ابرو سے ٹل جاتا تو اچھا تھا

تمہارا درد شعروں سے جھلکتا ہے مگر عظمی
تمہارا پیار گیتوں میں جو ڈھل جاتا تو اچھا تھا

حوالہ جات
ماہنامہ "بیاض" لاہور، جلد نمبر ۸، شمارہ نمبر ۳

علی کمیل قزلباش

ولادت ۱۵، اپریل ۱۹۶۷ء

بلوچستان جیسے کثیرا للسان خطے میں اردو زبان و ادب کی طرف شعوری طور پر مائل ہونا اور اس میں سلیقے سے اپنے نازک احساسات اور خیالات کو پیش کرنا آسان نہیں، اور وہ اس صورت میں جب آپ کی مادری زبان بھی اردو نہ ہو اور نہ ہی آپ کے گرد و پیش کی فضا اور آب و ہوا موافق ہو۔ اس کے باوجود اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنانے والوں میں اہل لورالائی کا حصہ قابل قدر ہے۔ سردار گل محمد پوپلزئی سے رہنواز مائل، اور مائل سے سعید گوہر، تابش نگینوی، سہیل جعفر، اور محمود ایاز کی طرح علی کمیل قزلباش بھی خطہ لورالائی کے کثیرا للسان شعراء میں سے ہیں جو اردو کے علاوہ پشتو اور فارسی میں شعر کہنے کے ساتھ ساتھ افسانے اور مضامین بھی لکھتے ہیں۔

علی کمیل قزلباش کا اصل نام غلام علی قزلباش ہے اور ۱۹۹۶ء تک علی دیپک قزلباش کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ علی کمیل ۱۵، اپریل ۱۹۶۷ء کو لورالائی میں پیدا ہوئے آپ کے والد حسین علی قزلباش شاعروں اور شاعری سے نالاں شخص تھے کہ ان کے والد شاعر ہوا کرتے تھے، گویا کمیل نے شاعری اپنے دادا سے ورثے میں حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم لورالائی کے گورنمنٹ ہائی سکول سے حاصل کرنے کے بعد کمیل نے گورنمنٹ ڈگری کالج لورالائی میں داخلہ لیا اور بی اے کرنے کے بعد جامعہ بلوچستان کے شعبہ پشتو میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۹۳ء میں نمایاں نمبروں کے ساتھ ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۴ء میں جامعہ بلوچستان سے ایم اے اردو کا امتحان بھی پاس کیا اور ۱۹۹۴ء ہی میں پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد ستمبر ۱۹۹۵ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج ژوب میں لکچرر مقرر ہوئے آج کل گورنمنٹ ڈگری کالج کوئٹہ میں لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔

علی کمیل قزلباش اردو کے علاوہ فارسی اور پشتو کے بہت اچھے شاعر ہیں اور ان کی قلمی کاوشیں صرف غزل اور نظم تک محدود نہیں وہ بیک وقت نہایت اچھے افسانہ نگار، مترجم، مضمون نویس اور نقاد بھی ہیں۔ ۱۹۹۴ء سے "تماس" کے نام سے پشتو میں ایک مجلہ کی ادارت بھی کر رہے ہیں جبکہ آپ کی ایک کتاب جو منتخب پشتو افسانوں کے اردو تراجم پر مشتمل ہے "پشتو کے شاہکار افسانے" کے نام سے ۱۹۹۵ء میں چھپ چکی ہے۔

اعضاء تمام میرے بہر طور شل پڑیں
جس پل تضاد میں مرے قول و عمل پڑیں
تب تک نہ ہوں گے واقف آداب دوستی
جب تک نہ ہم حصار انا سے نکل پڑیں
پھر کیا سراغ دے ہمیں منزل کا سنگ میل
اک راستے سے جب کئی رستے نکل پڑیں
برہم مزاجی کا ترے کب تک کریں گے غم
جب بات بات سے ترے ماتھے پہ بل پڑیں
دیپک گدائی در مولا علی کریں
آؤ مرادیں عمر کی پانے کو چل پڑیں

رات کی گود میں دن کا سورج بھی تھا، ہم نے دیکھا نہیں
یوں بھی صدیوں سے تھا لمحوں کا رابطہ، ہم نے دیکھا نہیں
اس کے کوچے میں بھی، ہم گنہگار لوگ، مول رکھتے تھے کچھ
بات ہمت کی تھی، شرط تھی بس صدا، ہم نے دیکھا نہیں
برفباری کی شب، سرد احساس اور گرم کمروں میں ہم
ساتھ گھر میں بجھا، دھڑکنوں کا دیا، ہم نے دیکھا نہیں

ان کو معلوم ہے درد کی انتہا، جو سپر تھے وہاں
ہر قدم پر رہی اک نئی کربلا، ہم نے دیکھا نہیں
آنگنوں میں عجب، چاند اترا تھا شب، ہم تھے غفلت میں جب
اوڑھ کر وہ گیا، چاندنی کی ردا، ہم نے دیکھا نہیں
ان خداؤں کا تھا یا فلک نے لکھا، کچھ پتہ نہ چلا
قسمتوں کا لکھا، کس کی جانب سے تھا، ہم نے دیکھا نہیں

الجھا ہوا وہ بھی میری سوچوں کی طرح ہے
اک شخص بظاہر جو حسینوں کی طرح ہے
ہر درد کو جاگیر بنا لیتا ہے اپنی
یہ دل بھی تو وسعت میں زمینوں کی طرح ہے
نا ربط حقیقت سے، نہ ہی جھوٹ سے یکسر
اس دور میں جینا بھی تو خوابوں کی طرح ہے
ہر شخص کی منت کا یہ مرہون دل زار
فٹ پاتھ پہ بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرح ہے
تنہائی میں دیپک مرے یاروں کا تصور
اطراف میں پھیلے ہوئے لوگوں کی طرح ہے

لہ لہ ہم سوچیں
وہ بھی سارے غم سوچیں
یہ بھی دیوانہ پن ہے
ہر دکھ کا مرہم سوچیں

سوچیں یوں تو پہروں ہم
لیکن پھر بھی کم سوچیں
جس کو دیکھو خود میں گم
یہ سارا عالم "سوچیں"
بالوں نے بھی بدلا رنگ
ان سے کہہ دو کم سوچیں
اپنے بس کی بات کہاں
کاغذ، لفظ، قلم، سوچیں

جشن ۱۹۹۷ء

کیا نہ بدلا پچاس سالوں میں
خوب، بد، کچھ نہ کچھ بدل تو گیا
مگر عادت یہ بھیک مانگنے کی

حوالہ جات

"صریر" کوئٹہ، جلد نمبر ۲، شمارہ نمبر ۱۱، اپریل ۱۹۹۱ء
"تخلیق" جلد نمبر ۲۱، شمارہ نمبر ۶، جون ۱۹۹۱ء
"اقدار" ۱۹۹۳ء

عصمت درانی

ولادت ۱۵، ستمبر ۱۹۶۸ء

سرسری نگاہ ڈالیے تو ایک روایتی خوش شکل باریش نوجوان اپنی گہری بھنوؤں اور کالی آنکھوں کے ساتھ کوئٹہ کے دوسرے شلوار قمیص میں ملبوس نوجوانوں سے مختلف نظر نہیں آئے گا، آپ نہ تو اس کی وضع قطع اور اس کے بولنے پر چونکیں گے، اور نہ وہ اپنی حرکات و سکنات کی وجہ سے توجہ حاصل کر سکے گا۔ لیکن اس کے باوجود اسے نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکے گا۔ اور آپ اسے بار دیگر ضرور دیکھیں گے۔ یہ نوجوان ڈاکٹر عصمت اللہ پوپلزئی ہے جسے ہم عصمت درانی کے نام سے جانتے ہیں۔

بلوچستان کے مقامی نوجوان شعراء میں زبان و بیان اور فن پر مکمل دسترس رکھنے کے حوالے سے عصمت درانی غالباً" وہ واحد نوجوان ہے جسے اپنے ہم عمروں میں ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ پشتو اور اردو میں یکساں طور پر نظم و نثر لکھنے والوں میں عصمت درانی نہ صرف اپنی مثال آپ ہے بلکہ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے قابل فخر بھی۔

عصمت درانی ۱۵، ستمبر ۱۹۶۸ء میں گلستان میں پیدا ہوا۔ آپ کے والد مولانا احمد شاہ ایک عالم دین تھے۔ بنیادی تعلیم کوئٹہ کے ایک نہایت اچھے تعلیمی ادارے تعمیر نو پبلک اسکول سے حاصل کی، اور میٹرک تک تمام امتحانات میں صوبے بھر میں امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوتا رہا، جس کے بعد گورنمنٹ ڈگری سائنس کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا اور بلوچستان بورڈ سے صوبے بھر میں نمایاں رہا۔ جس کے بعد بولان میڈیکل کالج میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۹۳ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد پوسٹ گریجویشن کی تیاری میں مصروف ہے پارٹ ون کا امتحان پاس کرنے کے بعد پارٹ ٹو کی تیاریوں میں روز و شب مصروف ہے۔

عصمت درانی کوئٹہ کے نوجوان شعراء میں یکسر مختلف و ممتاز ہے، بلوچستان میں اردو

شاعری کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ یہاں کے چند ہی نوجوانوں میں شعر گوئی کی وہ استعداد ہے جسے ہم خداداد کہہ سکیں، عصمت کی شاعرانہ قابلیت بلاشبہ خدا داد ہے، یہ کسی وقتی جذبہ، غم و غصہ کا اضطراری اظہار، یا کسی کمسنی کے عشق کا ابال نہیں بلکہ اس کی شاعری بلوچستان کے قدرتی چشموں کی طرح سینہ کہسار سے کشید کی ہوئی شاعری ہے۔

عصمت اردو کے علاوہ پشتو کے نہ صرف اچھے شاعر ہیں بلکہ پشتو کے بہت ہی اچھے شاعر اور انگریزی کے استاد اور پشتو کے صاحب طرز شاعر عبیداللہ درویش کے برادر خورد بھی ہیں لیکن عصمت کے کلام کو پڑھ کر کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ عصمت کی مادری زبان پشتو ہے اور وہ گلستان میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی زبان حیرت انگیز حد تک صاف، ذخیرہ الفاظ سے مالا مال اور نظم و نثر میں بیک وقت نہایت اعلی ہے۔ غزل و نظم کے ساتھ ساتھ افسانے، مضامین اور تحقیقی مقالے بھی لکھتے ہیں۔

غرور منصب و جاگیر میں نہیں آئے
جو لوگ نشہ توقیر میں نہیں آئے
جہان عشق میں کتنے ہی کوہکن ہوں گے
کہ جن کے نام اساطیر میں نہیں آئے
وہی تو ہیں جو بناتے ہیں بے مثال تجھے
جو زاویے تری تصویر میں نہیں آئے
یہ نام عدل قلم کر دیا گیا ان کو
جو پاؤں حلقہ زنجیر میں نہیں آئے
ترے وصال کی بستی ترے کرم کا دیار
یہ پرگنے مری جاگیر میں نہیں آئے
اسے یہ ضد ہے کہ آلام روزگار کا عکس
ہمارے نالہ شبگیر میں نہیں آئے
جو لطف خواب میں آیا ہے عین ممکن ہے

وہ لطف خواب کی تعبیر میں نہیں آئے

قدموں سے کچھ نقوش ابھارے زمین پر
ہم نے بھی چند روز گزارے زمین پر
بے حال تھے اگرچہ پرندے تکان سے
اترا نہ کوئی خوف کے مارے زمین پر
کیا ہو رہا ہے گردش دوراں جواب دے
کیوں رک گئے خلوص کے دھارے زمین پر
ہم سے زمیں کے چاہنے والے ہوئے نہیں
ہم نے تو اپنے خواب بھی وارے زمین پر
یوں ہیں زمیں پہ ماہ رخوں کی تجلیاں
اترے ہوں جیسے چاند ستارے زمین پر

سواد جاں میں ہے بیتابی قرار نما
عجیب شے ہے ترا قرب انتظار نما
یہ موسموں کا تغیر تو محض دھوکا ہے
بہار عکس خزاں ہے، خزاں بہار نما
ذرا سی دیر میں دھندلا گئے سبھی منظر
ذرا سی دیر میں ہر چیز تھی غبار نما
ترے حضور میں خم ہے مرا سر تسلیم
مرے لیے ہے ترا جبر اختیار نما
یہ ایک دل کا تعلق ہے دوسرے دل سے

بتائیے نہ محبت کو اشتہار نما
کسے خبر ہے کہ آلام روزگار سے کب
شکست کھائے مرا عزم کوہسار نما
جنون شوق لیے پھر رہا ہوں دشت بہ دشت
مرے لیے تو ہے ویرانہ بھی دیار نما

ہزار ضبط کیا رک نہیں سکے آنسو
لگا وہ زخم کہ آنکھوں میں آ گئے آنسو
جو تو گیا تو مری آنکھ خون روئی تھی
یہ اور بات کہ ناچار پی لیے آنسو
خدا گواہ کہ اب بھی تجھے پکارتے ہیں
مرے ملال، مرے رتجگے، مرے آنسو
نشاط و عیش تو اہل ہوس کی نذر ہوئے
بچے ہیں اہل محبت کے واسطے آنسو
یہ کیا ستم ہے کہ ہر پل حیات فانی کا
ترے لیے ہے تبسم، مرے لیے آنسو
سحر کو اوس پہ جب پڑ گئی نگاہ مری
تو یوں لگا کہ فروزاں ہیں رات کے آنسو
شب فراق میں جب تیرگی بڑھی عصمت
چراغ چشم میں ہم نے جلا لیے آنسو

جسے وفا سے گریز، الطاف سے حذر ہے

نگاہ عشاق میں وہی حسن معتبر ہے
گراں گذرتی ہے دل کو روداد ہمسفر کی
مگر میں اس کا جواب کیا دوں کہ ہمسفر ہے
مرے سکوں میں خروش ہے بحر بیکراں کا
مرے تبسم میں خندہ برق کا اثر ہے
میں چہچہانے لگا ہوں جس وقت سے چمن میں
مرا ہر اک ہم صفیر منقار زیر پر ہے
اگرچہ ناخوشگوار تھا وعظ بھی تمہارا
مگر تمہارا سکوت ناخوشگوار تر ہے
محیط ہیں مدتوں پہ تنہا طویل راتیں
حیات پھر بھی نجانے کیوں اتنی مختصر ہے

سدا زمین پہ آسماں جھکا رہے

زمیں ہے سبز
آسماں ہے نیلگوں
زمین و آسماں کے درمیاں فضا محیط ہے
فضا ہے رنگ سے تہی
مگر فضا کے بھی ہزار رنگ ہیں
ہر ایک رنگ باب حسن وا کیے
کہیں دھنک، فضائے دلفریب میں
کہیں شفق، شراب لالہ گوں پئے
میں جھک رہا ہوں کائنات پر کہ چوم لوں اسے

یہ جانتے ہوئے کہ حسن کائنات خواب ہے
اگر یہ خواب ہے تو خواب ہی سہی
یہ خواب میری آنکھ میں بسا رہے
سدا زمین آسمان پر جھکا رہے!

سفر کا احوال کیا سنائیں

سفر کا احوال کیا سنائیں
سفر تذبذب میں کٹ گیا ہے
کبھی جو دریا میں ناؤ ڈالی
تو فکر لاحق ہوئی کہ موجیں بپھر نہ جائیں
جو پار اترے
تو روح میں خوف سرسرایا
کہیں کنارا نہ ڈوب جائے
اگر کبھی واسطہ پڑا رات کے سفر سے
تو ذہن الجھا
کہ جس ستارے کی رہنمائی میں چل پڑے ہیں
وہی ستارا نہ ڈوب جائے
غرض کوئی وہم ہے جو دل سے لپٹ گیا ہے
سفر کا احوال کیا سنائیں
سفر تذبذب میں کٹ گیا ہے!

نوشین قمبرانی

پیدائش ۳، جنوری ۱۹۷۶ء

نوشین قمبرانی، براہوئی زبان و ادب کے نامور ادیب و شاعر پروفیسر نادر قمبرانی کی صاحبزادی ہیں اور آج کل جامعہ بلوچستان میں شعبہ انگریزی میں زیر تعلیم ہیں۔ نظم و نثر دونوں میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ان کی نظمیں بطور خاص نہ صرف اپنے ہم عمروں میں بہت مقبول ہیں بلکہ ادبی حلقوں میں بھی ان کی پہچان ہیں۔

ابا کے نام

ابھی جیون کی بانہوں میں ٹھہر جاؤ
مری خواہش کے سارے راستے
جیون کے سارے خواب، سارے رنگ،
تم سے ہیں
تمہیں سے عشق پایا ہے
تمہیں سے دلربائی ہے
تمہیں سے یہ جہاں ہے
اور جہاں سے آشنائی ہے
تمہیں سے رقص کرتے ساحلوں کی بولیاں سیکھیں
تمہیں سے کوہساروں کے حسیں نغمے سنے میں نے
تمہیں نے شہدائے حسن کا پرچم تھمایا تھا
تمہیں نے مذہب عشاق کا قرآں پڑھایا تھا
مگر انکار کا رستہ کہیں رکتا نہیں ابا

مجھے ڈر ہے
تمہارا ہاتھ مجھ سے چھوٹ نہ جائے
میں دشت بے اماں میں
زندگی کا لمس نہ کھو دوں
تمہارا مہرباں سینہ
کہ جیسے دامن چلتن
کہ جس میں تم نے گزرے موسموں کے درد پالے ہیں
جگر کی بے وفائی ہے
پرانے گھاؤ ہیں سارے
مجھے ڈر ہے کہ میں دامان مہر و ضبط کی
گہرائی کھو نہ دوں
مرے درویش ابا
کہاں دوجا کوئی تم سا
تمہاری شربتی آنکھیں، کبھی جو مسکراتی ہیں
تمہاری بے سکوں جاناں کے دل میں
دور چلتے ہیں
تمہی ہو ہم پیالہ
اور تمہیں زیبائی محفل
تمہیں حسن بیاں ہو

باری بھائی کے نام

یہ ممکن ہی نہیں سنگت
کہ جس دن میں تمہیں دیکھوں
تو کچھ بھی لکھ نہ پاؤں
فقط وہ دو ہی مصرعے ہوں،
کہ کوئی نظم یا کوئی کہانی
کہ جب آنکھیں تمہاری زندگی لے کر،
کبھی اس فن کے صحرا میں اترتی ہیں
تو یہ تشنہ زمیں،
پل بھر کو سندر بارشوں میں ڈوب جاتی ہے
سو یوں تخلیق کی اک بے پناہ قوت،
مجھے گھیرے میں لیتی ہے
میں خود کو کائناتی حسن کی وادی میں پاتی ہوں
مدھر گیتوں کے دلکش راگ سنتی ہوں
پرندوں کی حسیں بولی،
سے ساحر لفظ چنتی ہوں
فضا کی ہر ادا سے،
آشتی کا روپ لیتی ہوں
میں ڈھلتی شام کے رنگوں سے،
اپنا سر ملاتی ہوں
تمہاری یاد کے سائے کو تھامے،
چاپ کرتی ہوں
میں خوشیوں کے محبت، زندگانی کے،

سہانے خواب بنتی ہوں
تمہیں دیکھوں تو جیون کا سلگتا راز نہ پاؤں
یہ ممکن ہی نہیں سنگت

؟

"دشت میں بسنے والے انسان
بل کھاتے پیچیدہ رستے
کچھ خوابوں کے زندہ منظر
اور طلب کی آگ میں دل"
اک افسوں ہے فطرت کا
دل کو تھامو' میں جاناں
آنکھ میں آئے سچے آنسو
پوچھ رہے ہیں
کیا ان وحشی کہساروں میں
پیاس بجھانے والے چشمے
سوکھ رہے ہیں ... ؟

حوالہ جات

ماہنامہ سنگت کوئٹہ' جلد نمبر ۲' شمارہ ۱۰ دسمبر ۱۹۹۹ء

ماہنامہ سنگت کوئٹہ' جلد نمبر ۲' شمارہ ۱۱ دسمبر ۱۹۹۹ء

ماہنامہ سنگت کوئٹہ' جلد نمبر ۳' شمارہ ۱ دسمبر ۱۹۹۹ء

بقا محمد بگٹی

پیدائش ۳' فروری ۱۹۷۸ء

بقا محمد کا تعلق بلوچی کے مشہور شاعر جوانسال بگٹی کے وطن ڈیرہ بگٹی سے ہے۔ بگٹی قبیلے سے تعلق رکھنے والا یہ نوجوان گذشتہ سال بی ایس سی سے فارغ ہوا ہے اور آج کل پنجاب یونیورسٹی لاہور میں کیمیکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔

بقا محمد ولد اللہ بخش بگٹی ۱۹۷۸ء میں سوئی میں پیدا ہوئے' انٹر سائنس تک وہیں تعلیم حاصل کرنے بعد گریجویشن کے لیے کوئٹہ چلے آئے جہاں گورنمنٹ کالج سے ۱۹۹۸ء میں (B Sc) کا امتحان پاس کیا۔

علم و ادب کی طرف طبیعت پہلے ہی سے مائل تھی کوئٹہ کی ادبی فضا نے ان کے ذوق و شوق کو مزید جلا بخشی اور وہ باقاعدگی کے ساتھ مشاعروں اور دیگر تقریبات میں شرکت کرنے لگے۔ پروفیسر شرافت عباس سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔

بقا محمد بگٹی کے کلام میں فکری گہرائی' شعری رچاؤ کے ساتھ موجود ہے' اس میں سادگی بھی پائی جاتی ہے فنکاری بھی۔ وہ اپنے اشعار میں مقامی تلمیحات اور اصطلاحات بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔

اندھیروں میں بھٹکنا چاہتا ہوں
ترے غم میں تڑپنا چاہتا ہوں
تڑپ کر اپنے دل کی وحشتوں سے
میں اب پہلو بدلنا چاہتا ہوں
محبت کے حسیں لمحوں میں اکثر
میں خود کو رکھ کے جلنا چاہتا ہوں

مری جاں تیری خوشنودی کی خاطر

مزاج اپنا بدلنا چاہتا ہوں

مرے مٹنے کا جاں تم غم نہ کرنا

میں ذرہ ہوں بکھرنا چاہتا ہوں

اگر دیکھو تو ابھرا جا رہا ہوں

اگر سوچو تو ڈھلنا چاہتا ہوں

فریب خودنمائی میں پڑے ہیں

یہ ہم کس جگ ہنسائی میں پڑے ہیں

ہمیں تم کس طرح ڈھونڈو گے آخر

کہ ہم شوق گدائی میں پڑے ہیں

سجا کے خواب ان پلکوں پہ اپنے

کسی کی دلربائی میں پڑے ہیں

بنے ہیں ہم تری زلفوں کے قیدی

دل و جاں کی رہائی میں پڑے ہیں

نگاہ لطف ہم پر بھی ہو مولا

کہ ہم تیری خدائی میں پڑے ہیں

سنا ہے چاند تک پہنچی ہے دنیا

ہم اب تک بے وفائی میں پڑے ہیں

وہ اب بھی ناز تو کرتی ہی ہو گی

بقا جس کی جدائی میں پڑے ہیں

طلعت زہرا زیدی

پیدائش اپریل ۱۹۸۰ء

طلعت زہرا زیدی کا تعلق بلوچستان کے ان نوجوان اہل قلم سے ہے جو اپنی کم عمری کے باوجود باقاعدگی کے ساتھ شعر گوئی کی جانب متوجہ ہیں۔ طلعت زہرا زیدی غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتی ہیں۔ روایت اور جدت کے درمیان سفر کرتی ہوئی ان کی شاعری مختلف رسائل اور اخبارات کے ادبی صفحات میں چھپتی رہتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے وہ خاصی پرگو ہیں۔ غزل اور نظم کے علاوہ وہ مذہبی موضوعات منجملہ نعت اور سلام وغیرہ میں بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔

طلعت زہرا زیدی گورنمنٹ گرلز کالج کوئٹہ میں بی ۔ کام تھرڈ ایر کی طالبہ ہیں۔ کالج کے پروگراموں کی منفرد کمپیئر کے علاوہ انہیں کالج کی ۹۹-۱۹۹۸ء کی بہترین نظم گو شاعرہ کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں سادگی کے ساتھ ایک فنکارانہ اسلوب نظر آتا ہے جس کو زبان و بیان پر ان کا عبور مزید دلکشی عطا کر دیتا ہے۔ نظموں میں ان کے موضوعات قومی زندگی اور عام زندگی سے متعلق ہوتے ہیں جنہیں وہ خاص محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ نباہتی ہیں۔ غالبا اپنے والد پروفیسر شرافت عباس سے مشورہ سخن کرتی ہیں۔

تمام عمر سر راہ کیا بسر کرتا

چلے تو ہم کو بھی آ جائے گا سفر کرنا

نظر میں ایک ہی منظر سجا ہے برسوں سے

چمکتے ڈوبتے تاروں پہ کیا نظر کرتا

کہ ہم تو اپنی وفاؤں پہ ناز کرتے ہیں

کسی کے نام سے کیا خود کو معتبر کرتا

بچھڑ کے اس سے ہزاروں شکایتیں دل میں

جب اس سے ملنا تو ہر بات مختصر کرنا
یہ زندگی ہے مسلسل وفا کا نام ہے یہ
بڑا ہے کام شب ہجر کو سحر کرنا
ہمارے عہد میں کس بیکسی کا عالم ہے
کہ جوئے شیر لگے زندگی بسر کرنا
بس اتنی بات کہ نظریں چرا گیا اک شخص
اب اتنی بات پہ کیا خود کو دربدر کرنا

موسموں پر نظر نہیں رکھتا
دل کہ اپنی خبر نہیں رکھتا
کوئی جذبہ امڈ کے آتا ہے
لیکن اپنا ثمر نہیں رکھتا
رخش دل کا عجب طریقہ ہے
کہ مسافت کا ڈر نہیں رکھتا
کشمکش جان و دل میں ہے جاری
نالہ ء دل اثر نہیں رکھتا
چور جب اپنے گھر میں بستے ہوں
تو کوئی شب کا ڈر نہیں رکھتا
اتنی مایوسیوں کے عالم میں
کوئی پانی پہ گھر نہیں رکھتا
جب خبر ہو تو کوئی اپنا دیا
یوں جلا رات بھر نہیں رکھتا

بستیوں کو اجاڑنے والو!
کیا کوئی تم میں گھر نہیں رکھتا

یاد آتی ہے...

ہمیں یاد تمہاری آتی ہے
بہلاتی کبھی تڑپاتی ہے
ہمیں یاد تمہاری آتی ہے
جب بھیگی شامیں ڈھلتی ہیں
جب تیز ہوائیں چلتی ہیں
جب موسم لے کر انگڑائی
چھب ایک نئی دکھلاتا ہے
رت کے رنگیں چہرے میں ہمیں
اک رنگ بہت تڑپاتا ہے
جب بادل دل دہلاتے ہیں
جب رستے گم ہو جاتے ہیں
جب بارش سر بکھراتی ہے
تب یاد تمہاری آتی ہے
بہلاتی کبھی تڑپاتی ہے
ہمیں یاد تمہاری آتی ہے
جب پورے چاند کی راتیں ہوں
اور بے فکری کی باتیں ہوں
برسات خوشی کی ہوتی ہو

جب ساز ہنسی کا بجتا ہو
چاندی چھنکے جب آنگن میں
جب شام کا رستہ مہکا ہو
جب شاخ سے ٹوٹے پھول کوئی
انجانے میں ہو بھول کوئی
پاگل پروا مسکاتی ہے
تب یاد تمہاری آتی ہے
بہلاتی کبھی تڑپاتی ہے
ہمیں یاد تمہاری آتی ہے

حوالہ جات

روزنامہ جنگ کوئٹہ' ۱۱' نومبر ۱۹۹۳ء

"زرغون" مجلہ گورنمنٹ گرلز کالج کوئٹہ کینٹ' ۹۹-۱۹۹۸ء

کتابیات

آغا' صادق حسین نقوی' "نوا" مکتبہ آغا صادق کوئٹہ' ۱۹۶۶ء

آغا' صادق حسین نقوی' "صبح صادق" مکتبہ آغا صادق کوئٹہ' ۱۹۶۶ء

آغا' صادق حسین نقوی' "رنگ و بو" مکتبہ آغا صادق کوئٹہ' ۱۹۶۹ء

آغا' صادق حسین نقوی' "ید بیضاء" مکتبہ آغا صادق کوئٹہ' ۱۹۷۱ء

آغا' صادق حسین نقوی' "طفلستان" مکتبہ آغا صادق کوئٹہ' ۱۹۷۳ء

آغا' صادق حسین نقوی' "نکات فن" انسٹی ٹیوٹ آف تھرڈ ورلڈ آرٹ اینڈ لٹریچر لندن' ۱۹۸۹ء

آغا' صادق حسین نقوی' "چشمہ کوثر" گورا پبلشرز لاہور' ۱۹۹۴ء

اثر جلیلی' "عکس کربلا" کل پاکستان حلقہ ادب کراچی' ۱۹۸۸ء

اوریا مقبول جان' "قامت" ۱۹۸۸ء

براہوئی' ملا محمد حسن' "کلیات محمد حسن براہوئی" مجلس ترقی ادب لاہور' ۱۹۷۶ء

بلوچ' اختر علی خان' "بلوچستان کی نامور شخصیات" (جلد اول) رائل بک کمپنی کراچی' ۱۹۹۵ء

بلوچ' اختر علی خان' "بلوچستان کی نامور شخصیات" (جلد دوم) رائل بک کمپنی کراچی' ۱۹۹۶ء

بلوچ' اختر علی خان' "بلوچستان کی نامور شخصیات" (جلد سوئم) رائل بک کمپنی کراچی' ۱۹۹۷ء

بلوچ' اختر علی خان' "بلوچستان کی نامور شخصیات" (جلد چہارم) رائل بک کمپنی کراچی' ۱۹۹۸ء

بلوچ' حکیم' "شبیہ شاد" پاکستانی ادب پبلی کیشنز کراچی' ۱۹۹۹ء

بنگلزئی' میر محمد حسن' "گلدستہ قلات" مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد' ۱۹۷۳ء

بیرم غوری، "آدھی نیند" ناشاد پبلشرز کوئٹہ، ۱۹۹۸ء

پوپلزئی، سردار محمد یوسف، "قندیل خیال" دہلی ۱۹۱۱ء

تقوی، ڈاکٹر نعیم، "اثر جلیلی عکس کربلا کے آئینے میں" مجلس افکار اسلامی کراچی، ۱۹۹۰ء

"دھنک" مرکز ادب کوئٹہ، ۱۹۶۲ء

رشید نثار، "وادی شال کی کہکشاں" پنڈی اسلام آباد ادبی سوسائٹی (پیاس) راولپنڈی، ۱۹۹۹ء

زاہد آفاق، "خواب جزیرہ" گوشہ ادب کوئٹہ، ۱۹۹۱ء

زیب مگسی، نواب میر گل محمد خان، "زیب نامہ" انجمن فارسی بلوچستان کوئٹہ، ۱۹۹۵ء

زیب مگسی، نواب میر گل محمد خان، "خزینتہ الاشعار" انجمن فارسی بلوچستان کوئٹہ، ۱۹۹۶ء

حاوی اعظم، "تند و کند" زمرد پبلی کیشنز مستونگ، ۱۹۹۱ء

سرور جاوید، "سر مجبس شب" الحمد پبلشرز لاہور، ۱۹۹۸ء

سعید گوہر، "پس دیوار" پشتو ادبی ملگری لورالائی، ۱۹۸۵ء

شمیم احمد، "سوال یہ ہے" نادر ٹریڈرز مستونگ، ۱۹۸۹ء

عابد، شاہ عابد، "گلزار عابد" دیو بند ۱۹۱۵ء

عطا شاد، "سنگاب" سیلز اینڈ سروس کوئٹہ، ۱۹۸ء

عطا شاد، "برفاگ" ناشاد پبلشرز کوئٹہ، ۱۹۹۷ء

عین سلام، "چکیدہ" قلات پبلشرز مستونگ، ۱۹۶۶ء

عین سلام، "طیف رواں" ناشاد پبلشرز کوئٹہ، ۱۹۹۶ء

غور، عبدالرحمن، "پھندے" ادارہ ادب بلوچستان سبی، ۱۹۴۹ء

غور، عبدالرحمن، "متاع بردہ" مکتبہ بلوچی دنیا ملتان، ۱۹۶۷ء

فاروق فیصل، "جادہ کہکشاں" انجمن دلستان بولان کوئٹہ، ۱۹۹۶ء

قادری، سلطان ارشد، "رتجگوں میں خواب" ناشاد پبلشرز لاہور، ۱۹۹۱ء

کاکڑ، ڈاکٹر عبدالحمید، "خار گل" بزم ثقافت کوئٹہ، ۱۹۶۷ء

کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، "بلوچستان میں اردو" مرکزی اردو بورڈ گلبرگ لاہور، ۱۹۶۸ء

کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، "بلوچستان میں فارسی" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، ۱۹۶۸ء

کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، "علامہ اقبال اور بلوچستان" اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۹۸ء

لالہ، ہتو رام، "تاریخ بلوچستان" بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، بار سوئم ۱۹۸۷ء

ماہر افغانی، "کن فیکون" ورڈ ویژن پبلشرز اسلام آباد، ۱۹۹۲ء

محشر رسول نگری، "فخر کونین" پاکستان پریس کوئٹہ، ۱۹۶۴ء

محشر رسول نگری، "صحیفہ فطرت" سجاد پبلی کیشنز کوئٹہ،

ناگی، عبدالرزاق خاور، "عرفان و آگہی" ۱۹۸۵ء

ناگی، عبدالرزاق خاور، "قندیل" ۱۹۸۸ء

ناگی، عبدالرزاق خاور، "آبگینہ" ۱۹۹۳ء

نصیر، میر گل خان، "تاریخ بلوچستان" قلات پبلشرز کوئٹہ، ۱۹۰۰ء

ہمدم، پروفیسر نور محمد، "آداب سفر" بک سپاٹ آرچر روڈ کوئٹہ، ۱۹۸۸ء

اخبارات و رسائل

اقدار، ۱۹۹۴ء

بلوچی دنیا ملتان، "غور نمبر" جلد ۹، شمارہ ۳-۴ جون جولائی ۱۹۶۵ء

بیاض لاہور، جلد ۸، شمارہ ۳

بوئے مادران کوئٹہ، (خصوصی اشاعت) جولائی ۱۹۹۸ء

تخلیق، جلد ۲۱، شمارہ ۶، جون ۱۹۹۱ء

تعمیر بلوچستان مستونگ، جلد ۵، شمارہ ۱۳، ۲۷ فروری ۱۹۵۷ء

چراغ راہ لاہور، جون ۱۹۵۶ء

دستگیر کوئٹہ، جلد ۷، شمارہ ۱-۴

روزنامہ جنگ کوئٹہ، ادبی صفحات ۱۹۸۵ء تا حال

روزنامہ مشرق کوئٹہ، ادبی صفحات ۱۹۸۵ء تا حال

روزنامہ زمانہ کوئٹہ' ۱۹۷۹

روزنامہ کوہستان کوئٹہ' ادبی صفحات ۱۹۹۶ء تا حال

زرغون' گورنمنٹ گرلز کالج کوئٹہ' ۹۷-۱۹۹۸ء

سرآب' شعبہ اردو جامعہ بلوچستان کوئٹہ' ۱۹۹۶ء

صریر کوئٹہ' جلد ۲' شمارہ ۱۱' اپریل ۱۹۹۱ء

وادی کوئٹہ' جلد ۱-۷' تمام شمارے' ۱۹۸۴ء تا ۱۹۹۲ء

قلمی نسخے

زیب مگسی

میر گل خان نصیر

اور نوجوان شعراء کا غیر مطبوعہ کلام

"آغا محمد ناصر کی یہ تصنیف نہ صرف بلوچستان میں اردو شاعری کا ایک بہت اچھا تذکرہ ہے بلکہ بلوچستان کی شاعری کو اردو [illegible] دھارے سے ملا دیتی ہے۔"

ڈاکٹر جمیل جالبی

"آغا محمد ناصر خود ایک جدید ذہن کے شاعر اور ادیب ہیں' اسی لیے ان کا زاویہ نگاہ اور تنقیدی خیالات مختلف ہیں.... ان کی زیر نظر کتاب بہت اہم ہے۔ بلوچستان میں اردو شاعری کے ارتقا کی پوری تصویر واضح ہو جاتی ہے۔"

پروفیسر سحر انصاری

"پروفیسر آغا محمد ناصر جامعہ بلوچستان میں اردو زبان و ادبیات کے سینئر استاد ہونے کے علاوہ جامعہ کے شعبہ عمرانیات میں بھی ایک قابل لحاظ مدت تک تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ زبان و ادبیات نیز عمرانیات کے گہرے مطالعے نے ان کی فکر کو تنوع بخشا ہے اور طبیعت میں تحقیقی عناصر کی فراوانی نے ان کی نظر کو وسعت اور تحریر کو توازن جیسی کمیاب دولتیں عطا کی ہیں۔ بلوچستان کی علمی' ادبی' ثقافتی اور معاشرتی زندگی کے ایک معتبر گواہ کی حیثیت سے کہ وہ ایک نیم سیاسی و نیم ادبی جریدے "وادی" کے مدیر اور بلوچستان کی مذہبی تاریخ سے متعلق ایک معرکتہ الآرا کتاب "بلوچستان میں پیروانِ علی" کے مصنف نیز بذات خود ایک عمدہ شاعر اور ادیب ہیں "بلوچستان میں اردو شاعری" کو ہر لحاظ سے ایک عمدہ' معتبر اور قابل قدر ادبی دستاویز بنا دیا ہے۔"

پروفیسر شرافت عباس